شیر دریا
رضا علی عابدی
EBH
ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

شیر دریا

رضا علی عابدی

ایجوکیشنل بک ہاؤس ○ علی گڑھ

ایڈیشن ________ ۱۹۹۵ء
قیمت ________ -/۱۵۰

مطبوعہ: کلاسیکل پرنٹرس دہلی ۔۶

ایجوکیشنل بک ہاؤس
یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ

فہرست

اِک دَور تھا جو ہو چکا، اِک دَور ہے جو آئے گا
اِک خواب دیکھا جا چکا، اِک خواب دیکھا جائے گا

اثؔر لکھنوی

پیش لفظ

پہلا قطرہ

اب کے قصہ دریائے سندھ کا ہے۔
تبّت والے کہتے ہیں کہ یہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے، اسی لیے انہوں نے اِسے شیر دریا کا نام دیا ہے۔
اِس میں کمال دریا کا نہیں، اُس شیر کا ہے جس نے اپنے قبیلے کی روایت توڑ کر کوئی نعمت نِگلی نہیں، اُگلی ہے۔
لیکن جیسے جیسے یہ دریا آگے بڑھتا ہے، کہیں نگلنے کی کہانیاں کثرت سے سننے میں آتی ہیں اور کہیں جبراً اگلوائے جانے کی۔
حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب دریا کی کہانی نہیں، اس کے کنارے بسنے والوں کی ہزار داستان ہے۔ کہیں یہ دریا دُکھ دیتا ہے، کہیں سُکھ بانٹتا ہے اور کہیں سُکھ چھینتا ہے۔
سچ تو یہ ہے کہ اس کے کنارے پروان چڑھنے والی تہذیبیں کبھی کی کھنڈر ہو چکی ہیں۔ اب تہذیب، تمدّن، ترقی اور خوش حالی کے دھارے کہیں اور بہتے ہیں اور ہمارا یہ دریا کہیں اور۔
اب اِس کتاب کے بارے میں چند باتیں۔
دریائے سندھ کے کنارے اپنا سفر میں نے ایک مرحلے میں نہیں، تین مرحلوں میں مکمل کیا۔ ۱۹۹۰ء اور ۱۹۹۱ء کے دوران میں گرمیوں میں پہاڑوں پر گیا، سردیوں میں میدانوں کی سیر کو نکلا اور راہ میں بیمار ہو گیا تو تیسری بار سندھ کے ڈیلٹا کا علاقہ دیکھا۔ اگر آپ واقعات میں بے ترتیبی دیکھیں یا تسلسل میں فاصلے محسوس کریں تو جان لیں کہ میں بلا روک ٹوک بہے

چلے جانے والا دریا نہیں۔

دوسری بات یہ کہ لدّاخ کے کچھ علاقوں میں غیر ملکیوں کو جانے کی اجازت نہیں۔میں وہاں نہیں گیا۔صوبہ سندھ کے بعض حصّوں میں ڈاکو دندناتے پھر رہے تھے۔مجھے اپنے اغوا کی خبریں چھپوانا منظور نہ تھا۔میں اُن سے دور ہی رہا۔

ایک اَور بات یہ کہ میں نے کشتی میں بیٹھ کر دریا کا سفر نہیں کیا۔میں سارے راستے کنارے کنارے چلا۔کنارے بدلتے رہے، لوگ نہیں بدلے اور مجھے ان سے ہی غرض تھی۔

اس کتاب کے سارے باب اصل میں ریڈیائی پروگرام کے مسودے ہیں جنہیں اگرچہ کتاب کے لیے ذراسا سنوار لیا گیا ہے لیکن پوری تحریر میں گفتگو کا انداز محفوظ ہے۔ پھر علاقائی لب و لہجہ بھی ہے۔بدقسمتی سے یہ لہجہ تحریر میں نہیں سما سکتا۔اس دریا کے کنارے موسیقی بھی بہت ہے۔افسوس کہ کتاب بول سکتی ہے، گنگنا بھی سکتی ہے، اونچی لَے میں گا نہیں سکتی۔

یہ ممکن ہے اِس کتاب پر یاس کا رنگ چھایا ہو، لیکن وہ میری اختراع نہیں۔ دریائے سندھ کے کنارے بسنے والوں کی زندگی ویسی نہیں جیسی بعض دوسرے علاقوں میں ہے۔ یہ لوگ مشکل حالات میں دلیری سے جی رہے ہیں اور سچ تو یہ ہے کہ دریا سے زیادہ یہ لوگ شیر ہیں۔

یہ کتاب سفرنامہ نہیں ہے، ایک مخصوص علاقے میں بسنے والوں کا سماجی مشاہدہ اور مطالعہ ہے جو مستقبل کے محقّق کو بتائے گا کہ بیسویں صدی کے خاتمے پر سندھ کے کنارے بسنے والوں کے کیسے کیسے خواب ٹوٹ چکے تھے اور کیسے کیسے نئے خواب انہیں جئے جانے کی اُمنگ عطا کر رہے تھے۔اس سے بھی بڑھ کر اس کتاب کا مطالعہ آج کے قاری کو بتائے گا کہ جن علاقوں میں جانے کی زحمت کم ہی لوگ کرتے ہیں اُن علاقوں سے دریا کیونکر گزرتا ہے اور زندگی کیسے۔

آخری بات ان احسانات کی جن کے بوجھ تلے دبا ہوا ہوں۔تبّت کی سرحد سے لے کر بحرِ عرب کے ساحل تک اتنے بہت سے احباب نے میرا ہاتھ بٹایا ہے کہ نہ ان احباب

کا شمار ممکن ہے نہ ان کے احسانات کا۔ لیہ، اسکردو، اٹک، کالاباغ، میانوالی، ڈیرہ اسماعیل خان، بھکر، ڈیرہ غازی خان، سکھر، لاڑکانہ، حیدرآباد اور ٹھٹھہ میں جو کچھ میں نے دیکھا، وہ میرے احباب نے دکھایا اور جس سے میں ملا۔ میرے احباب نے ملوایا۔ ان میں سے زیادہ تر خود مجھ سے پہلی بار ملے تھے اور اب حال یہ ہے کہ اُن سے بار بار ملنے کی تمنا ہے۔

بی بی سی کے شعبۂ اردو میں اپنے ساتھیوں کا شکریہ جنھوں نے اس سلسلے کے تقریباً ساٹھ پروگراموں کی تدوین اور ترتیب میں میری مدد کی۔

سنگِ میل پبلی کیشنز کے بانی نیاز احمد صاحب اور ایجوکیشنل بک ہاؤس کے مالک اسد یار خاں کا شکریہ۔ کتاب کی اشاعت کا اُن کا اشتیاق میرے شوق سے زیادہ نکلا۔

اور آخر میں، لیکن سب سے بڑھ کر اپنے سامعین کا شکریہ۔ وہ نہ ہوتے تو نہ یہ سفر ہوتا، نہ یہ پروگرام ہوتا، نہ یہ کتاب ہوتی اور نہ اِن تمام کاموں کا حوصلہ۔

خدا اُن سب کے دلوں میں خوشیوں کے دریا بھر دے۔

رضا علی عابدی

۱۵ اگست ۱۹۹۳ء

بی بی سی
اُردو سروس
بش ہاؤس
لندن

آخری پڑاؤ

دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا، لدّاخ سے چل کر بلتستان اور کوہستان سے گزر کر، ہزارہ کی پہاڑیوں اور پنجاب کے میدانوں سے ہوتا ہوا مَیں وہاں پہنچ گیا ہوں جہاں یہ عظیم دریا عظیم الشان بحرِ عرب میں گرتا ہے۔ پانی کیسے اشتیاق سے بڑھتا ہوا پانی میں مل جاتا ہے۔

یہ صوبہ سندھ میں ٹھٹھہ کا علاقہ ہے اور یہ جگہ جہاں مَیں کھڑا ہوں یہاں دریا نے پھیل کر ایسے میدان تراشے ہیں اور اُس سے ایسی شاخیں پھوٹی ہیں جیسے کوئی کشادہ ہتھیلی اور پھیلی ہوئی انگلیاں۔

یہ تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے: مور چھڈائی، جہاں دونوں وقت مل رہے ہیں۔ سورج کی آخری کرن بھی مدھم ہو گئی ہے اور کچھ دیر بعد مغرب کی اذان ہونے والی ہے۔ اِس وقت مجھے وہاں پندرہ سو میل دور، بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر لدّاخ میں بودھوں کی وہ خانقاہ یاد آ رہی ہے جہاں مَیں سورج کی پہلی کرن کے ساتھ پہنچا تھا تو کمسن بچے اور بودھ راہب صبح کی عبادت میں مصروف تھے۔ استاد آنکھیں موندے بیٹھے تھے۔ چھوٹے بڑے شاگرد دو زانو تھے۔ تھوڑی سی بھاری بھرکم اور بہت سی سُریلی آوازیں ایک ساتھ بلند ہو رہی تھیں۔ مفہوم سب کا ایک ہی تھا۔

لدّاخ کوئی علاقہ نہیں، ایک عجوبہ ہے۔ خشک زمین، ننگے پہاڑ، ریت ہی ریت اور درمیان چمکتا ہوا نقرئی دریائے سندھ جسے وہاں لوگ سنگھے کہتے ہیں، یعنی شیر۔ ان کا خیال ہے کہ تبت میں یہ دریا شیر کے منہ سے نکلتا ہے۔

اسی شیر دریا کے کنارے اُس صبح نوعمر لڑکیاں وزن ڈھونے میں مصروف تھیں۔ وہ کام کرتی جاتی تھیں۔ گاتی جاتی تھیں۔ جتنی مصروف اُتنی ہی مسرور، دنیا کے دُکھوں سے اتنی ہی بے نیاز۔

مَیں نے اپنا سفر ایک چھوٹے سے گاؤں اُپشی سے شروع کیا تھا۔ غیر ملکیوں کو ہندوستانی فوج

اُس سے آگے نہیں جانے دیتی۔ وہاں اُپشی میں چھوٹے سے دریا کے کنارے مَیں نے بھیڑیں چرانے والوں کا نغمہ سُنا تھا۔ ایک کنارے پر چرواہا کوئی قدیم گیت گا رہا تھا، دوسرے کنارے پر فوجی ٹینک جدید گولے داغنے کی مشق کر رہے تھے۔

ہمالیہ کے پچھواڑے، قراقرم سے اِدھر، لدّاخ کی وادی میں کتنے سارے منظر مَیں نے دیکھے تھے، کتنی ساری آوازیں مَیں نے سنی تھیں، وہ اونی کپڑوں میں لپٹے ہوئے، چھوٹی چھوٹی آنکھوں والے جوانوں کا ناچنا، وہ چھوٹے سے مجمع کے بیچ بیٹھ کر داستان گو کا قصہ کہنا، اور سننے والوں کا اس کی آواز سے آواز ملا کر گانا، وہ سب یاد آتا ہے۔

لدّاخ کے صدر مقام لیہ سے جب میں چلا تھا تو وہاں کتنا امن اور کتنا سکون تھا۔ نہ فساد، نہ خونریزی، نہ قتل و غارت گری اور نہ جرائم ——— مگر مجھے وہاں سے لوٹے چند ہفتے گزرے تھے کہ خبر ملی کہ یہ لعنت وہاں بھی پہنچ گئی ہے اور لوگ ایک دوسرے کو مار رہے ہیں۔ یہ خبر سنی تو مجھے لیہ کا وہ نوجوان بہت یاد آیا جو اس روز دریا کے پُل پر بیٹھا بنسی بجا رہا تھا۔ چین کی بنسی۔

مَیں لدّاخ کے چھوٹے سے شہر کھلسے پہنچا۔ اس سے آگے فوج تھی اور اس سے آگے سیاچن کی لڑائی تھی۔ وہاں سے اسکردو ذرا دیر کا راستہ تھا مگر ادھر سے جانے کی اجازت نہیں لہٰذا کسی دوسرے اور بہت لمبے راستے سے مجھے اسکردو پہنچنے میں کئی روز لگے۔

تنگ وادیوں میں شور مچاتا، سر پٹختا دریائے سندھ اسکردو میں آ کر یوں پھیل گیا جیسے تھک کر گرم دھوپ میں لیٹ رہا ہو۔ بلتستان کے انداز بالکل جدا تھے۔ وہاں ہوائی جہاز اُترنے لگے تھے، شاہراہ قراقرم کھل گئی تھی اور نئی تہذیب اور نیا علم پوری آن بان سے آ پہنچے تھے جو دین کے جوش اور قدامت پسندی کے جذبے سے ٹکرا رہے تھے اور یہ خطّہ جدید اور قدیم کے درمیان اس اُلجھن کا شکار تھا کہ کدھر جائے اور کدھر نہ جائے۔ اسکردو، چیلاس اور بشام کا یہ بلتستان اور کوہستان کا علاقہ ایک کشمکش کا علاقہ ہے۔

اور اس کے بعد پنجاب ہے۔ دیکھا بھالا، جانا پہچانا اور مانوس۔ مَیں ریل کار میں بیٹھ کر کالا باغ جا رہا تھا۔ مسافر ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے: کہاں سے آ رہے ہو، کہاں جا رہے ہو اور کوئی فقیر کربلا کی داستان کہہ رہا تھا۔

کالاباغ ایک آزاد ملک کا آزاد خطہ ہے مگر اس روز وہاں لوگ آزادی آزادی کا نعرہ لگا رہے تھے۔ ان کو شکایت تھی کہ جاگیرداری کے پنجے اب تک ان کی رگِ جاں میں پیوست ہیں اور کوئی انہیں ظلم سے نجات دلانے کے لیے تیار نہیں۔ مجھے یاد ہے اس روز وہاں مظاہرہ تھا۔ جلوس تھا، آگے آگے ڈھول اور نفیری تھی، پیچھے پیچھے نجات اور آزادی کے نعرے تھے۔

کالاباغ سے میں دریائے سندھ کے قریب داؤد خیل گیا تھا، یہ قدیم اور پسماندہ علاقہ کسی طرح جدید صنعتی علاقہ بن گیا تھا اور ترقی نے آکر وہاں کی تہذیب اور تمدن میں عجیب رنگ گھول دیئے تھے۔ کسی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر پر کوئی خوش گلو نوجوان نغمہ سرا تھا۔

اس کے بعد دریائے سندھ کے کنارے میانوالی کا علاقہ تھا۔ مسائل میں دبا ہوا، کچلا ہوا علاقہ۔ یہاں تہذیب کی شکل بدل رہی تھی۔ یہاں زبان اور بولی بدل رہی تھی۔ لدآخی، بلتی اور ہندکو کے بعد وہ مٹھاس میں ڈوبی ہوئی سرائیکی آگئی تھی جو کانوں میں رس گھولے اور دلوں میں یوں اُترے کہ گہرائیوں کو چھو لے۔ کسی مشاعرے میں کوئی سرائیکی نظم پڑھی جا رہی تھی اور مجمع شاعر کو جینے کی دُعائیں دے رہا تھا۔

میانوالی سے چل کر میں دریائے سندھ کے کنارے کنارے ڈیرہ اسمٰعیل خان گیا تھا، اب وہاں دریا پر پُل بن گیا تھا اور ایک پُل کے تعمیر ہونے سے کتنے ہی منصوبے منہدم ہو گئے تھے۔ کتنی ہی پرانی روایتیں دریا برد ہو گئی تھیں۔ زندگی سہل ہو گئی تھی اور دشوار بھی۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان سے دریا کے کنارے کنارے میں ڈیرہ غازی خان پہنچا تھا۔ یہاں وقت کی چال بدل گئی تھی۔ زمانہ آگے نکل گیا تھا، اور لوگ بڑی بڑی چارپائیوں پر بیٹھے باتیں کرتے اور حقے گڑگڑاتے رہ گئے تھے۔ بلوچ گلوکار پہاڑوں سے اُتر آئے تھے اور رات کے سناٹے میں کسی شجاعت اور دلیری کی داستان گا رہے تھے۔ مجھے وہ سب یاد ہے آج بھی۔

دریا کے ساتھ چلتا ہوا میں سکھر پہنچا تھا۔ وہاں کے لوگوں کے دکھ سکھ قریب سے دیکھے تھے۔ ان کے مسئلے دھیان سے سنے تھے۔ ان کی پریشانیوں کا حال جانا تھا مگر زندگی کا کاروبار جاری تھا۔ کہیں شادیانے بج رہے تھے۔ میں سمجھا کسی جوان کا بیاہ ہے۔ وہ دو کمسن لڑکوں کی ختنہ کی رسم تھی اور سارے علاقے والے محو رقص تھے۔

سکھر سے اس عظیم دریا کے کنارے کنارے میں لاڑکانہ گیا۔ اب فضا میں خوف بھر گیا تھا اور دلوں میں اندیشے۔ اس کے بعد راہ میں موئنجو دڑو آگیا۔ میں نے زندہ شہروں میں موت اور مردہ بستیوں میں زندگی کے قدموں کی چاپ سنی۔ دریا ان سب سے بے نیاز، بڑھتا بڑھتا حضرت شہباز قلندرؒ کی قدم بوسی کے لیے سیہون جا پہنچا۔

سیہون شریف کی اونچی گلیوں سے گزر کر میں حیدرآباد کی ریشم گلی میں جا پہنچا۔ کیسا محبتوں کا شہر تھا، کیسی نفرتوں نے اس میں گھر کرلیا۔ اس روز بھی وہاں گولی چلی تھی اور دو بچّے مر گئے تھے۔ ریشم گلی میں سناٹا تھا بس ایک مکان کے برآمدے میں بیٹھا ایک تنہا لڑکا خود سے کھیل رہا تھا۔ اس کا نام نانک تھا۔

مگر جوں ہی دھماکوں کا شور مدھم ہوا اور بھگدڑ کی گرد بیٹھی حیدرآباد میں زندگی لوٹ آئی۔ مجھے یاد ہے میں نے کتنے بہت سے لوگوں سے باتیں کی تھیں۔ وہ سب جینے کے خواہش مند تھے۔ سڑکوں پر رونق تھی، چہل پہل تھی۔ بازار گاہکوں اور خریداروں سے بھرے ہوئے تھے۔ عورتیں اپنی ہتھیلیاں کو مہندی سے رنگ رہی تھیں اور کلائیوں کو چوڑیوں سے سجا رہی تھیں۔

اور پھر میں سجاول سے گزرا جہاں منشیات والوں کو طاقت کے ذریعے کچل کر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ اب یہ کبھی سر نہیں اٹھائیں گے۔

اور میں ٹھٹھہ سے گزرا اور یہ دیکھتا ہوا گزرا کہ جس علاقے کو دریا، سمندر اور سڑکیں چھوڑ جائیں وہ ٹھٹھر کر ٹھٹھہ رہ جاتا ہے۔ محمد ہاشم ٹھٹھوی جیسے استاد کے شہر میں اس روز شاگردوں نے استاد کے وہ سارے ادب لحاظ اٹھا کر اونچے طاق پر رکھ دیئے تھے۔

لیکن یہاں اس علاقے میں، جہاں دریا تھک کر خاموش ہوگیا ہے، بہت امن اور سکون ہے۔ نہروں نے اس زمین سے چاندی اُگائی ہے۔ اس مٹی کی خوبیاں کسی کو معلوم نہ تھیں۔ اب اس کے درختوں پر سونا اُگا ہے جس پر پھلوں کا گمان ہوتا ہے۔ اس خاک سے جو اونچا گنّا پیدا ہوا ہے، وہ ذرا دور بحرِ عرب سے اُٹھنے والے بادلوں کو چھُو لے تو تعجب نہ ہو۔

اور اب اپنے سفر کے خاتمے پر میں بھی تھک گیا ہوں۔ سفر بھی ختم ہو رہا ہے اور دن بھی۔ پرندے اپنے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ یہاں سے مَیں بھی اپنے گھر کو لوٹوں گا اور پھر خدا نے چاہا تو اپنے

سفر کی روداد آپ کو سناتا رہوں گا۔ مگراب وقت آگیا ہے خاموشی اختیار کرنے کا۔ سندھ کے ان نشیبوں میں؛ چھوٹے سے اس گاؤں کی چھوٹی سی مسجد سے مغرب کی اذان کی صدا بلند ہو رہی ہے۔ ساتھ ہی پرندوں کی سُریلی آوازیں بھی ہیں۔

زبانیں جُدا ہیں۔

مفہوم ایک ہے۔

چاندی کی لکیر

یہ لدآخ ہے۔ ہمالیہ کے پچھواڑے۔ اَن گنت برفانی چوٹیوں سے پرے اور قراقرم کے پہاڑوں سے اِدھر۔

یہ لدآخ ہے۔ خشک، پتھریلا، ریتلا، بنجر اور دیکھنے میں اجاڑ۔

یہ لدآخ ہے اور اس کے بیچوں بیچ چاندی کی رنگت جیسی دور تک چلی جانے والی ایک لکیر۔ یہی سندھ ہے۔ دریائے سندھ۔

اندر کہیں چینی تبت میں، جھیل مانسرور کے پاس، کیلاش کے پہاڑوں سے یہ دریا یوں نکلتا ہے جیسے چھوٹے بچّے کو ماں نے بنا سنوار کر کھیلنے کے لیے گھر سے باہر کر دیا ہو۔ کم سے کم مجھے تو یہ بچّہ نظر آیا۔ ایسا دریا جسے مَیں پائنچے چڑھا کر ننگے پاؤں پار کر گیا۔ مگر یہاں کے لوگ کہتے ہیں کہ یہ گھر سے نکلا ہوا بچّہ نہیں، شیر کے مُنہ سے نکلا ہوا دریا ہے۔ لدآخ میں اس کا نام سنگھے کھبب ہے۔ سنگھے، یعنی شیر، کھبب، یعنی منہ۔

تبت سے نکل کر، چھوٹے سے قصبے دم چُک کے مقام پر یہ شیر دریا لدآخ میں داخل ہوا تو مَیں اُس صبح اسے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

مَیں نے تو اسے نیچے وادیوں اور میدانوں میں دیکھا تھا۔ سمندروں کی طرح کشادہ، طوفانوں کی طرح زور آور۔ چٹانوں سے ٹکراتا، وادیوں میں شور مچاتا، میدانوں کو جل تھل کرتا یہ دریا وہاں بارہ پندرہ ہزار فٹ اوپر لدآخ کی ریتلی وادی میں کسی نوخیز لڑکی جیسا نظر آیا چپ چاپ، تھوڑا سا ملگجا، گرنیلگوں اور روپہلا اور پہاڑوں کے پیچھے دیر سے ابھرنے والے سورج کی پہلی پہلی کرنیں گوتم بدھ کے روپہلے مجسّموں کی پیشانیوں سے اپنا بدن چھو چھو کر یوں آہستہ سے دریا میں اُتر رہی تھیں جیسے کوئی بہت مقدّس پانی میں پہلے آہستہ سے اپنے پیر کی انگلیاں ڈبوئے، پھر تلوے اور آخر میں ایڑیاں۔ مَیں نے

اُس روز کرنوں کو دریا میں اُترتے دیکھا تھا۔

میں لداخ پہنچا تو اُسے ویسا بالکل نہ پایا جیسا سوچا تھا۔ ساری زمین سوکھی ہوئی، سارے پہاڑ برہنہ، اُن پر سے ڈھلک کر نیچے تک چلی آنے والی ریت جیسے بہی چلی آرہی ہو۔ بادل اِکّا دُکّا، بارش کا کہیں نام نہ نشان۔ بس ایک یہ میرا دریا اور اس کے کنارے کنارے چلی گئی ایک سڑک۔

راہ کی دونوں طرف کہیں بسیرے، کہیں مندر، کہیں خانقاہیں۔ پچھلی صدیوں کے دوران مرنے والے راہبوں کی راکھ کے دفینے۔ کہیں مسجدیں اور کہیں امام باڑے۔ اور وہ چوکور چوکور مکان، جن میں باہر کو کھلتی ہوئی شفاف شیشے کی کھڑکیاں اور چھتوں کے اوپر قرینے سے چُنا ہوا بھوسا جو مکانوں کو گرم رکھتا ہے اور مویشیوں کو زندہ۔ اور پھر ہر مکان کے اوپر جھنڈیاں ہی جھنڈیاں، رنگا رنگ اور بے شمار۔ شاید گوتم بدھ نے کہا تھا، یا شاید نہیں کہا تھا مگر لوگ کہتے ہیں کہ یہ سینکڑوں جھنڈیاں ہزاروں بلاؤں کو دور رکھتی ہیں۔ کیسے اچھے لگے وہ مکان اور کیسے اچھے تھے ان کے مکین۔ سُرخ گالوں والے بچّے، آڑو، ناشپاتی اور خوبانی جیسے گالوں والی، گھنے گھنے سیاہ بالوں والی عورتیں۔ گٹھے ہوئے، کسرتی بدن والے چھوٹے چھوٹے قد والے مرد، سب کے بدن پر موٹا اونی چُغہ اور سب کی چھوٹی چھوٹی منگول آنکھوں میں کچھ سکون، کچھ مسرت اور کچھ طمانیت کی آمیزش!

ان ہی لوگوں میں مجھے اکبر لدّاخی ملے۔ کمال کے انسان۔ لدّاخ سے انہیں نکال لینا ایسا ہی ہوگا جیسے دلّی سے قطب مینار کو نکال لینا۔ اپنی سرزمین کو، اس کے باشندوں کو، ان کے رسم و رواج کو یوں جانتے ہیں کہ بیان کرنے پر آجائیں تو وہ شاید کہتے کہتے تھک جائیں مگر سننے والا بھلا کیوں اکتائے۔

شہر لیہہ کی ایک شام کے سنّاٹے میں، ہوٹل کے نیم تاریک کمرے میں، ہلکی ہلکی گرمی بکھیرنے والی بخاری کے پہلو سے پہلو ملائے وہ مجھے لدّاخ کے بارے میں بتا رہے تھے۔ میں نے اکبر لدّاخی سے پوچھا کہ لدّاخ کے علاقے میں بودھ باشندے بھاری تعداد میں ہیں، پھر بہت سارے مسلمان ہیں تھوڑے سے عیسائی بھی ہیں۔ یہ علاقہ باقی دنیا سے الگ تھلگ ہے، تو یہ لوگ آپس میں کس طرح رہتے ہیں۔ ان کا تمدّن کیسا ہے؟

اکبر لدّاخی بولے "اس علاقے میں جو مذہبی رواداری، میل ملاپ اور بھائی چارا ہے وہ شاید دنیا

کے بہت کم علاقوں میں ہو۔ دوسری بات یہ کہ یہاں کی روایات، محفل کے آداب اور بات چیت کے طور طریقے نہایت پُرتکلف اور بہت ہی دل پذیر ہیں۔"

اب میرا تجسس بڑھا۔ میں نے کہا کہ یہ تو تنگ گھاٹیوں اور خطرناک دروں کا علاقہ ہے۔ کیا لداخ کی تہذیب باہر کے اثرات سے محفوظ ہے یا بیرونی تہذیبیں یہاں پہنچنے میں کامیاب ہوئی ہیں؟

اکبر لداخی کے پاس میرے ہر سوال کا جواب تیار تھا۔ جھٹ بولے "جی، یہ سنگم ہے کئی تہذیبوں کا۔ بنیادی طور پر بودھ تہذیب ہے۔ پھر بلتستان سے آئی ہوئی روایات ہیں اور تجارت کی وجہ سے یارقند، کشمیر، تبّت، ان تمام علاقوں کا یہاں اثر ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کی تہذیبی زندگی میں مسیحی مشنریوں کا بہت بڑا ہاتھ رہا ہے۔ سوا سو سال پہلے موروِیَن مشنری لداخ آئے تھے۔ عیسائیت پھیلانے میں انہیں کچھ زیادہ کامیابی نہیں ہوئی اور صرف آٹھ دس گھرانوں نے یہ مذہب اختیار کیا البتہ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ لداخ میں کتائی، بُنائی اور کڑھائی کا جو طریقہ ہے وہ بالکل جرمن انداز کا ہے۔ عورتیں یہ سارے کام دائیں طرف سے کرتی ہیں۔ دوسرے یورپین ملکوں کی طرح بائیں طرف سے نہیں۔"

باہر کی تہذیبوں کا ذکر ہو چکا۔ اب مجھے اندر کی تہذیبوں کا خیال آیا۔ میں نے پوچھا کہ یہ جو مختلف مذہبوں کے لوگ یہاں آباد ہیں۔ آپس میں ان کے شادی بیاہ ہوتے ہیں یا نہیں؟ یہ لوگ اس طرح کی تقریبوں میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں یا الگ تھلگ رہتے ہیں؟ اب تو خیر لداخ کھل گیا، پہلے یہاں کیا روایت تھی؟

انہوں نے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا "حضور پہلے تو جو تھی وہ تھی، اب بھی کچھ کم نہیں ہے۔ مجھی کو لیجئے۔ میری ماں ایک بہت ہی معزز بودھ خاندان کی ہے۔ ظاہر ہے کہ میری پوری ننہال بودھ ہے۔ میری بیوی مسیحی خاندان سے ہیں۔ ان کے تمام رشتے دار مسیحی ہیں۔ میں خود شیعہ خاندان کا ہوں۔ تو ظاہر ہے کہ ہم نہ صرف شادی بیاہ اور غمی خوشی میں ایک دوسرے کا ساتھ دیتے ہیں بلکہ کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے ہاتھوں ان کی امداد ہو اور وہ ہماری مدد کریں۔"

میری تشفی نہیں ہوئی۔ میں نے کہا کہ اکبر لداخی صاحب۔ یہ بات دلچسپ ہے۔ ذرا تفصیل سے بتائیے شادی اور غمی میں لوگ کس طرح ہاتھ بٹاتے ہیں، کیسے ایک دوسرے کا سہارا بنتے ہیں؟

جواب ملا، یہ مثلاً دیکھیے۔ یہاں شادی بیاہ کے موقع پر ہوتا یہ ہے کہ جب لڑکے کے ماں باپ لڑکی کو پسند کر لیتے ہیں تو ایک دعوت دیتے ہیں جس کو لدّاخی زبان میں فیصلے کی شراب نوشی کہتے ہیں۔ اس دن وہ اپنے تمام رشتہ داروں سے معذرت طلب ہوتے ہیں کہ معاف کیجئے ہم آپ کو اطلاع نہیں دے سکے۔ اصل میں چاند تاروں کو دیکھا تو نجومی نے کہا کہ یہ لڑکی ہمارے لڑکے کے لیے اچھی ہے۔ چنانچہ اب ہم آپ سب کی اجازت سے اپنے لڑکے کی شادی کرنا چاہتے ہیں۔ آیئے تاریخ کا فیصلہ کریں۔ پھر نہ صرف تاریخ کا فیصلہ ہوتا ہے بلکہ لڑکے کے چچا، ماموں اور دوسرے عزیز رشتے دار اپنے اپنے ذمے کچھ لے لیتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ جی مکھن پر جو خرچہ ہوگا وہ میں اٹھاؤں گا۔ کوئی کہتا ہے کہ چاول کا سارا خرچ میرے ذمے۔ کوئی کہتا ہے کہ گوشت سارا میرا ہوگا۔ تو اس طرح سب مل کر لڑکے والوں کے اخراجات کو برداشت کر لیتے ہیں۔ یہ بہت بڑی خوبی ہے۔ اسی طرح مرنے پر بھی رشتے دار پاٹھ پوجا میں حصہ لیتے ہیں، اس کے اخراجات میں ہاتھ بٹاتے ہیں اور بودھ لاماؤں کے خرچ میں بھی دوست اور رشتے دار برابر کے شریک ہوتے ہیں۔"

میرا تجسس اور بڑھا۔ "اچھا یہ بتایئے کہ شادی بیاہ کے اخراجات کا زیادہ بوجھ کس پر پڑتا ہے، لڑکے والوں پر یا لڑکی والوں پر؟ اور لدّاخ میں بھی بھاری بھرکم جہیز دیتے ہیں یا نہیں؟"

اکبر لدّاخی نے دلچسپ باتیں بتائیں۔ کہنے لگے "یہاں جو جہیز دیتے ہیں وہ محض رسمی ہے۔ زیادہ بوجھ اصولاً لڑکے پر پڑنا چاہیے مگر ہوتا یہ ہے کہ شادی زیادہ دھوم سے نہیں ہوتی۔ لڑکے والے معمولی سی دعوت دیتے اور اُسے شادی کہتے ہیں۔ لڑکی کی ماں اپنے سر کی اوڑھنی لڑکی کو دے دیتی ہے اور اُسے یہ لوگ جہیز تصور کرتے ہیں۔ یہاں ایمانداری کی بات یہ ہے کہ جہیز کی رسم اتنی سادہ ہے کہ مہمانوں کو مزاح کے انداز میں بتایا جاتا ہے کہ تین ٹوٹے ہوئے برتن دیئے گئے ہیں، دو کچے انڈے اور ایک لنگڑا گدھا۔ یہ اعلان تیر اندازی کی تقریب میں ہوتا ہے۔"

تیر اندازی کا ذکر سن کر مجھے محکمہ سیاحت کے وہ کتابچے یاد آ گئے جن کی تصویروں میں لدّاخ والوں کو تیر چلاتے اور پولو کھیلتے دکھایا جاتا ہے۔ میں نے اکبر لدّاخی سے پوچھا کہ کیا لدّاخ میں ان دو کھیلوں کا بہت رواج ہے؟

کہنے لگے "جی ہاں۔ پولو تو مسلمان لائے ہیں۔ جب سے مسلمان یہاں آئے ہیں، خصوصاً شگر چیتن

کے مسلمانوں کے آنے کے بعد پولو شروع ہوا ہے اور مسلمانوں کے ہر گاؤں میں ایک پولو گراؤنڈ ہوتا ہے جسے شگرن کہتے ہیں۔ اور ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ پولو ابھی ماضی قریب تک مقابلے کا کھیل نہیں تھا بلکہ ملاقات کی تقریب تھی۔ جب کسی کے پاس اچھا گھوڑا ہوا وہ گھوڑے پر چڑھ کر آیا اور ڈنکے پر چوٹ پڑی۔ اس آواز کو بھم کہتے ہیں۔ یہ اطلاع ہوتی ہے کہ صاحب اب پولو شروع ہونے والا ہے۔ اِدھر تین بھم ہوئے، اُدھر لوگ اپنے اپنے گھوڑوں پر آئے اور دو حصّوں میں تقسیم ہو کر پولو کھیلنے لگے۔ اس کھیل کے خاص ضابطے بھی نہیں تھے۔ کھلاڑیوں کی تعداد بھی مقرّر نہیں تھی۔ میدان کی لمبائی چوڑائی کا بھی کوئی خاص خیال نہیں رکھا جاتا تھا۔ مگر اب لوگوں نے کافی ترقّی کر لی ہے۔ کچھ قوانین بن گئے ہیں، کچھ قاعدے بن گئے ہیں اور لوگ آج پہلے سے بہت ہی بہتر پولو کھیل رہے ہیں۔"

تیر اندازی کی بات رہ گئی۔ میں نے یاد دلاتے ہوئے پوچھا کہ لدّاخ والوں کی زندگی میں تیر اندازی کو کیا مقام حاصل ہے۔ اس کی کیا اہمیت ہے؟

وہ بولے "ہماری سماجی زندگی کا اہم ترین مقام آپ تیر اندازی کو دے سکتے ہیں۔ تیر اندازی موسمِ بہار کی آمد کی نوید ہے۔ اب کام شروع ہونے کی نقیب ہے اور لوگوں کے لیے ایک بار مل کر آئندہ سال کے پورے پروگرام ترتیب دینے کا موقع ہے۔ یہاں تو صاحب محلے محلے میں تیر چلانے کا مقابلہ ہوتا تھا اور تیر اندازی ایسی چیز ہے جس کی وجہ سے ہمارے لوک گیت اور لوک ناچ آج تک زندہ اور باقی ہیں۔"

میں نے کہا "مگر اکبر صاحب۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آئی، تیر اندازی کی وجہ سے آپ کہتے ہیں ناچ گانا زندہ ہے، اس کا تیر اندازی سے کیا تعلق؟"

کہنے لگے "صاحب تیر اندازی جو ہے وہ تیر چلانے کا اتنا مقابلہ نہیں جتنا اپنے کپڑوں کی نمائش اور اپنے رقص کی نمائش کا ہے، اور آواز کی نمائش کا ہے۔ اُس دن آدمی اپنے بہترین کپڑوں میں آتا ہے، اور اگر اس کے سارے تیر نشانے پر لگتے ہیں تو پھر اسے ایک رقص کی قیادت کرنا ہوتی ہے، وہ ایک مخصوص انداز میں ناچتا ہے اور گاتا ہے اور سینکڑوں لوگ نہ صرف اس کے شریک بن جاتے ہیں بلکہ رقص کی داد بھی دیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "لدّاخ کے لوک گیتوں کے بارے میں جاننا چاہوں گا اکبر صاحب۔ یہاں لوک گیتوں

کے ریکارڈ نہیں بنتے، کتابیں نہیں چھپتیں۔ اب بتایئے کہ لدّاخ میں ان گیتوں کا مستقبل کیسا نظر آتا ہے آپ کو؟ ——"

جواب ملا —" میں یوں عرض کروں گا۔ لوک گیت کو کسی حد تک ریڈیو لیہ نے زندہ رکھا مگر جب سے مغربی سیاح آنے لگے ہیں لوک گیت اور بھی بھرپور طور پر سامنے آئے ہیں۔ مغرب والے لوک موسیقاروں کو ڈھونڈتے ہیں۔ ان کی ریکارڈنگ کرتے ہیں، حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ چنانچہ کئی گیت جو مٹ چکے تھے پھر زندہ ہو گئے ہیں۔ مثلاً راجوں کی محفل میں ساقی کا شراب پیش کرنے کا ناچ اب دوبارہ زندہ ہو گیا ہے اور لوگوں کی ٹولیاں بن گئی ہیں جو لدّاخی لوک ناچ دکھانے کے لیے آپس میں مقابلہ کر رہی ہیں۔ یہی حال گیتوں کا اور سازوں کا ہے۔ یہ سب جی اٹھے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ ہمارے لوک ورثے کا مستقبل بہت خوش آئند ہے۔"

میرا اگلا سوال اس گفتگو کا آخری سوال تھا۔ میں نے کہا —" اچھا اکبر لدّاخی صاحب۔ میں نے سُنا ہے کہ موسیقی کی کچھ روایت مسلمان لائے تھے۔ اور یہ بھی سنا ہے کہ لدّاخ کے راجا بلتستان کی طرف سے مسلمان شہزادیاں بیاہ کر لاتے تھے اور اس بودھ علاقے میں آ کر اسکردو کی شہزادیوں نے مسلم تہذیب کو پھیلایا اور میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ وہ راجاؤں سے کہہ کر یہاں مسجدیں بھی تعمیر کراتی تھیں؟" ——

اکبر لدّاخی اپنے مخصوص جوشیلے لہجے میں بولے "جی ہاں۔ بالکل۔ یہ جو بزگنگ میں مسجد ہے یہ ان ہی کے لیے تھی۔ میں یہ عرض کروں گا کہ یہاں جو موسیقی ہے وہ بلتی شہزادیوں کے ساتھ جہیز میں آئی تھی۔ یہ جتنے کھر منگ ہیں (کھر کے معنی محل، منگ کے معنی موسیقار۔ یعنی محل کے موسیقار) یہ سب کے سب زی زی خاتون کے جہیز میں اسکردو سے آئے تھے اور ایک ہی جگہ یہاں پھیانگ میں آباد ہیں۔"

میں نے پوچھا "اب تک ہیں؟"۔

انھوں نے کہا "اب تک ہیں!"۔

میں نے پوچھا "اور کیا ان کی موسیقی کی وہی روایت ہے جو اسکردو میں تھی؟"۔

جواب ملا —" جی نہیں۔ میرے دادا نے ان کا یہ گانا بجانا بند کرا دیا اور کہا کہ صاحب ہمارا مذہب

اجازت نہیں دیتا۔"

باتیں کرتے کرتے ہم اپنے ہوٹل سے باہر نکل آئے۔ لداخ کا چمکیلا چاند ہم سے بھی پہلے نکل آیا تھا اور پگڈنڈی کے ساتھ ساتھ بہنے والے پہاڑی چشمے کی لہریں گا رہی تھیں اور ان پر چاندنی ناچ رہی تھی۔

پہلا گاؤں

پھر وہی دریائے سندھ کا کنارہ ہے اور وہی دونوں جانب لدّاخ کے اونچے بنجر پہاڑ جن کے دامن میں ہر طرف پتھر بکھرے ہیں اور گھاس کا ایک تنکا بھی نظر نہیں آتا۔ لوگ کہتے ہیں کہ چاند پر اُتر کر اس کا نظارہ کرنا مشکل ہو تو جا کر لدّاخ کی زمین دیکھ لو۔

مگر میں چاند جیسی زمین نہیں، چاندی جیسا پانی دیکھنے لدّاخ گیا تھا۔ سرحد پار تبت کے علاقے میں کیلاش کی پہاڑیوں سے نکل کر دریائے سندھ۔ یہاں آگیا ہے اور میں ایک چھوٹے سے گاؤں میں آپہنچا ہوں جو دیکھنے میں دریائے سندھ کے کنارے لیکن حقیقت میں ایک پہاڑی نالے کے قریب آباد ہے۔ دریا کافی نیچے گھاٹی میں ہے اور یہ نالہ جا کر اُس میں گر رہا ہے۔ یہاں کچھ درخت لگے ہیں۔ کچھ کھیت اُگے ہیں جنہیں وہ دریا نہیں۔ یہ نالہ سیراب کر رہا ہے۔ کھیتوں کے بیچ پانچ دس کچّے گھروندے ہیں اور ذرا اُونچائی پر بھیڑ بکریوں کا ایک فارم ہے جہاں کوئی چرواہا گا رہا ہے۔

یہ لدّاخ میں وہ جگہ ہے کہ مجھ جیسے غیر ملکیوں کو اس سے آگے جانے کی اجازت نہیں —میں دریا کے بہاؤ کے ساتھ ساتھ اپنا سفر یہیں سے شروع کروں گا اور پانی کے ہاتھوں میں ہاتھ دے کر پہاڑوں پر چڑھتا، وادیوں میں اُترتا، میدانوں میں دوڑتا وہاں تک جاؤں گا جہاں تک یہ دریا جاتا ہے۔

میں لدّاخ کے اس چھوٹے سے گاؤں کی کچی سڑک پر چلنے لگا۔ دیکھتا جاتا تھا کہ اس میں کون لوگ رہتے ہیں۔ کیسی زندگی گزارتے ہیں، اس دریا کے بارے میں کیا کہتے ہیں اور ساری دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے یہ لوگ زبان کونسی بولتے ہیں؟

مجھے تین دیہاتی ملے۔ وہی چھوٹی چھوٹی ترچھی آنکھیں۔ آنکھوں کے نیچے اُبھری ہوئی ہڈیاں۔ تونسی ہوئی رنگت اور پیلے پیلے دانت۔ میں نے پوچھا "آپ لوگوں کے گاؤں کا کیا نام ہے؟"

وہ بولے "اُپشی"

مجھے صحیح جواب ملنے سے زیادہ خوشی اس بات کی تھی کہ وہ میرا سوال سمجھ گئے تھے۔ اب میں نے پوچھا: "آپ سب اسی گاؤں میں رہتے ہیں؟"

خیال تھا وہ کہیں گے "ہاں" مگر جواب ملا — "جی"

"آپ کے بچّے پڑھنے جاتے ہیں اسکول؟"۔

"جی"

"آپ لوگ کیا کھیتی باڑی کرتے ہیں؟"

"جی"

"آپ کیا چیز اُگاتے ہیں؟"۔

"یہی گیہوں، جَو، شلغم، سرسوں، مٹر وٹر۔"

"آپ مویشی پالتے ہیں؟"

خاموشی

"میرا مطلب ہے آپ جانور پالتے ہیں؟"۔

"جی —"

"کون سے جانور پالتے ہیں؟"۔

"بکرے، بھیڑیں، گائے۔"

"آپ کے بچوں کا اسکول کہاں ہے؟"۔

"اُوپر ہے — وہ اُوپر۔"

"کتنے بچے ہیں اس اسکول میں؟"

"دس پندرہ۔"

"بس؟ زیادہ بچّے کیوں نہیں آتے؟"

اور اب پہلی بار میرے سوال کا ذرا طویل جواب ملا اور سارے دیہاتی ایک ساتھ بولنے لگے۔

"یہ گاؤں چھوٹا ہے۔ پانچ چھ گھر ہیں۔ زیادہ گھر نہیں ہیں۔"

گاؤں کی کچی سڑک پر ایک چھوٹی سی لڑکی چلی آرہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"جب یہ لڑکی بڑی ہو جائے گی تو کیا اسکول جائے گی؟"

"جی ہاں۔ یہ اسکول جائے گی"

اب میں نے ایک دیہاتی سے پوچھا "آپ نے اسکول کی تعلیم پائی ہے؟"

"نہیں جی"

دوسرے سے پوچھا "آپ کو لکھنا پڑھنا آتا ہے۔"

وہ سب کے سب بولنے لگے "نہیں جی۔ یہاں پہلے اسکول تھا ہی نہیں۔ اسکول کا نام بھی نہیں تھا۔ لیہ میں ایک اسکول تھا۔ اُسی کا نام سنا۔ باقی اسکول دیکھا ہی نہیں"

ان کے جواب طویل ہونے لگے — میں نے پوچھا "آپ کے بچے پڑھ لکھ کر جب بڑے ہو جائیں گے تو کیا کریں گے۔ کچھ سوچا ہے آپ نے؟"

"جی — گورمنٹ کی طرف سے کوئی نوکری کوئی کام مل جائے گا تو کام کریں گے"

برصغیر کے زیادہ تر باشندوں کی طرح ان لداخی کسانوں نے بھی ساری آس حکومت سے لگا رکھی تھی مگر، وہی زیادہ تر باشندوں کی طرح یہ لوگ بہت پُراُمید بھی نہیں تھے — مَیں نے پوچھا۔ یہاں، اس دور دراز گاؤں میں اگر کوئی بیمار ہو جائے تو آپ لوگ علاج کے لیے کیا کرتے ہیں؟"

فوراً ہی جواب ملا — "لیہ جانا پڑتا ہے"

مَیں حیران ہو کر بولا "لیہ جانا پڑتا ہے؟

اب ان کی گفتگو میں پہلا انگریزی لفظ آیا — "جی سَر۔ بہت تنگی ہے۔ قریب کوئی اسپتال نہیں ہے"

میں نے کہا "اُدھر لیہ میں تو بڑی ترقی ہوئی ہے۔ پیسہ آگیا ہے۔ اچھے مکان بن گئے ہیں۔ لوگ اچھے کپڑے پہننے لگے ہیں۔ آپ کے گاؤں کا کیا حال ہے؟"

دیہاتی تو چپ رہے، اب ان کی مایوسی بولی "ہم لوگوں کا گاؤں چھوٹا ہے، اسے کون دیکھے گا۔ اوپر سے کوئی دیکھنے والا نہیں ہے۔ جب کوئی چیز آتی ہے بس نیچے ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ہم لوگوں تک کوئی چار آنے بھی نہیں پہنچتے۔ ایسے تو یہ لوگ بہت پبلک پبلک کرتے ہیں مگر ہمیں پوچھنے والا کوئی نہیں ہے"

احساسِ محرومی کا عجب معاملہ ہے، جہاں کچھ اور نہیں پہنچتا، جھٹ وہاں پہنچ جاتا ہے۔
پبلک پبلک کرنے والے سیاستدانوں نے ان غریبوں کو احساسِ محرومی میں مبتلا کیا، یہ سُن کر مجھے ذرا سی بھی حیرت نہیں ہوئی مگر وہی حیرت مجھ پر بجلی بن کر گری جب دریائے سندھ کا ذکر چھڑا۔ میرے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ یہ اتنا بڑا دریا بھی ان چھوٹے چھوٹے لوگوں میں محرومی کا احساس بھر سکتا ہے۔

مَیں نے دریا کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا "اس دریا کا کیا نام ہے؟"

جواب ملا — "سنگھ۔ سنگھے دریا"

"اس سنگھے کا کیا مطلب ہوتا ہے؟"

یہ سوال کم، امتحان زیادہ تھا۔ دیہاتی بولے "سنگھے کا مطلب تو اتنا خاص پتہ نہیں۔ کہتے ہیں کہ اُدھر بہت دور چائنا سے اس کا پانی آتا ہے۔ وہاں شیر کا منہ جیسا ہے، اُس سے پانی آتا ہے۔ اسی لیے اس کا نام سنگھ دریا رکھا ہے —"

امتحان ابھی جاری تھا۔ میں نے پوچھا "آپ کو پتہ ہے کہ یہ دریا پھر بہتا ہوا کہاں تک جاتا ہے؟"

تین آدمیوں نے ایک ساتھ تین جواب دیئے "پاکستان جاتا ہے، پتہ نہیں کہاں جاتا ہے، بہت دور جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا "دریا آپ کے بہت قریب ہے پھر یہاں ہریالی اتنی کم کیوں ہے؟"

تینوں بولے — "اس کا پانی ہمیں نہیں ملتا۔ نیچے ہی نیچے چلا جاتا ہے۔ اوپر نہیں لے سکتے۔ اس دریا کے پانی سے ہم لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ وہ نیچے سے چلا جاتا ہے۔ ہم لوگ اُوپر رہ جاتے ہیں۔"

مَیں نے تصدیق چاہی "یعنی دریا ہے مگر بیکار ہے —"

جواب ملا — "بیکار ہے جی۔"

میں بولا — "اس میں باڑھ آتی ہوگی۔ یہاں اوپر آپ کے گھروں تک آتی ہوگی۔"

وہ بولے — "گھروں تک تو نہیں آتی مگر یہ دریا ہماری کھیتی کو بہت نقصان پہنچاتا ہے۔ کھیتی لے جاتا ہے۔ سامنے جو درخت لگے ہیں ان کو لے جاتا ہے۔ نقصان تو بہت کرتا ہے، فائدہ کچھ نہیں۔"

میں سوچنے لگا کہ یہ کیسا دریا ہے جو نیچے میدانوں میں جا کر کروڑوں کو زندگی عطا کرے اور جس کے متعلق یہاں بلندیوں پر لوگ کہتے ہیں کہ اس سے ہمیں نقصان تو ہے، فائدہ کچھ نہیں۔

اُپشی سے ذرا اوپر بکریوں کا سرکاری فارم ہے جن سے پشمینہ حاصل ہوتا ہے۔ وہی نرم اور ملائم اون کہ سری نگر میں جس کی ایک ایک سادہ اور معمولی شال بارہ بارہ ہزار روپے کی تھی۔

مَیں فارم میں پہنچا تو اسی چرواہے سے ملاقات ہوئی جو ابھی ان پتھریلی زمینوں میں نغموں کی فصلیں اُگا رہا تھا۔ اس کا نام محمد علی خان تھا۔ سیدھا سادہ، بھولا، تمیزدار اور ہر بات میں سَر سَر کا اضافہ کرنے والا۔

محمد علی خان نے مجھے پشمینے کی بکریوں کے بارے میں بہت کچھ بتایا۔ اس فارم میں سات سو بکریاں ہیں۔ سال میں ایک بار ان کے بالوں میں کنگھی کی جاتی ہے اور کنگھی میں پھنس کر جو ملائم بال اترتے ہیں وہی رئیسوں کی شالوں، سوئٹروں، جرابوں اور دستانوں میں ڈھل جاتے ہیں۔ ایک ایک بکری سے دو سو سے لے کر پانچ سو گرام تک پشمینہ اُترتا ہے۔ یہ بکریاں بس یہیں اتنے اونچے علاقوں میں ہوتی ہیں۔ نیچے میدان انہیں راس نہیں آتے۔ چونکہ قیمتی ہوتی ہیں اس لیے ان کی نگرانی کے لیے چرواہے رکھے جاتے ہیں۔ وہ نہ ہوں تو پہاڑوں سے اُترنے والے درندے انہیں کھا جائیں۔

ان کی حفاظت کرتے کرتے چرواہوں کو ان سے لگاؤ تو ضرور ہوتا ہوگا۔ بکریاں خود بھی اپنے چھوٹے چھوٹے دلوں میں اپنے ان رکھوالوں کے لیے وہ جذبے ضرور محسوس کرتی ہوں گی جن کا ان کے ہاں کوئی نام نہ ہوگا۔ بس یہ کہ ان میں کوئی تصنع نہ ہوگا، کوئی بناوٹ نہ ہوگی، کوئی غرض نہ ہوگی۔

میں ان کے دلوں میں جھانک نہ سکا البتہ محمد علی خان سے باتیں کرتے کرتے باتوں کا رُخ ادھر کو ایک بار موڑا ضرور۔ میں نے پوچھا "اس ویرانے میں یہی بکریاں آپ کی ساتھی اور رفیق ہوتی ہیں۔ ان سے تو آپ کو محبت ہو جاتی ہوگی؟"

وہ بولے "جی سر۔ یہ تو ہمارے بچوں کی طرح ہیں۔ ہم انہیں ہر صبح گھاس ڈالتے ہیں۔ ان کو چَرانے کے لیے لے جاتے ہیں اور صبح شام ان کے شیڈوں کو صاف کرتے ہیں۔ انہیں اچھی طرح دودھ پلاتے ہیں اور پانی بھی پلاتے ہیں"

میں نے پوچھا "ان کو پہچانتے ہیں آپ؟ ان کے کوئی نام وغیرہ رکھتے ہیں؟"

جواب ملا ــــ" نہیں۔ ان کے نام نہیں ہوتے بلکہ ان کے کانوں پر الگ الگ نمبر لگاتے ہیں۔ ان کے نمبر سے پتہ چلتا ہے کہ کون سی بکری کمزور ہے، کون سی بیمار ہے۔"

میں نے پوچھا" آپ تو اپنی بکریوں سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ بکریاں بھی آپ سے محبت کرتی ہیں یا نہیں۔ وہ آپ کو پہچانتی ہیں؟ ــ"

" وہ ہمیں خوب پہچانتی ہیں۔ یہ بڑے بڑے پہاڑوں میں چر رہی ہوتی ہیں مگر ہم انہیں آواز دیتے ہیں تو آجاتی ہیں اور کبھی شیڈ کے اندر ہوں اور ہماری آواز سُنیں تو اندر سے چلّانے لگتی ہیں۔ وہ ہم سے بہت پیار کرتی ہیں ــــ"

اُپشی میں دریائے سندھ کے کنارے یہ سادہ لوح چرواہا مجھ سے باتیں کر رہا تھا اور دوسرے کنارے پر فوجی ٹینک گولے داغنے کی مشق کر رہے تھے۔ ہر بار جب گولے پھٹتے، مَیں گھبرا کر آواز کی سمت دیکھتا، مگر فارم میں پلنے والے چھوٹے چھوٹے میمنے آنکھیں موندے سوتے رہے اور کبھی آنکھ کھول کر بھی نہ دیکھتے۔ مَیں ٹھہرا اجنبی، وہ تو پیدا اسی شور میں ہوئے ہوں گے۔

نئے زمانے کے یہ نئے شور آئے تو پُرانے وقتوں کے سُکھ چین جاتے رہے۔ وہ قدریں، وہ روایتیں، وہ شعور، وہ احساس، ان سب کو نئی تہذیب نگل گئی۔ یہ بات میں نہیں کہہ رہا۔ یہ بات لُس روز لدّاخ کے ایک بزرگ کلونگ رگزی ننگل صاحب نے کہی۔

وہ لیہ کے قدیم باشندے، سیٹزن کونسل کے صدر، صاحبِ عزّت، صاحبِ حیثیت انسان ہیں۔ لیہ میں ایک بڑے احاطے میں کشادہ مکان تھا ان کا، بہت اچھے فرنیچر، قالینوں اور سجاوٹ کے سازوسامان سے آراستہ۔

کلونگ رگزی ننگل صاحب جتنی اچھی باتیں کر رہے تھے اتنی ہی اچھی اردو بھی بول رہے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پُرانے زمانے میں جب سری نگر سے آپ کے لدّاخ تک پہنچنے میں سولہ دن لگتے تھے اور نئی تہذیب کو اٹھا کر یہاں لانے والے جدید مشینی خچّر اور ٹٹو ابھی ناپید تھے، اُس زمانے میں لدّاخ کے لوگ کیسے ہوتے تھے؟

"پُرانے زمانے میں لوگ سیدھے سادے تھے۔ ایک دوسرے سے محبت کرتے تھے۔ مذہب کے اختلاف کا ذکر تک ان کی زبان پر نہیں ہوتا تھا۔ بودھ ہے تو مندر میں جا کر اور مسلم ہے تو مسجد

میں جاکر عبادت کرتا تھا لیکن اُٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کا رواج ہر ایک کا ایک جیسا تھا۔ مگر اب ترقی کا زمانہ آگیا ہے۔ دنیا کی ہر ایک جگہ سے لوگ یہاں پہنچے ہیں۔ اور اب حالت یہ ہے کہ آج کل مذہب اختلاف کا سبب بن گیا ہے اور مذہب کو ہر ایک نے اپنی غرض کے لیے استعمال کرنا شروع کر دیا ہے۔"

میں نے پوچھا "اچھا یہ بتایئے کہ آپ کے زمانے میں تہذیب کیسی تھی، قدریں کیسی تھیں، لوگ ایک دوسرے کا کتنا خیال رکھتے تھے؟"

وہ بولے "پہلے زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ نالے میں پانی بہتا تھا تو ہر ایک مذہب کے لوگ ہمیں ہدایت کرتے تھے کہ اس پانی میں آپ ہاتھ نہ دھویئے۔ نیچے کہیں کوئی اس پانی کو پینے والا بھی ہوگا۔ تو ہمارے بچپن کے زمانے تک لوگ کسی برتن میں نالے کا پانی نکالتے تھے اور ذرا دور سوکھی زمین پر بیٹھتے تھے اور وہیں ہاتھ دھوتے تھے۔ مگر اب لوگ اسی نالے میں پیشاب کرتے ہیں، گندے کپڑے دھوتے ہیں۔ ہمارے زمانے میں ہر مذہب میں ہدایت تھی کہ راستے میں کوئی پتھر پڑا ہو اور ٹھوکر لگنے کا خطرہ ہو تو راستے کو صاف کرتے چلیں۔ اب تو راستے کو بگاڑتے جاتے ہیں۔ یہ حالت ہے۔"

میں نے پوچھا "مگر کلونگ رگزی ننگل صاحب، آپ کے دنوں میں سفر بڑا مشکل ہوتا ہوگا، فاصلے مہینوں میں طے ہوتے ہوں گے۔ مسافروں کو کھانا پینا اور رہنے کا ٹھکانا بڑی مشکل سے ملتا ہوگا۔"

جواب ملا— "جی نہیں۔ اُس زمانے کا دستور یہ تھا کہ لوگ گھوڑوں پر سفر کرتے تھے۔ دس دس پندرہ پندرہ دن سفر جاری رہتا تھا مگر دستور یہ تھا کہ شام کے وقت راہ میں جو گاؤں پڑا وہیں اُتر گئے۔ گاؤں والے نہ صرف اپنے گھروں کے دروازے کھول دیتے تھے بلکہ ہمیں بھی اور ہمارے جانوروں کو بھی پیٹ بھر کر کھلاتے تھے۔ سب کا ایک دوسرے کے ساتھ یہی سلوک تھا۔"

میں سوال پر سوال کیے جا رہا تھا۔ میں نے پوچھا کہ پُرانے وقتوں میں تجارتی مال کیسے آتا جاتا تھا، سودے کیسے طے ہوتے تھے اور لین دین کیوں کر ہوتا تھا؟"

انہوں نے جواب نہیں دیا، تصویر کھینچ دی۔ "مثال کے طور پر ہم تجارت کی غرض سے تبت کی طرف جاتے تھے تو کاروبار کے سارے سمجھوتے زبانی ہوتے تھے۔ اُس وقت لکھت پڑھت تو ہوتی نہیں تھی۔ جن تاجروں سے جان پہچان ہوتی تھی ان کے ساتھ لین دین عام بات تھی لیکن

حیران کُن بات یہ ہے کہ مثال کے طور پر کھلے میدان میں دو تاجر ملتے ہیں۔ دونوں گھوڑوں پر سوار ہیں اور ان کا آمنا سامنا ہوتا ہے۔ وہ مزاج پرسی کرتے ہیں۔ پوچھتے ہیں کہ کہاں سے آرہے ہو، کہاں جارہے ہو۔ پھر سودے کی بات ہوتی ہے۔ پھر فیصلہ ہوتا ہے کہ آئندہ سال کے لیے سودا کریں گے تو دونوں وہاں گھوڑوں سے اتر کر باتیں کرتے ہیں کہ دوسرے سال ہمیں اتنا آٹا چاہیے یا اتنی خوبانی چاہیے، اتنا کپڑا چاہیے تو ہم اتنا اون دیں گے۔ اتنا تو نسہ دے دیں گے۔ اُس وقت زبانی ایگریمنٹ ہو جاتا تھا۔ اس کے بعد ہم دونوں مل کر دوسرے سال کے لیے ایک سوکھی لکڑی اُٹھاتے۔ آدھی ایک کے ہاتھ میں، آدھی دوسرے کے ہاتھ میں۔ اب ہم اسے توڑ دیتے۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ جو اس سمجھوتے کی خلاف ورزی کرے گا یا بے ایمانی کرے گا وہ اس سوکھی لکڑی کی طرح مر جائے گا۔ اس کے بعد دونوں ساتھ بیٹھ کر چائے پیتے اور پھر اپنی اپنی منزل کی طرف لوٹ جاتے۔ یقین کیجئے کہ دوسرے سال وہ سودا پورا ہو جاتا۔ میری یادداشت میں آج تک ایک بھی ایسا واقعہ نہیں ہوا کہ یہ معاہدہ ٹوٹا ہو اور سمجھوتے پر عمل نہ ہوا ہو۔ ایسا کوئی واقعہ مجھے یاد نہیں۔"

یہ تو خیر اچھے موسموں کے قصّے ہیں۔ گرمیوں کی شفاف دھوپ میں سفر بھی ہوتے ہوں گے اور سودے بھی مگر بدن اور روح کو جما دینے والے جاڑوں میں ان لوگوں پر کیا گزرتی ہوگی؟ سنگھے دریا کی اس وادی میں لوگ قیامت کی سردی میں اپنے دن اور اپنی راتیں کیسے کاٹتے ہوں گے؟

جواب ملا —"اُس وقت کوئی کام تو ہوتا نہیں تھا۔ اُن دنوں لڑکیاں پٹّو بنانے میں لگی رہتی تھیں اور مرد اون وغیرہ بناتے تھے اور دھاگا کاتتے رہتے تھے مگر مسئلہ یہ تھا کہ سردیوں میں راتیں لمبی ہوتی تھیں اور کام کم ہوتا تھا۔ اس وقت ہر گاؤں ہر قصبے میں کہانیاں کہنے والے ہوتے تھے جنہیں پُرانے زمانے کی لمبی لمبی کہانیاں یاد تھیں۔ بس ان لوگوں کو بلا لیا جاتا تھا۔ وہ ایک ہفتے میرے پاس، دوسرے ہفتے دوسرے کے گھر، تیسرے ہفتے تیسرے گھر داستانیں سنایا کرتے تھے اور اسی طرح چلتا رہتا تھا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا "اور لوگ خاموش بیٹھے سنتے رہتے تھے؟"

جواب ملا: "نہیں۔ ہنستے تھے۔ روتے تھے۔ کبھی انہیں غصہ آتا تھا تو کبھی جوش کا اظہار کرتے تھے اور جب داستان سنانے والا گاتا تھا تو اس کے ساتھ گانا شروع کر دیتے تھے۔"

مَیں نے پوچھا ــــ" لداخی زبان میں ؟"

" جی ہاں ۔ ہماری لداخی زبان میں ۔"

رُخصت ہوتے ہوئے مَیں نے کہا" تھینک یو۔"

جواب ملا ــــ" شکریہ۔"

وعلیکم السلام

لدّاخ کے چھوٹے سے گاؤں اُپشی سے چل کر، بودھوں کی خانقاہیں دیکھتے ہوئے ہم دریائے سندھ کے کنارے کنارے لیہ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ قدم قدم پر بودھ عقیدے کی نشانیاں تھیں۔ اُن ہی کے گنبد، اُن ہی کے مینار، اُن ہی کے کلس اور اُن ہی کے جھنڈے، کہ اچانک کچھ زمین نیچی ہوئی یا شاید کچھ دریا اونچا ہوا اور دونوں برابر برابر چلنے لگے۔ دریا سے سیراب ہونے والے کھیت نظر آنے لگے اور ان کھیتوں کے درمیان ایک گاؤں نظر آیا جس میں مسجد کے گنبد دکھائی دیئے۔ مکتب کے حجرے نظر آئے اور امام باڑے کے میناروں پر حضرت عباسؑ کا علم اور پھر یرا لہراتا دکھائی دیا۔

ہم نے اپنی کار کا رُخ اسی گاؤں کی طرف موڑ دیا۔ کسان کھیتوں میں کام کر رہے تھے۔ بچے اسکول سے لوٹ رہے تھے۔ سب نے ماتھے تک ہاتھ لے جا کر سلام کیا۔ کار ایک بزرگ کے قریب سے گزری۔ میں نے بلند آواز سے السلام علیکم کہا۔ اتنی ہی بلند آواز سے جواب ملا— وعلیکم السلام۔"

یہ چھی شوت کا علاقہ تھا۔ بودھوں کی اس سرزمین میں یہ گاؤں ایک سرسبز سا جزیرہ لگا۔ میں سوچنے لگا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ کہاں سے آئے ہوں گے، یا دینِ اسلام کس راستے سے یہاں پہنچا ہوگا؛ لدّاخ کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ چودھویں صدی میں یہاں اسلام کی تبلیغ شروع ہوئی۔ نیچے وادیٔ کشمیر میں بودھ عقیدے کا خاتمہ ہو چکا تھا، ہندو عقیدہ سمٹ رہا تھا۔ ترکستان سے وہ بزرگ تشریف لا چکے تھے جنھوں نے بلبل شاہ کے نام سے شہرت پائی۔ پھر سید علی ہمدانی نے اس وادی میں قدم رکھا اور شاہ ہمدان کے نام سے لوگوں کے دلوں میں نئی شمع فروزاں کی۔ اس کی روشنی لدّاخ تک پہنچی اور راہ میں شئے کے مقام پر ہم ایک چھوٹی سی مسجد دیکھ آئے ہیں۔ کہتے ہیں کہ شاہ ہمدان نے اس میں نماز ادا کی تھی۔ لوگ اس ایک مسجد کی بات کرتے ہیں، مجھے تو اس سرزمین کے چپے چپے پر ان کے

سجدوں اور پیشانی کے نشان نظر آئے۔

ہاں تو چھی شوت کی بستی کی بات ہو رہی تھی۔ سب سے پہلے میری ملاقات ایک بزرگ قربان علی سے ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی روزی کا ذریعہ کیا ہے، آپ کیا کام کرتے ہیں؟

"ہم لوگ زمینداری کا کام کرتے ہیں۔ ہم دریا کے قریب رہتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "دریائے سندھ کا پانی آپ کے کام آتا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہم دریا سے پانی لیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "اچھا یہ بتایئے۔ آپ خود تو مسلم ہیں، اس علاقے کی باقی آبادی بھی مسلم ہے یا ملی جلی ہے؟—"

"ملی جلی ہے صاحب، ملی جلی ہے۔ یہاں سنّی بھی ہیں، اور شیعہ بھی ہیں، بودھ اور ہندو بھی ہیں، مگر شیعہ زیادہ ہیں۔"

مَیں نے پوچھا "شیعہ آبادی کے لیے مسجد ہے، امام باڑہ ہے؟"

"جی صاحب۔ یہیں چھی شوت میں مسجد بھی ہے، امام باڑہ بھی ہے۔"

پھر میری ملاقات ایک نوجوان سے ہوئی۔ نام تھا عبدالحسین اور اس نام سے وادی کا بچّہ بچّہ واقف تھا کیونکہ عبدالحسین پولو کے بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ چھی شوت کے نوجوان بہت اچھی پولو کھیلتے ہیں۔ پندرہ سال کی عمر سے ان کی تربیت شروع ہوتی ہے اور جلد ہی وہ میدان میں اتر آتے ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ گاؤں کے نوجوان کھیلتے ہی ہیں یا پڑھتے بھی ہیں؟ اس علاقے میں تعلیم ہے یا نہیں؟

"پہلے تو اتنی تعلیم نہیں تھی یہاں۔ ابھی کچھ تعلیم بڑھنا شروع ہوئی ہے۔"

مَیں نے پوچھا "یہاں اس گاؤں میں اسکول ہیں؟"

"جی۔ اسکول ہے یہاں۔ ابھی ہائی اسکول ہے۔"

مَیں نے پوچھا— "لڑکوں کا اسکول ہے یا لڑکیوں کا ہے؟"

وہ بولے "لڑکوں کا بھی ہے اور لڑکیوں کا بھی ہے۔"

مَیں نے پوچھا "کیا لڑکے لڑکیاں اکٹھا پڑھتے ہیں؟"

"جی۔ ایک ہی جگہ"

"اس پر آپ لوگوں کو کوئی اعتراض نہیں ہے؟"

وہ بہت پُراعتماد لہجے میں بولے" نہیں جناب، کوئی اعتراض نہیں ہے۔"

"نہیں؟؟"

"نہیں!!—"

میں حیران بھی ہوا، خوش بھی ہوا۔ اس وادی کی طرح اس میں رہنے والوں کے ذہن بھی کشادہ ہیں۔ جیسا ان کا دریا ہے، ویسے ہی ان کے دل بھی ہیں۔ صاف شفاف!

ہائی اسکول میں ایک سو سے زیادہ لڑکے لڑکیاں تعلیم پا رہے تھے۔ میں نے ایک اَور صاحب سے پوچھا کہ بچّوں اور نوجوانوں کے لیے دینی تعلیم کا کوئی انتظام ہے؟۔

"جی۔ یہاں دینی تعلیم کا انتظام رکھا ہے جی—"

"کس طرح؟"

"یہاں ہم نے امامیہ مشن اسکول کھولا ہے جی، وہاں دینی تعلیم ہوتی ہے۔"

"اس کے لیے استاد ہیں؟ علمائے دین ہیں؟"

"جی ہاں۔ مولانا تعلیم دیتے ہیں۔"

چھی شوت کا یہ گاؤں مجھے اچھا لگا۔ عمدہ صاف ستھرے مکان، بجلی کے تار، پختہ سڑکیں، دریا پر پُل، قرینے سے لگی ہوئی کھیتیاں اور قطار سے اُگے ہوئے درخت۔ میں نے گاؤں کے ایک بزرگ عبدالحمید صاحب سے پوچھا کہ گزرے ہوئے دنوں کے مقابلے میں یہ زمانہ کیسا ہے؟ پہلا زمانہ زیادہ اچھا تھا یا آج کا دور زیادہ آرام اور زیادہ آسائش کا ہے؟

جواب ملا—"وہ تو آج کا زمانہ اچھا ہے۔ پہلے تو کچھ اتنا اچھا نہیں تھا جناب۔"

میں نے پوچھا" پہلے کیا خرابی تھی؟"

"چیزیں مہنگی تھیں۔ ابھی بھی مہنگی ہیں مگر پہلے قحط تھا جناب۔ کھانے پینے کی کوئی چیز اچھی نہیں تھی جناب۔ آج کل کچھ اچھا ہے جناب۔"

میں نے کہا "اب تو یہاں ہوائی جہاز آنے لگے ہیں۔ سڑک بن گئی ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کے پاس پیسہ آگیا ہے۔ لوگ زیادہ خوشحال ہوگئے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے؟"

"جی ہاں۔ وہ تو اچھا ہوگیا۔ ہر ایک گاؤں میں روڈ بن گیا ہے۔ پہلے تو روڈ بھی نہیں تھا جناب۔ گاڑی واڑی کچھ نہیں تھا جناب۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے ہاں کے جو نوجوان ہیں، وہ کیا سوچتے ہیں کہ یہیں رہیں گے یا روزگار کی تلاش میں دوسرے علاقوں میں چلے جائیں گے؟"

"نہیں، ہمارے نوجوان ادھر ہی رہتے ہیں۔ وہ دوسرے علاقوں میں نہیں جاتے۔"

میں نے کہا "مگر یہ تو اسکول میں تعلیم پا رہے ہیں، کاشتکاری میں یہ تعلیم کام آئے گی؟"

پھر بہت پُراعتماد لہجے میں جواب ملا — "کام آئے گی جناب۔ تعلیم اور زمینداری ساتھ ساتھ چل سکتے ہیں جناب۔"

تو یہ تھی اُس چھوٹی سی بستی کی بات جس کا صحیح نام خدا جانے کیا ہوگا، مجھے تو وہ نام چھے گوماں سنائی دیا۔ کہتے ہیں کہ اس آبادی کا ایک حصّہ ایسا ہے جس کے پُرانے باشندے بلتستان اور پوریگ سے چل کر یہاں آئے تھے۔

یہاں لدّاخ کی اس دور دراز، بنجر، سنسان اور سرد سرزمین کی عجب خوبی یہ ہے کہ یہاں کے لوگ کہیں اور نہیں جاتے بلکہ ہر جگہ کے لوگ یہاں آتے ہیں۔ اب تو خیر اس ساری سرزمین پر فوج آباد ہے۔ سیاحوں کے لیے یہ علاقہ کھول دیا گیا ہے اس لیے روزگار خوب ہے۔ لوگوں کے مالی حالات اچھے ہیں اور کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ پورے کشمیر میں کہیں بھی بینکوں میں اتنا پیسہ جمع نہیں جتنا لدّاخ کے بینکوں میں ہے۔

ہم دریا کے کنارے کنارے چل رہے تھے کہ راستے میں دو مزدور ملے۔ ایک جنوبی ہندوستان میں کہیں مدراس کے آس پاس سے چل کر لدّاخ پہنچا تھا اور دوسرا کلکتے سے چلا اور لدّاخ پہنچ کر اُس نے دم لیا۔ یہ دونوں اپنی پیٹھ پر بوریاں اٹھائے ہوئے تھے جن میں لوہا لاٹھ اور ٹین کے ڈبے بھرے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ تم لوگ یہاں ویرانوں میں کیا کام کرتے ہو؟ وہ جو مدراس سے آیا

تھا۔ وہ بولا:

"— یہاں ہم لوگ لوہا ٹین جمع کرتے ہیں۔"

"— اور پھر اس لوہے ٹین کو جمع کر کے کیا کرتے ہیں؟ —"

"— بیچتے ہیں۔"

"— کیا اس کو کہیں لے جا کر بیچتے ہیں یا اسے خریدنے والا یہیں آتا ہے؟ —"

"— ہم اُدھر ہی لے کر جاتے ہیں۔"

"— کہاں؟ لیہہ؟"

"— نہیں۔ سری نگر لے کر جاتے ہیں۔"

"— اتنی دور؟ — مگر یہ بتائیے کہ یہ لوہا اور ٹین کہاں ملتا ہے آپ کو؟ —"

"— یہی آرمی کے پاس اور گاؤں دیہات سے مل جاتا ہے۔"

"— پھر آپ اس کو کیسے لے جاتے ہیں؟"

"— ٹرک میں —"

"— کتنے لوگ یہ اس قسم کا کام کرتے ہیں؟ —"

"— کہیں دو کی ٹولیاں، کہیں تین کی ٹولیاں۔ ایسے ہی مل کر کام کرتے ہیں۔"

"— تو آپ اگر ایک ٹرک بھر کر لے جائیں تو سری نگر میں اس کی کتنی قیمت ملتی ہوگی —"

"— مل جاتا ہے، چار پانچ ہزار مل جاتا ہے۔"

اب میں دوسرے شخص سے مخاطب ہوا — "آپ کا کیا نام ہے۔"

"شمبھو ناتھ۔"

"آپ کہاں کے رہنے والے ہیں؟ —"

"کلکتے کے۔"

"آپ کلکتے سے سیدھے لداخ آئے؟ —"

"نہیں۔ جموں میں آئے تھے پہلے۔"

"کیوں؟ —"

"ایسے ہی آ گئے تھے گھر چھوڑ کے۔ جموں میں رہتے تھے بہت دنوں سے۔ بعد میں یہاں آ کر لوہا میگنیز جمع کرنے لگے۔"

"یہاں کافی لوہا میگنیز ملتا ہے؟"

"ملتا ہے۔ تھوڑا جمع کیا ہے۔ کچھ اِدھر کارو میں ملا۔ تھوڑا اُدھر اُپشی میں۔"

اُپشی سے میں واقف تھا۔ میں نے بنگالی مزدور سے پوچھا "اُپشی کے لوگ کیسے ہیں۔ لدّاخ کے باشندے کیسے لگے ہیں آپ کو؟"

وہ بولا "لوگ اچھے ہیں ادھر کے۔ لیہ کے پورے آدمی صحیح ہیں۔"

"آپ کا دل لگتا ہے لیہ میں؟"

"دل لگتا ہے۔"

"یہاں تو اتنی کم آبادی ہے۔ یہاں تو دل گھبراتا ہوگا۔"

"نہیں، ہم لوگ تو اپشی میں بھی رہے۔ وہاں تو کوئی آدمی بھی نہیں ہے۔"

"لیکن دل لگ جاتا ہے؟"

"دل لگ جاتا ہے!"

ہاں کہنے کی بجائے سوال کے لفظوں کو جواب میں بدل دینے کا یہ انداز عجب مگر اچھا تھا۔

اب ہم آگے چلے۔ دریا بھی آگے چلا۔ پہاڑ بھی ہمراہ دوڑتے گئے۔ پتھریلے میدانوں نے بھی ساتھ نہ چھوڑا۔ میدانوں میں بنے ہوئے اِکّا دُکّا گھروندے بار بار جتاتے گئے کہ یہ اتنا ویرانہ نہیں جتنا تم سمجھ بیٹھے ہو۔ اچانک میرے میزبانوں نے کار کے اندر سے مجھے ایک چھوٹا سا گاؤں دکھایا:

"وہ دیکھئے، بلّم۔ وہاں سی شولاموں رہتی ہیں۔"

میں نے پوچھا "وہ کون ہیں؟"

جواب ملا "اب تو لدّاخ کی سب سے معروف گلوکارہ ہیں، لیکن پہلے بھکارن تھیں۔ گھر گھر جا کر گاتی تھیں اور بھیک مانگتی تھیں۔ اب تو انہیں سنگیت ناٹک اکیڈیمی کا بڑا ایوارڈ ملا ہے۔"

مَیں مچل گیا۔ مَیں نے کہا کہ بستی میں چل کر سی شولاموں سے ضرور ملیں گے۔ آخر ہم وہاں اس شان سے پہنچے کہ کھیتوں کی مٹی میں پیر دھنستے جاتے تھے اور آب پاشی کے نالوں کی کیچڑ میں جوتے پھنستے

جاتے تھے۔ ہمیں آتا دیکھ کر نہ صرف گاؤں کی پوری آبادی بلکہ سارے کتے بھی باہر نکل آئے۔

ہم سی شولاموں کے گھر پہنچے۔ پختہ، صاف ستھرا مگر چھوٹا سا گھر جس میں پلے ہوئے بڑے بڑے کتے۔ خاتون نے گھر کا سب سے اچھا کمرہ کھول کر ہمیں اس میں بٹھایا، یہ الگ بات ہے کہ گوتم بدھ ہم سے بہت پہلے اگر وہاں بیٹھ چکے تھے۔

اب سی شولاموں سے گفتگو شروع ہوئی مگر اس ڈھب سے کہ ان کی زبان لداخی تھی اور میں لداخی نہ جانتا تھا۔ آخر ہماری ایک میزبان سیرنگ انگموں مدد کو آئیں اور بات چیت شروع ہوئی جس میں بات کم اور ترجمہ زیادہ تھا۔

میں نے پوچھا "سی شولاموں۔ کیا آپ کے گھرانے میں گانے کا رواج تھا؟"

وہ بولیں "ماں، باپ اور میں، تینوں گاتے تھے۔"

"تو پہلے پہل آپ کہاں گاتی تھیں؟ کن لوگوں کو سناتی تھیں اپنا گانا؟"

"میں ہماچل پردیش میں رہتی تھی اور وہاں لوگوں کے گھروں میں جا کر گاتی تھی۔ میرے والدین بہت غریب تھے۔ اُس وقت کھانا بھی مشکل سے ملتا تھا۔"

میں نے پوچھا — "گانے والوں کی عزت ہوتی تھی؟"

جواب ملا — "میں جو گاتی تھی تو ایک طرح سے وہ بھیک مانگنا ہوا — کچھ لوگ چاول دیتے تھے، کچھ پیسہ دیتے تھے۔"

"پھر کب لوگوں کو احساس ہوا کہ آپ بہت اچھا گاتی ہیں۔ کب آپ کی شہرت ہوئی؟"

"ہماچل پردیش سے میں یہاں بلّم میں آگئی اور یہیں رہ کر علاقے کے ہر گاؤں میں جانے لگی۔ اس وقت لوگوں کو احساس ہوا کہ میرے گلے میں سُر ہے۔ لوگ دھیان سے میرا گانا سننے لگے۔ سب سے پہلے کلچرل اکیڈیمی والے مجھے لے گئے اور میں نے ایک جلسے میں اپنا گانا سنایا۔ پھر ریڈیو اسٹیشن والے پوچھتے ہوئے آئے کہ یہاں سی شولاموں نام کی کوئی خاتون ہیں جو بہت اچھا گاتی ہیں۔ وہ مجھے اپنے ساتھ لے گئے۔ یہ بات ۱۹۷۱ء کی ہے۔ لیہ کا ریڈیو اسٹیشن اسی سال کھلا تھا۔ اس طرح میں نے ریڈیو پر گانا شروع کیا۔"

میں نے کہا "سُنا ہے اس علاقے میں اونچی ذات اور نیچی ذات کا احساس بہت زیادہ ہے۔

آپ کیا محسوس کرتی ہیں؟"

اُن نے جواب کا ترجمہ یہ تھا "ہاں، احساسِ کمتری تو ہوتا ہے۔ اگرچہ گانے کی محفلوں میں خاص مقام ملتا ہے مگر ہمیں احساس رہتا ہے اپنی چھوٹی ذات کا۔"

مَیں نے پوچھا "مگر جب آپ کو بہت بڑا ایوارڈ ملا تو یہ احساس کچھ کم ہوا؟"

وہ بولیں — "ہاں ہمیں خوشی بہت ہوئی۔ کچھ عزت بڑھی، کچھ آمدنی بڑھی۔ اب تو یہ مکان بھی ہے۔ بااثر لوگوں سے واقفیت بھی ہے، شہرت بھی ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ ہمالیہ کے پچھواڑے اس ذرا سے گاؤں بلّم کو اب ان ہی کی وجہ سے شہرت ہے اور خود اپنے فن کی وجہ سے ان کی عزت ہے۔ میرے لیے انہوں نے گانوں کی ریکارڈنگ کرائی۔ مَیں نے بہت چاہا کہ وہ کچھ معاوضہ لے لیں مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔ وہ شرمندہ تھیں کہ ہماری خاطر تواضع نہ کر سکیں، پہلے سے اطلاع ہوتی تو وہ خدا جانے کیا کیا کرتیں۔ ہمیں رُخصت کرنے باہر تک آئیں اپنے بھونکتے ہوئے کتّوں کو سختی سے ڈانٹا اور کار میں بیٹھے ہوئے مہمانوں کو پیار سے الوداع کہا۔

اور میں سوچتا رہا کہ نیچی ذات کیسی ہوتی ہے، اونچی ذات کی کیا پہچان ہے؟ میں سوچتا رہا۔ ذہن نے کچھ جواب تو دیا مگر وہ پوری طرح سمجھ میں نہ آسکا۔ مجھے پتہ ہے کہ یہ باتیں آسانی سے سمجھ میں آنے والی نہیں۔ ان باتوں کو سمجھنے کے لیے محل چھوڑنا پڑتے ہیں اور جنگلوں میں آنکھیں موند کر بیٹھنا پڑتا ہے۔

لیہ کی جامع مسجد دیکھنے کے قابل ہے کیونکہ اُس نے تاریخ کے بہت سے دور دیکھے ہیں۔ مغلوں کے زمانے کا آدھا حصّہ جوں کا توں موجود ہے۔ آج کے زمانے کا آدھا حصّہ از سرِ نو بنایا گیا ہے۔ ایک طرف چھوٹی چھوٹی کھڑکیاں، تھوڑا سا اندھیرا اور نیچے جلائی جانے والی آگ سے گرم کیا ہوا فرش ہے۔ دوسری جانب بڑی بڑی روشن کھڑکیاں۔ کشادہ فرش۔ اس پر بچھے ہوئے ترکستان کے قالین ہیں۔ یہاں فرش کے سرد ہونے کا احساس نہیں ہوتا۔ یوں بھی ایمان کی حرارت دونوں طرف برابر ہے۔

وہ مئی کا مہینہ تھا۔ بادل آ گئے تھے اور سردی ہو گئی تھی۔ میں جو مسجد کے پُرانے حصّے میں داخل ہوا تو گرم فرش اتنا اچھا لگا کہ جھٹ دیوار سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ نماز میں دیر تھی، سارے نمازیوں نے حلقہ کر لیا اور گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔

"سنیئے" گفتگو کے دوران اچانک مجھے یاد آیا ــــ "مسجد کے باہر پوسٹر لگے ہوئے ہیں۔ کیا یہاں سلمان رشدی کے خلاف کچھ ہوا تھا؟ ــــ"

پتہ چلا کہ پانچ ہزار میل دور برطانیہ میں لکھی جانے والی کتاب کی تپش یہاں لداخ تک پہنچ چکی تھی۔ ایک بزرگ کہ نام جن کا حاجی غلام رسول تھا اور جو اپنے دین کی توہین کے خیال ہی سے مشتعل تھے، مجھے بتانے لگے "جی ہاں۔ سلمان رشدی نے جو کتاب لکھی ہے اس سے ہمارے مذہب کی توہین ہوئی۔ اس پر یہاں کے لوگ خفا ہوئے اور یہاں بڑی تعداد میں جمع ہو کر اپنی ناراضگی دکھائی۔"

حاجی غلام رسول کی آنکھیں کچھ زیادہ تبتی نہیں۔ ان کے خدوخال بھی تھوڑے سے چینی ہیں۔ رنگت کشمیریوں جیسی نہیں، ممکن ہے ان کے بزرگ ترکستان سے آئے ہوں یا شاید بلتستان کی کسی شہزادی کی نگرانی کے لیے پنجاب سے لائے گئے ہوں۔ اس روز مسجد کے نیم روشن کمرے میں ان کے چہرے کے نقش اور ملائم ہو گئے تھے۔

مجھے دیر تک بتاتے رہے کہ لیہ کی جامع مسجد کبھی سنسان نہیں ہوتی۔ اب نماز جمعہ کے لیے تین ہزار تک نمازی آجاتے ہیں۔ یعنی لیہ کی مسلمان آبادی سے بھی زیادہ۔ سلمان رشدی کے خلاف مظاہرے میں شرکت کے لیے بھی آس پاس کے گاؤں دیہات سے سارے مسلمان آگئے تھے۔

حاجی غلام رسول دکاندار ہیں۔ مسجد کے بالکل سامنے اُن کی کریانے کی چھوٹی سی دکان ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ عام طور پر لیہ کے مسلمانوں کی مالی حالت کیسی ہے، ان کا معیار زندگی کیسا ہے؟ کہنے لگے "گزراوقات اچھی ہے۔ لوگ کام کرنے والے ہیں۔ جیسا بھی کام ہو کر لیتے ہیں۔ پہلے تو دکاندار تھے یا زمیندار تھے مگر اب ٹرک وغیرہ لے آئے ہیں۔ ٹھیکیداری بھی کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "اور خواتین؟ ــ"

جواب ملا "وہ بھی مصروف ہیں۔ بُنائی کرتی ہیں، سلائی وغیرہ کرتی ہیں۔ ملازم بھی ہیں۔ اسکولوں میں پڑھاتی ہیں۔"

"مسلمان بچوں کی تعلیم کا کیا حال ہے؟ ــ"

"اس وقت ہمارے سارے بچے تعلیم پر ہیں۔"

میں نے وضاحت چاہی "سارے؟ ــ"

"جی ہاں۔ بغیر تعلیم کے کوئی نہیں ہے۔ اور مروّجہ تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم بھی ہے۔ شہر میں اسلامیہ اسکول بھی ہے۔"

میں نے پوچھا۔"پڑھنے لکھنے والے نوجوانوں کی مذہب سے وابستگی کا کیا حال ہے۔ آپ کے زمانے میں لڑکے دین سے کتنے قریب تھے؟"

حاجی غلام رسول کے لہجے میں شکایت کا ذرا سا بھی انداز نہیں آیا۔ کہنے لگے ــ"دین سے وابستگی اب پہلی جیسی تو نہیں ہے۔ آج کل کے نوجوان کاروبار میں لگے ہیں۔ وہ کام میں زیادہ دل لگاتے ہیں۔ مذہب سے تھوڑا دور رہنے لگے ہیں۔ روزے پورے رکھتے ہیں۔ نماز بھی پڑھتے ہیں مگر جتنا ہونا چاہیے اتنا نہیں ہے۔"

ان کے لہجے میں شکایت اب بھی نہیں تھی۔ مفاہمت تھی۔

مسجد کے گرم فرش پر میرے برابر ایک اور صاحب بیٹھے تھے۔ میں سمجھا یہ بھی دکاندار ہوں گے۔

"جی نہیں۔ میں لدّاخ سے دس کیلومیٹر باہر انڈس ہوٹل کا مالک ہوں ــ"

"ہاں ہاں۔ وہ ہوٹل تو میں نے بھی دیکھا ہے۔ مگر آپ نے شہر سے باہر ہوٹل بنانے کا فیصلہ کیوں کیا؟"

میں سمجھا تھا کہ انہیں جواب دینے میں دشواری ہوگی۔ مگر ان کے جواب نے میرے دریائے سندھ کی کہانی میں نیا باب بڑھا دیا۔ کہنے لگے ــ"دیکھیے دریائے سندھ یہاں گہرائی میں ہے مگر اس جگہ اُس کے کنارے سپاٹ ہیں۔ ہریالی ہے، پکنک کی جگہ ہے اور شہر کے برعکس پانی کی افراط ہے۔ غیر ملکی مہمان بڑے شوق سے وہاں آتے ہیں۔"

عبدالقادر صاحب اپنے کاروبار پر پوری طرح قادر تھے۔ وہ جانتے تھے کہ اس میں بھی بڑی حکمتیں چھپی ہوئی ہیں۔

میرے پوچھنے پر بتانے لگے کہ دریا کے کنارے کنارے وہ دم چوق تک جا چکے ہیں۔ یہ وہ مقام ہے جہاں دریائے سندھ تبت کو چھوڑ کر لدّاخ کے علاقے میں داخل ہوتا ہے۔

میں نے بڑے اشتیاق سے پوچھا۔"وہاں دریا کیسا ہے؟"

انہوں نے سیدھا سا جواب دے دیا۔"ایسا ہی ہے جیسا یہاں ہے۔"

میں نے پوچھا۔"کیا وہاں بھی لوگ کہتے ہیں کہ یہ دریا ہمارے کسی کام کا نہیں۔"

"جی ہاں - یہی کہتے ہیں۔ ہر جگہ دریا گہرائی میں ہے۔ اس کا پانی اُوپر نہیں آسکتا۔ صرف شے سے چھی شوت تک اس کے کنارے آباد ہیں۔ اس کے بعد یہ دریا سیدھا پاکستان چلا جاتا ہے۔"

پھر دیر تک دریا کے کنارے بسنے والوں کی باتیں ہوتی رہیں۔ زیادہ تر لوگ ان پڑھ ہیں۔ بہت سے خانہ بدوش ہیں جو گرمیوں میں اپنے مویشی لے کر اُوپر پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ مگر حکومت انہیں پڑھانے کی ٹھانے ہوئے ہیں۔ شہر میں کسی نے مجھے بتایا تھا کہ خانہ بدوش بچوں کی تعلیم کے لیے حکام نے خانہ بدوش ٹیچر مقرر کر دیئے ہیں۔ جہاں قافلے جاتے ہیں وہیں یہ استاد بھی اپنے خیمے لے جاتے ہیں۔ جہاں پڑاؤ ہوا وہیں جماعت لگ گئی۔

اِسی دَم چُوق کے ان پڑھ باشندوں کے بارے میں کسی نے مجھے بتایا کہ وہاں ایک چھوٹا سا گاؤں ہے جس میں صرف ایک ووٹر رہتا ہے۔ الیکشن کے روز اس کا ووٹ ڈلوانے کے لیے انتخابی عملہ ایک پرچی اور ایک بکس لے کر اس کے گاؤں جاتا ہے۔ پھر اسے مکھن کی بڑی سی ٹکیہ تحفے میں دی جاتی ہے۔ تب کہیں وہ اپنا ووٹ ڈالتا ہے۔ سنا ہے اب اس گاؤں میں دو ووٹر ہو گئے ہیں۔ غالباً رشماں جوان ہو گئی ہے۔

ہاں تو بات لدّاخ کے مسلمانوں کی ہو رہی تھی۔ فرش کے نیچے بھٹیوں میں سوکھی لکڑی جھونکی جا رہی تھی۔ ٹونٹیوں میں خوب گرم پانی آ رہا تھا، لوگ دیر دیر تک وضو کر رہے تھے۔ گرم گرم فرش اچھا لگ رہا تھا، نمازیوں کے سجدے طویل ہو رہے تھے۔

غلام رسول صاحب نے بتایا کہ لدّاخ کے صاحبِ حیثیت مسلمان مسجد کی دیکھ بھال کے لیے عطیے دیتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں۔ ضرورت مندوں، معذوروں اور اپاہجوں کے لیے وہ جو رقمیں دیتے ہیں وہ ہر مستحق کو چپ چپاتے پہنچا دی جاتی ہے تاکہ معاشرے میں کہیں اس کی آنکھ نہ جھکے۔

میں نے پوچھا "غریبوں کی بیٹیوں کے شادی بیاہ پر بڑا خرچ آتا ہوگا، لوگ اس میں ہاتھ بٹاتے ہیں یا نہیں؟"

غلام رسول صاحب بولے "لدّاخ میں اس کی ضرورت نہیں۔ یہاں شادی بہت سادگی سے ہوتی ہے۔ جہیز یا رقم دینے کا یہاں کوئی رواج نہیں۔ شادی شریعت کے مطابق ہوتی ہے اور پیسہ بہت کم خرچ ہوتا ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ جس طرح دریا میں بہہ کر کشتیاں نیچے تک پہنچ جاتی ہیں، اس طرح نیکیاں بھی بہا کرتیں تو کتنا اچھا ہوتا۔ بالائی خطے کے لوگ نیکی کر کے دریا میں ڈالتے، زیریں علاقوں کے لوگ اس سے فیض اٹھایا کرتے۔

میں نے پوچھا "لدّاخ کے مسلمان حج اور زیارات کے لیے بھی جاتے ہیں یا نہیں؟"

حاجی غلام رسول جھٹ بولے "جی ہاں۔ اب پہلے سے زیادہ جانے لگے ہیں۔ پہلے تو غریب تھے۔ کام کاج نہیں تھا۔ گزر اوقات مشکل تھی۔ اب آمدنی بڑھ گئی ہے، سہولتیں بڑھ گئی ہیں۔ ہوائی جہاز آنے جانے لگے ہیں لہٰذا بہت سارے لوگ حج کے لیے اور زیارتوں کے لیے جانے لگے ہیں۔"

مَیں اٹھ کر جانے لگا تو مجھے دکھانے کے لیے مسجد کا نیا حصّہ کھولا گیا۔ یہ عمارت ان لوگوں نے آمدنی بڑھنے کے بعد بنائی ہے۔ اخروٹ کی لکڑی پر کشمیر کا ایسا اچھا نقشین کام بنا ہے کہ خود کشمیر سے آنے والے نمازی حیران رہ جاتے ہیں۔

اور نمازیوں کی صفوں کے لیے بن کر لمبے لمبے قالین ترکستان سے آرہے ہیں۔ یہ قالین جیسے جیسے بنتے جاتے ہیں، آتے جاتے ہیں۔ جب پورا فرش آراستہ ہو جائے گا تو فرش کے نیچے بھٹیاں دہکانے کی ضرورت ختم ہو جائے گی۔

میں مسجد کی کشادہ سیڑھیاں اُتر کر نیچے آگیا۔ جہاں یہ سیڑھیاں ختم ہوتی ہیں، وہیں سے لیہ کا بازار شروع ہو جاتا ہے۔ مَیں جونہی باہر نکلا۔ ایک بزرگ کو دیکھا جو کسی طرح سے لداخی نہیں تھے۔ میں نے آزمانے کے لیے کہ اُردو سمجھتے ہیں یا نہیں، ان سے پوچھا "آپ کا کیا نام ہے؟"

"میرا نام صدر آخُن ہے۔"

"آپ کا مذہب کیا ہے؟"

"مسلمان ہوں۔"

"آپ لیہ کے باشندے ہیں یا کہیں اُور کے؟"

"ہم چین کا رہنے والا ہے، ترکستان چین کا۔"

"کب آئے آپ وہاں سے؟"

"سنہ انیس سو اڑتالیس میں آگیا ہوا تھا۔"

"کیوں چھوڑا وہ علاقہ۔ یہاں کیوں آئے آپ؟"

"ویسے چھوڑا نہیں ہے جناب، ادھر سے ہم تجارت کرنے کے لیے یہاں آیا ہوا تھا، تجارت۔"

"کس قسم کی تجارت کرتے تھے آپ؟"

"یہاں سے ہم لوگ لے جاتا تھا، دوائی، مرچ وغیرہ وغیرہ، جو ہندوستان میں مال ہوتا ہے وہ ادھر چین میں لے جاتا تھا۔"

"اور وہاں سے کیا لاتے تھے؟"

"نمدہ، قالین، پشم وغیرہ وغیرہ۔"

"کتنے دن کا سفر ہوتا تھا؟"

"مہینے ڈیڑھ مہینے کا راستہ تھا" پھر کچھ رک کر بولے "شاید۔"

"آپ آخری مرتبہ کب گئے تھے وہاں؟"

"آخر گیا ہی نہیں جناب۔ جو ۴۸ء میں آیا تو یہاں بیٹھ گیا ہوں۔"

"آپ کے بچے ہیں؟"

"ایک بچہ ہے جناب"

"کیا کرتا ہے وہ؟"

"وہ ٹھیکیداری کرتا ہے۔"

"اس کے مالی حالات کیسے ہیں؟"

"اچھے ہیں۔ خوش ہے وہ۔ کام اچھا چلتا ہے۔ اچھا ہے۔"

چینی بزرگ سے یہ گفتگو سرِبازار ہو رہی تھی، دیکھتے دیکھتے راہ گیروں خصوصاً نوجوانوں کا اچھا خاصا مجمع ہو گیا۔ چینی بزرگ کی باتوں پر وہ کھلکھلا رہے تھے حالانکہ سبب کوئی نہ تھا، کم سے کم میری نگاہ میں۔

میں نے صدر انجمن صاحب سے کہا، "یہ لڑکے آپ کی باتوں پر ہنس رہے ہیں۔ آپ کا کیا خیال ہے۔ یہ نئی نسل اپنے بزرگوں کا ادب احترام کرتی ہے یا نہیں۔"

"ہاں ہاں ادب کرتی ہے۔ یہ جو ہنستے ہیں یہ میرے واقف کار ہیں۔ یہ میری باتوں سے خوش ہو کر

ہنس رہے ہیں۔ اچھے بچّے ہیں۔ اچھے ہیں۔"

اب ہم آگے چلے۔ دو رویہ دکانیں دیکھتے دیکھتے ہمیں ایک سنار کی دکان نظر آئی۔ لوگوں کی خوشحالی کو اسی کسوٹی پر پرکھا جا سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں دکان میں داخل ہوا اور دکاندار سے دنیا کا وہی سب سے زیادہ روایتی سوال پوچھا "آپ کا کیا نام ہے؟"

"محمد امین۔"

میں نے کہا "سنار کا اس سے بہتر نام نہیں ہو سکتا۔"

وہ جھینپ کر مسکرائے اور آہستہ سے کچھ بولے۔ شکریہ کا صرف شین سنائی دیا۔ میں نے پوچھا "کتنے عرصے سے آپ سنار کا کام کر رہے ہیں؟"

"کوئی تیس سال سے ____"

"پہلے لوگ زیادہ زیور خریدتے تھے یا اب زیادہ خریدتے ہیں؟"

"پہلے تو سونا بہت سستا تھا جی۔ یارقند سے بہت سونا آتا تھا۔ یہاں لداخ کے جس علاقے پر چین نے قبضہ کیا ہے، وہاں بہت سونا نکلتا تھا۔ اس وقت سونا بہت سستا تھا جی۔ سو روپے تولہ سونا ملتا تھا یہاں۔ اُس وقت یہاں سے سونا انڈیا جاتا تھا جی۔ ابھی تو انڈیا سے سونا یہاں آتا ہے۔ اب سونا بہت مہنگا ہے۔ سو روپئے تولہ تھا۔ اب چار ہزار روپئے تولہ ہے۔"

مَیں نے حیران ہو کر کہا "یہاں کے لوگ تو نہیں خرید پاتے ہوں گے؟____"

جواب ملا "اب اسی طرح پیسہ بھی ہو گیا جی۔ لوگوں کے پاس پیسہ بہت آیا ہے جناب۔ پہلے تو پیسہ نہیں تھا، سونا بہت تھا، ابھی تو پیسہ آگیا ہے تو سونا مہنگا ہو گیا ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ خوش ہیں اپنے کاروبار سے؟____"

"جی جناب۔"

"کبھی یہ تو نہیں سوچا کہ کوئی دوسرا کاروبار شروع کریں۔"

"نہیں جناب ابھی تک تو نہیں سوچا۔"

"مطلب یہ کہ آپ خوش ہیں۔"

"ہاں مگر اب اتنا خوش نہیں جتنا پہلے تھا جناب۔ پہلے آدمی میں چین تھا، آرام تھا جناب خوشی

تھا جناب۔ ابھی تو آدمی میں چین نہیں ہے جناب، کوئی خوشی نہیں ہے جناب، کوئی آرام نہیں ہے جناب۔ سب دوڑتے ہیں پیسے کے پیچھے۔ پیسہ بنانا ہے، مکان بنانا ہے۔ یہ ایسے ایسے ہے جناب —"

ایسی ایسی باتیں سنتے ہوئے ہم دوبارہ بازار میں نکل آئے تو ایک اور بزرگ پر نگاہ پڑی۔ ان کی تو بزرگی بھی بزرگ ہو چکی تھی۔ کسی نے بتایا کہ شمال مشرقی پہاڑوں سے اُتر کر آئے ہیں۔ مَیں نے گفتگو کرنی چاہی تو جواب میں ان کا سپاٹ چہرہ دیکھنے کو ملا۔ میں سمجھا کہ اونچا سنتے ہوں گے۔ مجمع میں سے کسی نے کہا کہ نہایت تندرست اور توانا ہیں۔ صرف یہ کمزوری ہے کہ اُردو نہیں سمجھ سکتے۔

آخر حاجی غلام رسول میری مدد کو آئے جو شاید اس علاقے کی ساری زبانیں بول لیتے ہیں۔ وہ ہمارے مترجم بنے تو گفتگو ہوئی۔

"آپ کا کیا نام ہے؟—"

"عبدالرحمان۔"

"اور آپ کس علاقے سے آئے ہیں؟—"

"تُرتُک سے۔"

"وہاں کیسے لوگ رہتے ہیں؟—"

"وہاں کے سب لوگ مسلمان ہیں۔"

"لوگ اپنی روزی کیسے کماتے ہیں؟۔"

"محنت مزدوری کرتے ہیں۔ اب وہاں ہندوستان کی فوج آگئی ہے، اس کی وجہ سے لوگوں کو کام کاج مل جاتا ہے۔"

"آپ کے کتنے بچّے ہیں؟—"

"میرا ایک لڑکا ہے، وہ پاکستان چلا گیا ہے، اس کی ایک لڑکی یہاں لدّاخ میں ہے اور اس لڑکی کی بھی ایک لڑکی یہیں ہے۔"

"آپ کی عمر کتنی ہے؟"

بزرگ نے اپنی زبان میں لمبا سا جواب دیا، اتنا تو میں بھی سمجھ گیا کہ وہ بتارہے تھے کہ سو میں

ابھی کتنے برس باقی ہیں۔ مترجم، یعنی حاجی غلام رسول نے کچھ حساب لگایا لیکن یہاں اُن کی اُردو کی گنتی جواب دے گئی اور وہ بولے "نائنٹی سِکس"۔ اس پر وہ سارا مجمع جو ہمیں گھیرے کھڑا تھا ایک آواز بولا۔ "چھیانوے"۔

مَیں خوشی سے جھوم اُٹھا۔ یہ سوچ کر نہیں کہ بزرگ کی عمر بڑی ہے، بلکہ یہ سوچ کر اہلِ لداخ کی اُردو کی استعداد بڑھی ہے۔

سب ہنس رہے تھے۔

اور شاید سب کے ہنسنے کے اسباب جُدا تھے۔

پیالے میں موتی

جس روز میں اسکردو پہنچا اسی رات کسی نے کھانے پر مدعو کر لیا۔ ایک میں ہی کیا، بہت سے لوگ مدعو تھے۔ سیدھی لکیر کی طرح چلے جانے والے اسکردو کے بازار میں وہ ایک اچھا خاصا جدید ہوٹل تھا۔ میں اور میرے میزبان وہاں کھانے پر گئے تو گھر کی خواتین کو ساتھ لیتے گئے۔ خوشگوار ماحول تھا۔ وہ لوگ پوچھ رہے تھے کہ اسکردو کیسا لگا۔ میں بتا رہا تھا کہ توقع سے کتنا مختلف نکلا۔ خواتین بھی گفتگو میں شریک تھیں۔

اچانک ہوٹل کا دروازہ کھلا اور تین مولوی صاحبان داخل ہوئے۔ کچھ لوگ انہیں حلقہ کیے ہوئے تھے۔ آناً فاناً منظر تبدیل ہوا۔ میرے میزبان خواتین کو لے کر کسی پچھلے دروازے سے نکل گئے اور جب تک کھانا ہوتا رہا اور مولوی صاحبان ہوٹل میں موجود رہے، خواتین کو کسی عقبی کمرے میں بیٹھنا پڑا۔

ہوٹل جدید ہو چکا تھا، منظر ابھی قدیم تھا۔

یہ ہمالیہ اور قراقرم کے درمیان، دریائے سندھ کے کنارے شہر اسکردو ہے۔ اس علاقے کی ساری بستیاں وادیوں میں، پہاڑوں کے درمیان بھنچی ہوئی ہیں البتہ اسکردو یوں آباد ہے جیسے کشادہ پیالے کی تہ میں موتی پڑا ہو۔ سطح سمندر سے ساڑھے سات ہزار فٹ اوپر، کوئی بیس میل لمبا اور آٹھ میل چوڑا یہ بیضوی شکل کا پیالہ ہے جس کے گرد سترہ سترہ ہزار فٹ اونچے پہاڑ فصیلیں بن کر کھڑے ہیں، اور اس پیالے کے پیندے میں شفاف روپہلی ریت بچھی ہے جن کے درمیان دریائے سندھ دھیمے دھیمے بل کھاتا چلا جاتا ہے۔ کہتے ہیں کہ سردیوں میں اس کا پانی سبز اور گرمیوں میں یوں سُرمئی ہو جاتا ہے جیسے پرانی چاندی۔ اور دونوں کناروں پر دور دور تک پھیلی ہوئی ریت جس پر ہوا کے ہاتھوں تراشی ہوئی لہریں جن پر نہ کسی کے قدموں کے نشان، نہ کسی کے پیروں کی چاپ۔

خدا جانے کیوں ریت کا ایسا کورا پنڈا دیکھ کر جی چاہا کہ اس پر دور تک اور دیر تک ننگے پاؤں چلیں یہاں تک کہ دریا کی تہ سے بلند ہونے والی وہ بڑی سی اونچی پہاڑی آ جائے جس کے اوپر بہت پرانے قلعے کے کھنڈر آٹھ نو سو سال سے نیچے وادی کا نظارہ کر رہے ہیں۔

وہ قدامت کا رنگ اترتا دیکھ رہے ہیں، وہ نئے علم اور نئے ہنر کے رنگ بکھرتے دیکھ رہے ہیں۔ سڑکیں کھلتی دیکھ رہے ہیں، جدید ہوائی جہاز اترتے دیکھ رہے ہیں اور دریا کے پچھواڑے ہیلی پیڈ سے فوجی ہیلی کاپٹروں کو اڑان بھرتے دیکھ رہے ہیں۔ سینے پر قرآن باندھ کر نوجوانوں کو سیاچن گلیشیر کے محاذ پر جاتے دیکھ رہے ہیں اور پھر لوٹ کر آنے والے ہیلی کاپٹروں سے اُترنے والوں کا اترنا دیکھ کر خون کے آنسو رو رہے ہیں۔

دریائے سندھ کے ساتھ ساتھ چلتا ہوا میں بلتستان کی سرزمین پر آ گیا ہوں اور اب جہاں جہاں یہ دریا جائے گا وہیں میں بھی چلوں گا۔ پہاڑوں کی جھولی کی تہ میں پڑے ہوئے یہ جو شہر قصبے اور گاؤں اب نئے دور کی روشنی میں پہلی بار آنکھ کھول کر اُٹھ بیٹھے ہیں، ان کا حال کہوں گا۔ آپ میرے ساتھ ساتھ چلیے اور میری روداد سنتے جائیے، کچھ میری اور کچھ اُن کی زبانی جن سے یہ زمینیں آباد اور جن سے یہ وادیاں سرشار ہیں، جنہوں نے برفانی ہواؤں میں جینا سیکھا ہے اور باقی دنیا سے کٹ کر رہنے کا ہنر جانا ہے۔

بلتستان کی سرزمینوں میں، کہیں سنگلاخ پہاڑوں میں، کہیں خوبانیوں کے باغوں میں ان ہی لوگوں کے ہونے سے زندگی ہے، ان ہی کی زندگی سے دشواریوں اور پریشانیوں نے ہار مانی ہے۔ ان کی صدیاں یوں گزریں کہ نہ تن پر اچھا لباس، نہ کھانے کو اچھا کھانا، نہ پیروں میں جوتے، نہ تعلیم، نہ علاج۔ مگر ایسی سختیوں میں بھی یہی لوگ تھے جو خدا کا نام لے کر گھوڑے کی پشت پر بیٹھتے تھے اور پولو کے مقابلے دیکھنے والے یہ سخت جان لوگ داد و تحسین کے ایسے نعرے بلند کرتے کہ کھلاڑیوں کے سر پہاڑوں کی چوٹیوں سے بھی زیادہ بلند ہو جایا کرتے تھے۔

میں دیکھنا یہ چاہتا تھا کہ یہ لوگ خود اپنے معاشرے، اپنے رسم و رواج، اپنی روایات، اپنی تاریخ اور ثقافت کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں اور سیلاب کی طرح آنے والی تبدیلیوں کو کس نگاہ سے دیکھتے ہیں۔

میری ملاقات وادی شغر کے راجا محمد علی صبا صاحب سے ہوئی۔ اس علاقے کی چھوٹی چھوٹی ریاستوں کے راجا کبھی کے ختم ہوئے مگر ان کے خاندانوں کی اب بھی بڑی عزت اور وقعت ہے۔ راجا محمد علی صبا صاحب نہایت تعلیم یافتہ، مہذب، اچھے شاعر اور پولو کے بہت عمدہ کھلاڑی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ ایک راجا کی نگاہ سے آپ کیا دیکھتے ہیں کہ وقت کے ساتھ ان وادیوں میں کیسی تبدیلی آئی ہے۔

وہ بولے "وقت کے ساتھ تو بہت تبدیلی آئی ہے۔ میری عمر اس وقت تقریباً ۴۶ سال ہے، جہاں تک میں اپنے بچپن کو یاد کرتا ہوں تو میں خود بھی یہ محسوس کرتا ہوں کہ تبدیلی بہت تیزی سے آ رہی ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ یہاں اسکردو سے گلگت تک پہنچنے میں ایک مہینہ لگتا تھا۔ گھوڑے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، بعض اوقات پیدل بھی نہیں جا سکتے تھے۔ اب اس کے مقابلے میں یہاں آپ بھی دیکھ رہے ہیں کہ بوئنگ جہاز اتر رہے ہیں۔ اور پھر یہ ٹرک روڈ بن گیا ہے۔ کراچی سے ہمارے ہاں تک ڈائرکٹ کا نوائے آتی ہے۔ رسل و رسائل کی آسانی ہوئی ہے جس کی وجہ سے غربت کے باوجود ہمارے لوگ پڑھنے کے لیے دور دور تک جا چکے ہیں۔ اس کے علاوہ معاشی اور اقتصادی حالت بھی بہت تیزی سے بدلی ہے۔ اب انشاء اللہ ہمارا علاقہ بہت ترقی کرے گا۔"

میں نے پوچھا — "راجا صاحب، یہ بتائیے کہ رہن سہن میں، کھانے پینے میں، پہننے اوڑھنے میں بھی تبدیلی آئی ہے؟ —"

جواب ملا — "بہت تبدیلی آئی ہے حالانکہ ہم بھی سمجھتے ہیں اور ہمارے حکیم ڈاکٹر بھی کہتے ہیں کہ ہمارے پرانے کھانے زیادہ مفید تھے مگر نئی تبدیلی کی وجہ سے لوگوں نے اپنی روایتی اور خالص غذا چھوڑ دی ہے۔ اب بناسپتی کا زمانہ شروع ہو گیا ہے جس کی وجہ سے صحت پر اچھا اثر نہیں پڑ رہا ہے۔ باقی رہن سہن کا طریقہ پرانے ماحول کے مطابق ہے مگر اب لوگ زیادہ صفائی پسند ہو گئے ہیں۔ اب زیادہ ترقی پسند ہو گئے ہیں۔ یہ بڑی اچھی تبدیلی آئی ہے۔"

میں نے پوچھا کہ جب ترقی پسندی کی بات آتی ہے تو یہ بتائیے کہ تعلیم کے معاملے میں عام لوگوں کا کیا رجحان ہے؟

"اب تو بہت لوگ تعلیم کی طرف مائل ہو رہے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ لڑکیوں کو پڑھانا شرعی طور پر

ناجائز سمجھتے تھے لیکن آج ہر گاؤں ہر علاقے میں لڑکیوں کے اسکول کھولنے کا مطالبہ کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ لڑکیوں کے کالج بھی کھولے جائیں۔ خود لڑکیاں شوق سے تعلیم پا رہی ہیں اور سماجی بھلائی کے کاموں میں وہ بڑھ چڑھ کر حصّہ لیتی ہیں۔ تعلیم تو بہت ہے بلکہ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ ان کے بچّے کسی طرح تیزی سے تعلیم پالیں اور بہت آگے تک پڑھیں۔"

جس وقت وادیٔ شِغر کے راجا صاحب سے یہ باتیں ہو رہی تھیں، ان کے پہلو میں بلتستان کے ایک بزرگ وزیر غلام مہدی صاحب بھی بیٹھے تھے۔ اس علاقے میں ان جیسے اہلِ علم کم ہوں گے، حالات کا ایسا مشاہدہ شاید ہی کسی نے کیا ہوگا، تاریخ پر ایسی نگاہ کسی کی نہ ہوگی، ایسی باتیں سن کر جی نہ بھرے، نیّت سیر نہ ہو۔ اُس روز بلتی روایات کے زوال کا دکھ بیان کر رہے تھے، تہذیب و تمدن کا نوحہ پڑھ رہے تھے۔ راجا صاحب کے برابر میں بیٹھنے کو بڑا اعزاز، بڑی سعادت سمجھ رہے تھے۔ کہنے لگے:

"ہماری تہذیب اور تمدّن جا رہا ہے۔ ہماری اب وہ پہلی جیسی تہذیب نہیں رہی۔ وہ تہذیب رہ جاتی تو میں راجا صاحب کے برابر اس بے تکلفی سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ ۱۸۴۰ء میں راجاؤں کا اختیار چھین لیا گیا مگر ہمارے دلوں میں ان کی عزت برقرار ہے کیونکہ ہماری تاریخ کا تعلق ان سے ہے، ہماری تہذیب اور تمدّن کا تعلق ان سے ہے۔ ہم ان ہی کو سمجھتے ہیں۔ ہم ہری سنگھ کو کیا سمجھیں۔ مگر ۷۲ء کے بعد ریاستوں اور راجاؤں کا تصور بالکل ہی ختم ہو گیا۔ اب نوجوانوں کے دل میں ان کا وہ احترام نہیں مگر ہم ان ہی کو اپنی تاریخ، روایت، ثقافت اور تہذیب و تمدّن کا محافظ سمجھتے ہیں ان کے کمزور ہونے کی وجہ سے آج آپ کو بلتی ثقافت نظر نہیں آ رہی ہے۔ آپ کے یہ چیئرمین وائس چیئرمین تو ثقافت کو برقرار نہیں رکھ سکتے۔ ٹریجڈی یہ ہے۔

ہاں، معاشی حالت میں ہم بہت بہتر ہیں۔ نہ پوچھیے پہلے ہم کتنے غریب تھے۔ یہاں سے غلام سری نگر لے جائے جاتے تھے، وہ بھی پیدل۔ یہاں ملازمتیں نہیں تھیں، صرف چالیس پٹواری ہوتے تھے۔ مزدوری کے لیے لوگ شملہ جایا کرتے تھے۔ یہاں ظلم و ستم کی انتہا تھی۔ مثلاً ایک نائب تحصیل دار گھوڑے پر بیٹھ کر خپلو جاتا تھا تو راستے میں پڑنے والے دیہات کے باشندوں کو اس کا مال اسباب ڈھونا پڑتا تھا۔ گاؤں والوں کو باری باری بوجھ اٹھانا پڑتا تھا۔ یہ لوگ دُہرے ہو جاتے تھے اور اس

حالت میں تیس تیس میل تک جاتے تھے۔ اس بیگار میں ہم لوگ پس گئے تھے۔ تو اب وہ نہیں ہے۔ اب تو ہر گھر میں ریڈیو ہے۔ اکثر گھروں میں ٹیلی فون ہے۔ ہر گھر میں قالین ہے، بجلی ہے اور پتہ نہیں کیا کیا ہے۔" وزیر غلام مہدی صاحب بولے جا رہے تھے۔

"معاشی طور پر ہم بہت بہتر ہیں اور اگر ہم نہ مانیں تو میں علی الاعلان کہتا ہوں کہ بڑے احسان فراموش ہیں۔ تہذیب اور ثقافت گئی مگر جہاں تک اقتصادی حالت ہے، ہم بہت آگے ہیں، بلکہ نیچے کے جو دیہات والے ہیں ان سے ہم بہتر ہیں۔ ان کو ہم نے دیکھا ہے، مثلاً بشام میں بجلی نہیں ہے۔ ہمارے ہر گاؤں میں بجلی ہے۔ پائپ لائن بچھ رہی ہے۔ یہ ماننا پڑے گا۔ تہذیب جانے کا افسوس ہے، وہ علیحدہ چیز ہے۔"

اس ایک طویل گفتگو میں وزیر غلام مہدی صاحب کے چہرے پر کبھی یاس کے رنگ آئے کبھی آس کے، کبھی جھک گئے، مرجھا گئے۔ کبھی سینہ تن گیا اور کھل اُٹھے۔

اب میں نئی نسل کی بات سننا چاہتا تھا۔ اس نسل کی رائے جاننا چاہتا تھا جس کے بارے میں کہتے ہیں کہ اس کے دل میں تہذیب و تمدن کے امینوں کا احترام نہیں رہا۔ میری ملاقات بلتستان کی نرگس وزیر سے ہوئی۔ خوش شکل، خوش سلیقہ، مہذب، تعلیم یافتہ اور اپنی رائے سے خود اچھی طرح آگاہ۔ میں اس روز نرگس وزیر سے پوچھ رہا تھا کہ باقی دنیا سے الگ تھلگ، تعلیم سے محروم، تہذیب سے کٹا ہوا اپنا یہ علاقہ آپ کو کیسا لگتا ہے؟

نرگس وزیر کو اپنا جواب سوچنا نہیں پڑا — "ہمیں اپنا علاقہ بہت عزیز ہے۔ ہم یہ بتاتے ہوئے فخر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارا تعلق اسکردو، بلتستان سے ہے۔ پہلے یہاں موجودہ نظام نہیں تھا۔ پہلے بڑے بڑے راجا حکومت کرتے تھے مثلاً راجا خپلو، راجا اسکردو، راجا کھرمنگ، راجا شِغر۔ یہ لوگ اتنے بہادر ہوتے تھے کہ خود جنگ کرتے تھے اور اپنے علاقے کو خود دشمن سے آزاد کراتے تھے۔ اگر آپ بلتستان کی تاریخ اٹھا کر دیکھیں تو اس میں ایسے ایسے بہادر لوگ گزرے ہیں کہ ان کے نام سے یہ خطہ آج بھی روشن ہے اور ان ہی کی وجہ سے ہمیں اپنے بلتی کہلانے پر فخر ہے اور ہم اپنے علاقے سے بہت پیار کرتے ہیں۔"

جیسی گفتگو میں سننا چاہتا تھا ویسی گفتگو کے لیے میں نے بحث چھیڑ دی اور نرگس وزیر سے کہا کہ

آپ کے علاقے میں تو تعلیم کی کمی ہے، لوگ پُرانی روایتوں سے چمٹے ہوئے ہیں۔ جدید سہولتوں سے بھاگتے ہیں، دیہات میں دوا علاج نہیں کرتے، عورتوں کو گھروں سے نکلنے نہیں دیتے۔ کئی کئی شادیاں کرتے ہیں۔ لڑکیوں کو پڑھنے نہیں دیتے، پھر بھی آپ کو اس علاقے سے پیار ہے؟

وہ بولیں "جی ہاں۔ ہر قسم کے مسائل ہر جگہ ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بہت پہلے تعلیم کو اچھا نہیں سمجھتے تھے کیونکہ ہمارے مولوی صاحبان کہتے تھے کہ عورتوں کو تعلیم دینا بُری بات ہے۔ مگر اب یہ مولوی صاحبان ایران اور سعودی عرب جاتے ہیں، وہاں خود بھی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور ایک خلقت کو تعلیم حاصل کرتے دیکھتے ہیں۔ اب وہ معاملات کو بہتر طور پر سمجھنے لگے ہیں۔ اب تو خدا کا شکر ہے کہ یہاں کوئی ایسا گھر نہیں، خصوصاً علماء کا کوئی ایسا گھر نہیں جس کی بیٹیاں ہمارے اسکولوں میں پڑھنے نہ آتی ہوں۔"

نرگس وزیر کی باتیں سُن کر دل خوش ہوا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ خود آپ کی تعلیم کی کیا کیفیت ہے۔ آپ نے کتنی تعلیم پائی ہے؟ آپ تعلیم دینے میں بھی حصہ لیتی ہیں؟

نرگس وزیر نے کہا "جی ہاں۔ ہم نے جب میٹرک پاس کی تو ہمارے انکل نے وقار النساء کالج راولپنڈی میں ہمیں داخلہ دلایا۔ ہم اپنی ہیڈ مسٹریس سے خدا حافظ کہنے اپنے اسکول گئے ہم انہیں بتانا چاہتے تھے کہ ہم اعلیٰ تعلیم پانے کالج جا رہے ہیں تو انہوں نے ہم سے کہا کہ اگر یہاں کی لڑکیاں پڑھ لکھ کر مزید تعلیم کے لیے یہاں سے چلی جائیں گی تو یہاں کی بچیوں کو پرائمری کا سبق کون پڑھائے گا۔ اُس وقت پنجاب کے لوگ یہاں نہیں آتے تھے کیونکہ یہاں زندگی دشوار تھی۔ ہمیں اپنی ہیڈ مسٹریس کی بات بہت اچھی لگی۔ وہ خود یہاں کی مقامی باشندہ نہیں تھیں۔ ہمیں احساس ہوا کہ انہیں اتنا زیادہ خیال ہے تو ہمیں اپنی ذمہ داری سنبھالنی چاہیے۔ ہم نے گھر آ کر اپنے انکل سے کہا کہ اب ہم مزید نہیں پڑھیں گے۔ ہم نے میٹرک کر لیا ہے، اب ہم علاقے کے بچّوں کو پڑھائیں گے۔ لہٰذا ہم نے اپنی تعلیم چھوڑ دی اور یہاں ٹیچنگ شروع کی۔ البتہ ساتھ ساتھ ہم نے پرائیویٹ ایف اے کا امتحان دیا۔ اب میں ٹیچر بھی ہوں اور اسٹوڈنٹ بھی۔ خود بھی پڑھتی ہوں، اوروں کو بھی پڑھاتی ہوں۔"

علم کی یہ حکایت نرگس وزیر ہی کی باتوں پر ختم نہیں ہوئی بلکہ اسے ان کی ہونہار بہن فرزانہ وزیر نے آگے بڑھایا۔ وہ اب تک چپ بیٹھی ہماری باتیں سُن رہی تھیں۔ مجھے اندازہ نہ تھا کہ وہ بھی بلتستان

کے بچوں کو پڑھاتی ہیں اور تعلیم میں بے حد دلچسپی لیتی ہیں۔ میں نے فرزانہ وزیر سے پوچھا کہ آپ کے اسکول میں کتنے طالب علم ہیں؟ وہ بولیں:

"اب تو بہت ہیں۔ اب تو طالب علم اتنے زیادہ ہیں کہ استاد کم پڑ گئے ہیں مگر شروع میں، جب میں خود پڑھتی تھی اُس وقت اتنے طالب علم نہیں تھے کیونکہ ان دنوں لوگ اپنے بچوں کو نہیں پڑھاتے تھے۔ مگر اب جب میں خود ٹیچر ہوں تو دیکھ رہی ہوں کہ خصوصاً اس سال اسکول میں بہت زیادہ طالب علم آئے ہیں اور ٹیچرز کی قلت ہے۔ اب ایک ایک سیکشن میں ساٹھ ساٹھ لڑکیاں ہیں۔ اب غریب سے غریب لوگ بھی ہر حال میں اپنے بچوں کو پڑھانے لگے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ کیا والدین اپنے بچوں کو اسکول بھیج کر بری الذمہ ہو جاتے ہیں یا بچوں کی تعلیم سے دلچسپی لیتے ہیں؟

"بعض والدین لیتے ہیں۔ جو خود پڑھے لکھے ہیں وہ اپنے بچوں کی تعلیم پر نگاہ رکھتے ہیں، بچوں کی صفائی اور ان کی یونیفارم وغیرہ کا خیال رکھتے ہیں۔ مہینے کے آخر میں آ کر ٹیچر سے پوچھتے ہیں کہ ہمارے بچے کلاس میں کیسے چل رہے ہیں۔ البتہ بعض والدین ہیں جو بچوں کی بالکل خبر نہیں لیتے۔ انہیں اسکول بھیج دیا اور ختم۔ اب کوئی واسطہ نہیں۔ کچھ بچے گندے بھی آتے ہیں۔ بعض طالب علم ایسے بھی ہیں جن کے والدین بہت غریب ہوتے ہیں۔ وہ بچوں کی فیس بھی نہیں دے سکتے ہیں۔ میری اپنی کلاس میں پندرہ سولہ طالبعلم ایسے ہیں جن کے والدین فیس نہیں دے سکتے۔ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ فیس لاؤ تو دوسرے دن بچے کہتے ہیں کہ اَبّا کے پاس پیسے نہیں ہیں۔ پھر میں ان کی فیس دیتی ہوں۔ فیس صرف ایک روپیہ ہے۔ ہر مہینے پندرہ بیس بچوں کی فیس ادا کرنا کوئی ایسا بڑا بوجھ نہیں۔ یہ بچے پڑھ لکھ جائیں گے تو پھر آگے چل کر ان کی اولادوں کو مشکل نہیں ہوگی۔"

میں نے فرزانہ وزیر سے پوچھا کہ جن گھرانوں میں تعلیم کی روایت ہی نہ ہو ان کے بچوں کو پہلے پہل آنے میں بڑی دشواری ہوتی ہوگی۔

انہوں نے بہت دلچسپ بات بتائی "جب میں نرسری کے بچوں کو پڑھاتی تھی کلاس میں بچوں سے زیادہ ان کے والدین آتے تھے، ہوتا یہ تھا کہ جب میں اسکول جاتی تھی تو بچے رو رہے ہوتے تھے۔ ان کا بُرا حال ہوتا تھا، کہتے تھے کہ ہم نہیں پڑھیں گے۔ والدین انہیں مناتے تھے۔ بہلاتے اور پھسلاتے

تھے۔ آپ دیکھتے تو حیران رہ جاتے۔ بالکل ماتم کا منظر ہوتا تھا۔ کوئی ادھر رو رہا ہے، کوئی ادھر مچل رہا ہے۔ میں ان کے لیے ٹافیاں لے کر جاتی تھی۔ ان کے ساتھ کھیلتی تھی۔ بڑی مشکل ہوتی تھی۔ والدین مجھ سے کہتے تھے کہ خدا کے لیے انہیں پڑھا دیجئے۔ ایک دو مہینے بعد یہ بچے سنبھل جاتے تھے۔"

اسی روز میری ملاقات اسکردو کی ایک نوجوان طالبہ رخسانہ احمد سے ہوئی۔ نویں جماعت میں پڑھتی ہیں۔ بہت ذہین ہیں اور آگے بڑھنے کی لگن میں مسلسل محنت کرتی ہیں۔ بلتستان میں جہاں مذہب کا اثر گہرا ہے، رخسانہ احمد گھر سے نکل کر ریڈیو اسٹیشن جاتی ہیں اور ریڈیو پروگراموں میں بھی حصّہ لیتی ہیں۔ میں نے رخسانہ سے پوچھا کہ آپ کے اسکول میں کیسے گھروں کی لڑکیاں آتی ہیں اور کیسے گھروں کی لڑکیاں نہیں آتیں۔ ان کا جواب کچھ یوں تھا،

"ہر قسم کی لڑکیاں آتی ہیں۔ یوں سمجھ لیجئے کہ گاؤں دیہات کے جن گھرانوں میں آج تک کسی نے تعلیم نہیں پائی ان گھروں کی لڑکیاں بھی نئی روشنی اسکولوں میں تعلیم پا رہی ہیں۔ یہ ضرور ہے کہ یہ لڑکیاں پرائمری تعلیم سے آگے نہیں بڑھ سکتیں کیونکہ نئی روشنی میں پرائمری سے زیادہ تعلیم نہیں ہے۔ مگر جو کچھ ہے غنیمت ہے۔"

میں نے پوچھا "کچھ فرق آیا ہے ذہنوں میں؟"

وہ بولیں "آیا ہے — آپ باہر نکل کر لوگوں سے باتیں کریں گے تو خود دیکھیں گے۔ تھوڑا سا سہی، مگر فرق آیا ہے۔"

میں دریائے سندھ کے کنارے سفر کر رہا تھا۔ راستے میں ایک نوجوان میرے ہمراہ ہولیا۔ ایک مقام پر وہ کہنے لگا — "یہ وہ جگہ ہے جہاں ایک جنّ اور اژدہے کی لڑائی ہوئی تھی۔"

میں چونکا "جنّ اور اژدہے کی لڑائی؟—"

وہ بولا — "جی ہاں۔"

میں نے پوچھا "کون کہتا ہے؟"

کہنے لگا — "ہمارے بزرگ —"

اور اس کے بعد وہ دکھانے لگا: "وہ دیکھئے صاحب۔ پہاڑ کے اوپر جو چٹان کھڑی ہے وہ جن تھا۔ اب وہ پتھر بن گیا ہے۔ اور وہ دیکھئے۔ دریا کی دوسری طرف پہاڑ میں جو بل کھاتا سیاہ پتھر نظر آ رہا ہے، وہ اژدہا تھا۔ جن نے اُسے اُٹھا کر یہاں پھینکا تھا۔ اژدہا پہاڑ میں پیوست ہو گیا اور وہیں پتھر بن گیا۔ دیکھئے صاحب، دونوں موجود ہیں۔"

مَیں نے دیکھا۔ وہاں اوپر چٹان کھڑی تھی۔ یہاں نیچے تہ بہ تہ چٹانوں میں سیاہی مائل پتھر کی آڑی ترچھی تہ نظر آ رہی تھی۔

مَیں نوجوان سے مخاطب ہوا: "سنو، کیا تمہیں یقین ہے کہ یہاں واقعی جن اور اژدہے کی لڑائی ہوئی ہوگی اور اوپر جو چٹان ہے وہ جن تھا اور نیچے کالا پتھر ہے وہ اژدہا تھا؟ تمہیں یقین ہے؟"

وہ بولا: "بڑے بوڑھے کہا کرتے ہیں ـــــ مگر یقین نہیں ہے۔"

اس مظلوم اور پسماندہ علاقے میں علم کے آجانے کی یہ پہلی علامت تھی۔ ذہن کے تاریک گوشوں میں نئی روشنی کی کرنیں پہنچنے لگی تھیں۔

مَیں بلتستان کے علاقے میں پہنچا تو جگہ جگہ تختیاں لگی نظر آئیں: نئی روشنی اسکول ـــــ نئی روشنی اسکول ـــــ

مَیں حیران رہ گیا کہ دور دراز گاؤں میں یہ اسکول کس نے کھولے ہیں۔ ان کونوں کھدروں میں تعلیم کون پہنچا رہا ہے۔ غریبوں کو علم کی یہ دولت دینے کا بیڑا کس نے اٹھایا ہے۔ کس حاکم کے جی میں یہ نیکی آئی ہے۔ ان تاریک بستیوں میں نور کون بھر رہا ہے۔

مجھے جواب سے غرض نہ تھی، اس روز میرے سوال مجھے خوش کر رہے تھے۔

خوش قسمتی سے اسکردو میں میری ملاقات نئی روشنی اسکولوں کے ڈپٹی ڈائریکٹر یوسف حسین آبادی صاحب سے ہوئی۔ چہرے بشرے سے ذہین اور متین۔ اس علاقے کی تاریخ کے محقق اور مصنف اور یوسف کے نام کی مناسبت سے حسین اور جمیل۔

میں نے کہا کہ یوسف حسین آبادی صاحب، مجھے بتائیے کہ اس علاقے میں تعلیم کا پہلے کیا حال تھا۔ کتنے لوگ پڑھے لکھے تھے، کتنے اسکول تھے اور علم کتنا اشتیاق تھا؟

ان کا جواب تیار تھا، کہنے لگے :" ہمیں ۱۹۴۸ء میں آزادی نصیب ہوئی۔ اس وقت اس علاقے میں تقریباً دو درجن اسکول تھے اور ہر اسکول میں طالب علموں کی تعداد اوسطاً دو سو سے اوپر نہیں تھی۔ کچھ صاحبِ حیثیت خاندان تھے جن کا تعلق راجاؤں اور وزیروں سے تھا، انہوں نے اپنے بچوں کو اعلیٰ تعلیم کے لیے سری نگر اور علی گڑھ بھیجا۔ تو ۱۹۴۸ء میں یہاں ایک لاگریجویٹ، چار گریجویٹ، چھ انٹر پاس اور کچھ میٹرک پاس تھے اور بس!"

میں نے یوسف صاحب سے پوچھا کہ اب بتایئے، اب بلتستان میں تعلیم کا کیا حال ہے؟—
جواب ملا:" آج حال یہ ہے کہ یہاں پر ۳۵ سے زیادہ مڈل اسکول، دو سو کے لگ بھگ پرائمری اسکول، چھ ہائی سکول، ایک لڑکیوں کا ہائی اسکول اور ایک ڈگری کالج ہے۔ اب طالب علموں کی تعداد سولہ ہزار سے زیادہ ہے مگر اس وقت بلتستان میں پچاس ہزار بچے ہیں جن کی عمریں پانچ اور ۱۴ سال کے درمیان ہیں۔ اسکولوں میں سولہ ہزار ہیں۔ باقی ۳۴ ہزار بچے اسکولوں سے باہر ہیں اور اب تکلیف دہ سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے۔ آپ ۳۴ ہزار بچوں کو ان پڑھ ہی رہنے دیں گے یا ان کے لیے آپ اسکول کھولیں گے۔ اسکول کھولیں گے تو پاکستان کی حکومت نے اس کے لیے جو طریقہ کار مقرر کیا ہے اس کے تحت آپ پہلے پی سی ون بنائیں گے۔ پھر وہ کونسلوں میں پیش ہوتے رہیں گے۔ پھر وہاں سے منظوری آئے گی۔ اس کے بعد اے جی پی میں فنڈ آئے گا۔ اس کے بعد ورک آرڈر ہوگا، سائٹ سیلکشن ہوگا۔ یہ ایسی ضابطے کی کارروائی ہے کہ ایک اسکول تعمیر ہوتے ہوئے ایک نسل بڑی ہوجاتی ہے اور ان پڑھ رہ جاتی ہے۔"

یہ تو خیر آئندہ بننے والے اسکولوں کی بات ہے، میں ان موجودہ اسکولوں کے بارے میں جاننا چاہتا تھا جن پر گاؤں گاؤں نئی روشنی کی تختیاں لگی تھیں۔ میں نے یوسف حسین آبادی صاحب سے پوچھا کہ ان اسکولوں کا نظام کس طرح چلتا ہے؟

میرے سوال میں اشتیاق تھا، ان کے جواب میں بیزاری۔ کہنے لگے۔

" نئی روشنی کے نام سے حکومت نے دو مرحلوں والے منصوبے بنائے تھے۔ ایک منصوبہ یہ تھا کہ جو ۱۴ سال تک کے اَن پڑھ بچے ہیں ان کو اسکولوں میں لایا جائے۔ دوسرا غیر رسمی تعلیمی نظام کا منصوبہ تھا جس کے تحت کم سے کم خرچ پر تعلیم کو ہر جگہ پھیلانا طے پایا تھا۔ یہ دوسرا منصوبہ تو خیر شروع

ہی نہ ہوسکا۔ پہلا منصوبہ چل نکلا تھا۔ تعلیم گاؤں گاؤں پھیلنے لگی تھی۔ گھر گھر بچے پڑھنے لگے تھے نیچے کے علاقوں کا حال نیچے والے جانیں، یہاں بلتستان میں نئی روشنی کا سلسلہ چل نکلا تھا مگر اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ اب جو تبدیلیاں آئی ہیں ان کے نتیجے میں یہ نئی روشنی کا نظام ۳۰ جون سے بند ہو رہا ہے —"

میں سمجھا وہ مذاق کر رہے ہیں مگر ان کا ایک ایک حرف سچ نکلا۔ ۳۰ جون کو نئی روشنی کا منصوبہ اس کے تابوت میں لٹا کر میخیں ٹھونک دی گئیں۔ ایک اچھا کام ختم کر دیا گیا۔ دنیا میں یوں نہیں ہوتا مگر بلتستان میں ہوا۔ ترقی کا راستہ چھوڑ کر پسپائی اختیار کر لی گئی۔ نئی روشنی کو خود اپنے ہی ہاتھوں گُل کر دیا گیا۔ صبح تڑکے مدرسوں کی جانب رواں دواں بچوں کے مقدر میں پھر وہی پُرانی تاریکی لکھ دی گئی۔

جگہ جگہ لگی تختیوں کو دیکھ کر جو آنکھ شاد ہوئی تھی اُس آنکھ سے ایک آنسو ٹپکا — اور شاید لہو کا آنسو!

گُل خاتون کا جہیز

دریا کے کنارے ذرا بلندی پر محکمۂ سیاحت کا بڑا سا ہوٹل ہے۔ صبح صبح میں چہل قدمی کے لیے نکلا تو دیکھا کہ ایک عمارت کے سامنے بہت سے لوگ جمع ہیں، جیسے قطار میں کھڑے اپنی باری کا انتظار کر رہے ہوں۔ پوچھنے پر پتہ چلا کہ غیر ملکوں سے آئے ہوئے سارے کوہ پیما اس جگہ اپنے قُلی اور مزدور بھرتی کرتے ہیں۔ قراقرم کے دامن میں ان کوہ پیماؤں اور مہم جو لوگوں کا پڑاؤ یہیں اسکردو میں ہوتا ہے۔ یہاں سے یہ راستہ دکھانے والے اور مال اسباب اٹھانے والے مزدور بھرتی کر کے اپنی اپنی مہم پر روانہ ہوتے ہیں۔

میں ان لوگوں کو دیر تک دیکھتا رہا۔ وہی چھوٹی چھوٹی منگول آنکھیں، درمیانہ یا پستہ قد، گٹھے ہوئے بدن، چاق و چوبند، محنت کش۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ ان کی عمریں وزن ڈھوتے گزری ہیں۔ مجھے یاد تھا کہ غلامی کے دور میں ان ہی کے بزرگوں سے مشقّت لی جاتی تھی اور انہیں بیگار کے طور پر حکام کا اسباب ڈھونڈنا پڑتا تھا۔ مگر اب یہ لوگ مغربی کوہ پیماؤں کو راستہ دکھاتے ہیں۔ انہیں اونچے پہاڑوں کی چوٹیوں تک لے جاتے ہیں اور خود بھی زمانے کی پستیوں سے نکل رہے ہیں۔

ان جفاکش جوانوں کو دیکھ کر ذہن میں بہت سے سوال اُبھرے۔ بلتستان میں ان کے آباؤ اجداد کہاں سے آئے ہوں گے۔ یہ مہین اور ترچھی آنکھیں، رخساروں کی یہ ابھری ہوئی ہڈیاں۔ یہ چھوٹے چھوٹے قد۔ کہاں سے آئے ہوں گے ان کے بزرگ؟

پھر ایک اَور خیال آیا۔ بلتستان کے اس علاقے کا قدیم تاریخ میں ذکر ملتا ہے یا نہیں؟ دنیا بھر سے کٹے ہوئے اس علاقے میں پہلے پہل کون آیا تھا؟ اُس نے یہاں کیا دیکھا تھا؟ کیا لکھا تھا؟

یہی سارے سوال لیے میں جب وزیر غلام مہدی صاحب سے ملا تو میرے یہ سوال ان کے سامنے

قطار باندھ کر کھڑے ہو گئے۔ وزیر غلام مہدی صاحب بلتستان کے پرانے باشندے ہیں۔ نیچے میدانی علاقوں میں جا کر علی گڑھ میں تعلیم پا چکے ہیں اور تہذیب و تمدّن کا عجب امتزاج ہے ان کی شخصیت میں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ پرانی کتابوں میں بلتستان کا ذکر کہاں کہاں ملتا ہے؟

انہوں نے کہا "اس علاقے کا قدیم ذکر ٹالمی کے ہاں ملتا ہے۔ یہاں کے باشندوں کو وہ بلاتی لکھتا ہے۔ پھر ہیروڈوٹس کی تاریخ پڑھیں تو اس میں بھی ذکر آتا ہے۔ اس نے سکندر اعظم کے فوجیوں سے پوچھ کر لکھا ہے کہ ایک علاقہ ہندوستان کے شمال میں ایسا ہے کہ جہاں لومڑی کے برابر چوہے ہوتے ہیں اور وہ زمین کے اندر سے سونا نکالتے ہیں۔ تو جناب یہ وہی علاقہ ہے۔ یہاں ایک جانور ہوتا ہے جس کو سنسکرت میں چوہا کہتے ہیں۔ وہ بل بناتا ہے جس کی کھدائی سے بہت سی مٹی باہر آتی ہے۔ ممکن ہے کہیں کہیں اس مٹی میں سونے کے ذرات ہوتے ہوں۔ اس کے علاوہ ہیروڈوٹس لکھتا ہے کہ اس علاقے میں خوبانی کی روٹی بناتے ہیں۔ وہ بھی یہی علاقہ ہے۔۔۔"

اس کے بعد وزیر غلام مہدی صاحب نے بلتستان اور لدّاخ کے باشندوں کے بارے میں کچھ بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔ تاریخ ان باتوں کی تصدیق نہیں کرتی۔ نہ کرے۔ کیا خبر آگے چل کر یہ کہانیاں سچ نکلیں۔

کہنے لگے ۔۔ "میں نے ایک کتاب اور بھی پڑھی تھی۔ اب یاد نہیں رہا کہاں پڑھی تھی۔ اس میں لکھا تھا کہ یہاں سے لوگ نقل وطن کر کے یورپ گئے تھے۔ لبنان کے بہت سے باشندے یہیں سے گئے تھے۔ انجیل میں بعض قبیلوں کا ذکر ہے، وہ گلگت سے گئے تھے۔ ان باتوں کی تصدیق نہیں ہوتی مگر ممکن ہے کبھی ایسا انقلاب آیا ہو۔ ایک خیال یہ ہے کہ جاپان کے باشندوں کا اصل تعلق بلتستان سے ہے لہٰذا جاپانی زبان میں گنتی وہی ہے جو بلتی میں ہے۔ میں نے ایک دفعہ جاپانیوں سے پوچھا تھا۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے بزرگ پامیر کے نزدیک سے گئے تھے لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ یہیں سے گئے تھے۔ اس کے لیے ریسرچ ہونی چاہیے۔"

میں نے وزیر غلام مہدی صاحب سے پوچھا کہ چلیے یہ تو معلوم ہوا کہ یہاں کے باشندے کہاں کہاں گئے تھے۔ یہ بتائیے کہ خود یہاں کے باشندے کہاں سے آئے تھے؟

جواب ملا "خپلو کی جانب تو زیادہ تر آبادی منگول ہے کیونکہ اس سے آگے لدّاخ ہے، اس کی

آبادی بھی منگول ہے۔ میری والدہ خپلو کی تھیں، میرے والد روندو کے تھے جو گلگت کے نزدیک ہے۔ وہ آریائی تھے۔ مجھ میں ان دونوں کا امتزاج ہے۔ مگر ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ جسے ہم نچلا طبقہ کہہ سکتے ہیں وہ سارا کا سارا منگول نسل سے تعلق رکھتا ہے، اور جنہیں ہم اشراف کہتے ہیں وہ آریائی نسل کے ہیں۔ یہ جتنے راجگان ہیں، سب آریائی ہیں، البتہ نچلا طبقہ منگول ہے۔"

حقیقت یہ ہے کہ وسطی ایشیا اور ترکستان سے جو لوگ برصغیر کے میدانوں میں اُترے ہوں گے ان ہی میں سے کچھ لوگ وہیں دریائے سندھ اور آس پاس کے پہاڑی نالوں کی وادیوں میں ٹھہر گئے ہوں گے۔

مگر ان باتوں سے تشفّی نہ ہوئی اور میں نے اس دور کے بڑے تاریخ دان جناب احمد حسن دانی سے بات کرنے کی ٹھانی۔ خالص علمی گفتگو کا ایک اپنا لطف ہوتا ہے۔ میں نے دانی صاحب سے پوچھا کہ بلتستان میں جو باشندے آباد ہیں، اصل میں یہ کون ہیں؟ میرا سوال پوچھنا تھا کہ علم کا دفتر کھل گیا۔

" بلتستان میں جو قوم آباد ہے اس کے زیادہ تر باشندوں کو ہم بالتی پا کہتے ہیں۔ ان کا تعلق تبتی گروپ سے ہے۔ ان کی زبان کا تعلق بھی تبّتی زبان سے ہے۔ یہ قومیں جب تبت سے ترک وطن کر کے لداخ پہنچیں تو ان میں سے کچھ لوگ بلتستان تک آ گئے۔ اب اگرچہ اکثریت ان ہی کی ہے۔ مگر ان کے بعد بہت سارے لوگ اور دوسری جگہوں سے بھی آ کر آباد ہونے لگے۔ قرون وسطیٰ میں ترکستان، سنکیانگ اور ٹرانس پامیر کے علاقے سے لوگ یہاں آئے اور انہوں نے حکومت بھی کی۔ یہاں جو راجا مہاراجا ابھی انگریزوں کے زمانے تک تھے ان کا تعلق ترکستان کے قبیلوں سے تھا۔ بعد میں جب مہاراجا کشمیر کا تسلّط ہوا تو اس وقت کشمیر سے بھی لوگ آ کر یہاں آباد ہوئے مگر کشمیر کے باشندے اتنے زیادہ نہیں آئے جتنے کشمیری ثقافت کے اثرات آئے۔"

میں نے پروفیسر دانی سے پوچھا کہ بلتستان کے علاقے میں اسلام کب آیا اور کس طرف سے آیا؟ مختلف لوگ مختلف باتیں کہتے ہیں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟۔

جواب ملا — " بلتستان میں یقینی طور پر چودھویں صدی میں اسلام پھیلا۔ یہ وہ زمانہ تھا جب سید علی ہمدانی یہاں تشریف لائے۔ پھر یہیں سے لوگ تبلیغ کرنے لداخ گئے مگر وہاں اسلام اتنا زیادہ نہ پھیل سکا البتہ مغلوں کے زمانے میں۔ خاص طور پر اکبر کے بعد جب مغلوں کا تعلق تبت خورد سے ہوا

تو یہاں سے لوگوں نے جانا شروع کیا۔ خصوصاً مسلمان تاجر پشمینہ لینے لداخ اور تبت جاتے تھے۔ انہوں نے اسلام پھیلانا شروع کیا چنانچہ لداخ میں جو اسلام پھیلا وہ کشمیر سے گیا۔ بلتستان میں جو اسلام پھیلا وہ کشمیر سے بھی آیا لیکن بعد میں کاشغر سے بھی اس کے اثرات آئے۔"

پروفیسر دانی سے میں نے پوچھا کہ وہ جو سنتے ہیں کہ وسطی ایشیا میں کہیں سے آریائی باشندے اٹھے تھے اور برصغیر کے میدانوں میں اتر آئے تھے، ان کے اثرات بلتستان کے علاقوں میں کس قدر ہیں؟

دانی صاحب کو نہ سوچنا پڑا، نہ کتابیں دیکھنی پڑیں۔ برجستہ بولے ــــ "یہاں پر آریاؤں کے کئی گروپ آئے۔ کہاں سے آئے یہ نہیں معلوم۔ ہو سکتا ہے وسط ایشیا سے آئے ہوں، ممکن ہے بحیرۂ کیسپئن سے آئے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یورپ سے آئے ہوں۔ مگر یہ بات طے ہے کہ آریائی باشندے مختلف ادوار میں آتے رہے۔ ایک گروپ وہ ہے جس کو ہم انڈو آرین کہتے ہیں۔ قدیم فارسی اور ہندوستان کی قدیم سنسکرت ان ہی کی زبان سے نکلی۔ دوسرے لوگ وہ ہیں جن کا تعلق درد قوم سے ہے۔ یہ بھی آریائی قوم ہے لیکن یہ وہ آریائی قوم ہے جس کا تعلق جدید سنسکرت سے نہیں بلکہ قدیم کلاسیکی سنسکرت سے ہے۔ ان کی زبان انڈو آرین ہے۔ یہ ساری زبانیں، چاہے وہ کوہستانی ہو، چاہے گلگت کی شینا ہو، چاہے بروشاسکی ہو، یہ سب انڈو آرین گروپ سے ہیں۔ ان لوگوں کے قدوقامت بھی منگول قبائل سے مختلف ہیں اور دلچسپ بات یہ ہے کہ قدیم کلاسیکی سنسکرت والے بعد میں آئے، یہ اس سے پہلے آچکے تھے۔ اسی لیے اس علاقے کے ان باشندوں کی زبان پر کلاسیکی سنسکرت کا اثر نہیں ہے ــــ"

میں نے کہا کہ میں کچھ روز پہلے لداخ میں تھا۔ وہاں تو بودھ مذہب اور بودھ تہذیب کے اثرات بہت زیادہ تھے۔ اس سے بالکل لگے ہوئے اس بلتستان کے علاقے میں بودھ مذہب پر کیا گزری؟

وہ بولے ــــ "اس میں شک نہیں کہ آج بلتستان میں گوتم بدھ کو ماننے والا کوئی نہیں۔ بودھ عقیدہ یہاں کافی عرصے پہلے ختم ہو گیا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس علاقے کا تعلق کافی عرصے گندھارا یعنی پشاور کی وادی اور چین کے ساتھ رہا ہے بلکہ بعض مورخ یہ بھی کہتے ہیں کہ تبت اور لداخ میں بودھ مذہب اسی علاقے سے سوات اور گلگت کے راستے بلتستان سے ہوتا ہوا گیا۔ اور کہتے ہیں کہ پدم سمبھو، جو بہت بڑا بزرگ گزرا ہے، بودھ مت یہاں سے لے کر وہاں گیا۔ لیکن بعد میں تنلنہ کے قریب پھر

ہندو عقیدے کا تسلط ہوا اور وشنو، شیوا اور کرشنا کی پوجا ہونے لگی اور سورج کی پرستش شروع ہو گئی۔ اُس زمانے میں ہم دیکھتے ہیں کہ بودھ عقیدے کا زور کم ہوگیا اور ہندو عقیدہ آگے نکل گیا۔ اسلام یہاں پر بہت بعد میں آیا۔ خاص طور پر گلگت، چلاس اور کوہستان میں اسلام چودھویں اور پندرھویں صدی سے پہلے نہیں آیا۔ اس وقت تک یہاں مذہبوں کا ملغوبہ سارہا جس میں بدھ ازم کم اور ہندوازم زیادہ تھا۔ یہ بھی ہوا کہ یہاں بودھ باشندے جتنے بھی تھے وہ سارے سنکیانگ، چین یا تبت چلے گئے۔ بلتستان میں بدھ ازم کے اثرات کافی عرصے رہے مگر چودھویں صدی میں جب اسلام آیا تو پوری آبادی نے اسلام قبول کیا اور بدھ ازم کا خاتمہ ہوا۔۔۔۔"

دانی صاحب کی باتیں سن کر خیال آیا کہ جس علاقے میں بودھ مذہب کی مضبوط بنیادیں رہ چکی ہوں وہاں اس عقیدے کا یوں ختم ہوجانا حیرت کی بات ہے۔ میں نے وزیر غلام مہدی صاحب سے پوچھا کہ بلتستان میں بودھ تہذیب کی کوئی رسم، کوئی نشانی باقی بچی ہے؟

"ہاں۔۔۔ مثال کے طور پر یہاں دسمبر کے آخری دنوں میں ایک رسم ہوتی تھی وہ بودھ زمانے کی یادگار ہے، اس میں لوگ شمعیں لے کر نکلتے تھے۔ مگر اسلام' ان سب پر حاوی آگیا۔۔۔ یہ اسلام اتنی سخت چیز ہے کہ جب کسی پر قبضہ کرلیتی ہے تو اس کی بنیادوں میں اتر جاتی ہے۔ اس نے پورا حلیہ بدل ڈالا۔ اَور تو اَور ہماری زبان بدل گئی۔ لداخی زبان اور ہماری زبان میں فرق تو نہیں۔ دونوں تبتی ہیں۔ مگر اسلام آیا تو ہماری اور لداخی زبان میں فرق ہوگیا۔ اب ہم لداخی زبان بمشکل سمجھ سکتے ہیں۔ ہمارے ہاں عربی اور فارسی الفاظ آرہے ہیں۔ بلکہ ہم نے اُن کا رسم الخط بھی چھوڑ دیا اور فارسی رسم الخط اختیار کرلیا۔۔۔"

واقعی سب کچھ بدل گیا۔ یہ بلتستان جو باقی برصغیر سے اتنی دور، اتنا الگ تھلگ ہے، اصولاً اس کی دنیا بھی بالکل جدا ہونی چاہیے تھی مگر ان لوگوں کو صاف، سلیس اور رواں اُردو بولتے سُنا تو مَیں حیران رہ گیا۔ ان کے لہجے پر نہ پنجاب کے اثرات تھے، نہ کشمیر کے اور نہ ہزارہ کے۔ مَیں نے وزیر غلام مہدی صاحب سے پوچھا کہ اس کا کیا راز ہے؟

وہ سلیس اردو میں بولے "بات یہ ہے کہ ہم ہر آواز کا تلفظ ادا کرسکتے ہیں کیونکہ ہمارے لب و لہجے اور گفتگو میں یہ ایسی فطری خوبی ہے کہ اردو ہو یا عربی یا فارسی، ہم آسانی سے بول لیتے ہیں۔

چنانچہ ایک بڑے آدمی نے کہا تھا کہ اردو پھل ہو سکتی ہے تو بلتستان میں کیونکہ بلتستان کی تہذیب وہی ہے جو اردو کی تہذیب ہے۔ ہر زبان کے پیچھے ایک تہذیب ہوتی ہے اور اردو کی تہذیب میں بلتی کی طرح بہت سی ثقافتوں کا اشتراک ہے چنانچہ اس بڑے آدمی نے کہا تھا کہ بلتی لوگ آسانی اور روانی سے اردو بول سکیں گے۔ اب آپ اس کی تصدیق کر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "آپ ہندوستان میں رہ چکے ہیں اور تعلیم پا چکے ہیں، آپ کیا محسوس کرتے ہیں کہ وہاں کے اثرات بلتستان کب اور کیسے پہنچے؟"

ان کا جواب دلچسپ تھا۔ بتانے لگے۔ "میں عرض کروں کہ جب علی شیر انچن نے جون ۱۵۵۰ء سے لے کر ۱۶۳۴ء تک رہا، دِلّی میں مغل شہزادی سے شادی کی، جس کا نام گل خاتون تھا، تو ہندوستانی اثرات پوری آن بان سے آئے۔ گل خاتون اپنے ساتھ موسیقار اور معمار، فن کار اور دستکار لے کر آئی اور مغل کلچر کو یہاں پھیلانا شروع کر دیا۔ یہاں تمام راگ راگنیاں یہاں تک کہ پکے راگ بھی آ گئے۔ یہاں مغل طرز کا سنگِ مرمر کا محل تعمیر ہوا۔ ڈوگروں نے بعد میں اُسے گرا دیا مگر اس محل کے سنگِ مرمر کے ٹکڑے آج بھی کچھ تو راجا صاحب اسکردو کے محل میں پڑے ہیں۔ کچھ ڈپٹی کمشنر کی کوٹھی کے احاطے میں ہیں اور چند ٹکڑے مندر کے نیچے پڑے ہیں۔ مطلب یہ کہ علی شیر انچن کے زمانے میں وہ کلچر سالم یہاں آ گیا جس میں نشست و برخاست تک شامل تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب میں علی گڑھ گیا تو یوپی میں مجھے یوں محسوس ہوا جیسے میں بلتستان میں ہوں۔ کیونکہ نشست و برخاست وہی تھی اور آدابِ محفل وہی تھے، یہاں تک کہ تکلفات وہی تھے۔ مگر یہ بات پنجابی اور کشمیری محسوس نہیں کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ سب اجنبی تھا مگر میرے لیے یہ جانی پہچانی تہذیب تھی۔"

ہماری جیپ اسکردو سے نکلی اور دریا کو چھوتی ہوئی چلی۔ رستے میں درختوں کے جھنڈ آئے، گاؤں آئے، ہوائی اڈہ آیا اور سیاحوں کی بہشت، شنگریلا آئی۔ دریا گھاٹی میں داخل ہونے لگا اور سڑک بلند ہونے لگی کہ اچانک سامنے بڑا سا پل آ گیا۔ یہاں ہماری جیپ روک لی گئی۔ اس کی تلاشی لی گئی۔ ڈر تھا کہ اس میں کہیں ہتھیار نہ ہوں۔ ہتھیاروں کی وبا بلتستان تک پہنچ گئی تھی۔

ایک نوجوان جیپ کی تلاشی لینے میں مصروف تھا۔ میں نے باتوں باتوں میں اسے اپنا اتہ پتہ بتایا۔

میرا نام سنتا تھا کہ اس نے تلاشی چھوڑی اور مجھے بھینچ کر سینے سے لگا لیا اور جب تک میں نے چائے نہیں پی لی، بسکٹ نہیں کھا لیے اور بہت دیر تک مصافحہ نہیں کر لیا، اُس نے مجھے جانے نہیں دیا۔ اتنی چھوٹی آنکھوں سے اتنی بہت سی محبت جھلک سکتی ہے، اس کا احساس مجھے بلتستان جا کر ہوا۔ اور اتنی تنگ، دشوار گزار، سنگلاخ اور لڑھکتی چٹانوں میں پسی جانے والی گھاٹی میں اتنی اعلیٰ، عمدہ، محفوظ اور رواں سڑک بنائی جا سکتی ہے، اس کا علم بھی مجھے بلتستان پہنچ کر ہوا۔

اب جو ہماری جیپ آگے چلی، انسان اور اس کے ہنر اور اس کے عزائم کے بھید کھلتے گئے۔ ہمالیہ کے پار قراقرم کے برف سے ڈھکے پہاڑ سر اٹھائے کھڑے ہیں جن میں پاکستان کے انجینئروں اور فوجیوں نے یہ ایسی سڑک تراشی ہے کہ اس پر چلتے ہوئے دل دہلتا جاتا ہے اور عقل دا دیئے جاتی ہے۔

کبھی یوں لگا کہ بہت اونچائی پر کوئی دوسری سڑک چلی جا رہی ہے۔ ذرا دیر بعد خود کو اُسی سڑک پر پایا۔ کبھی یہ نظر آیا کہ نیچے گہرائی میں ایک متوازی سڑک دوڑ رہی ہے۔ کچھ دیر بعد خود کو اُس پر دوڑتا ہوا دیکھا۔

حیرت انگیز طور پر تراشی ہوئی چٹانیں جن پر تتر بتر گھاس کے سوا کسی درخت کا نام و نشان بھی نہ تھا۔ کہیں کہیں بالائی چٹانیں ہمارے سروں کے اوپر جھکی ہوئی تھیں، بالائی پہاڑ سڑک پر سایہ کیے ہوئے تھے۔ دو ایک جگہ اوپر سے گرتے ہوئے آبشار عین سڑک کے اوپر برس رہے تھے۔ گرد میں اٹی ہوئی موٹر گاڑیاں ان سے گزریں تو دوسری طرف شفاف ہو کر نکلیں۔

ایسی شاہراہ پر قدم قدم پر خوشبودار پھول کھلے ہوتے تو کتنا اچھا لگتا، مگر اس شاہراہ پر قدم قدم پر کتبے کھڑے تھے جن پر لکھا تھا "اس جگہ سڑک بناتے ہوئے فلاں انجینئر شہید ہوا ـــــ اس مقام پر ڈرائیور فلاں نے جام شہادت نوش کیا ـــــ اور اس جگہ کرنل فلاں بارود کے ناگہاں دھماکے میں شہید ہوئے۔"

اُس روز پتھر کے کتبوں سے پھولوں کی خوشبو آئی۔

ہماری جیپ دریا کے ایک کنارے پر بہت اونچی سڑک پر جا رہی تھی اور دوسرے کنارے پر بہت نیچے، لبِ دریا ایک سرسبز گاؤں تھا جس کے ہریالے میدان میں لوگ پولو کھیل رہے تھے۔

اونچائی سے یہ منظر بڑا دلفریب لگا۔

ہمالیہ پار قراقرم کے دامن میں پولو کا کھیل صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔ یہاں کے باشندے پولو دیکھنے یوں جاتے ہیں جیسے ہم لوگ میلہ دیکھنے جاتے ہیں۔ گھوڑے سجتے ہیں، کھلاڑی سنورتے ہیں اور وادیوں میں ڈھول تاشے اور نفیریاں گونجتی ہیں اور اس طرح گویا اعلان ہوتا ہے کہ جسے دیکھنا ہو آ جائے، پولو کا مقابلہ شروع ہو رہا ہے۔

میں اسکردو میں تھا جہاں میری ملاقات شِغر کے راجا محمد علی صبا صاحب سے ہوئی تھی۔ وہ پولو کے بے حد اچھے کھلاڑی ہیں۔ اس روز ان سے پولو کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا کہ آپ کے علاقے میں پولو کھیلنے کی روایت کتنی پُرانی ہے؟

کہنے لگے: "ہم تو یہ سمجھتے ہیں، بلکہ ہمارا دعویٰ ہے کہ پولو کی ابتدا ہمارے ہاں سے ہوئی کیونکہ ہماری زبان میں گیند کو پولو کہتے ہیں۔ ویسے آج کل گلگت کی پولو کا بہت شہرہ ہے لیکن وہاں پولو کے قاعدے ضوابط نہیں ہیں۔ وہ بہت ہی رف کھیلتے ہیں لیکن ہمارے ہاں باقاعدہ اس کے لوازمات ہیں۔ کل اگر پولو ہے تو ایک شام پہلے ڈھول بجایا جاتا تھا تاکہ تمام سواروں کو پتہ چلے کہ کل پولو ہونے والا ہے۔ اور اگلی صبح پھر دوبارہ یاد دہانی کے لیے ڈھول بجایا کرتے تھے۔ پھر پولو کی شام کو دو تین بجے باجہ نواز آ کر اپنے باجے بجاتے تھے جس پر سب سوار جمع ہو کر راجوں کے پاس آتے تھے اور میدان میں جا کر کھیلا کرتے تھے۔"

میں نے پوچھا: "گھوڑے کا اس علاقے کی زندگی سے گہرا تعلق رہا ہے۔ ایک زمانہ ایسا رہا ہوگا جب گھوڑے کے بغیر آنا جانا، مال لانا لے جانا مشکل ہوتا ہوگا۔ اب یوں لگتا ہے کہ گھوڑا زندگی سے نکل جائے گا، کیا پولو کا کھیل بھی زندگی سے نکل جائے گا؟"

راجا صاحب ذرا دیر ٹھہرے۔ کچھ سوچا اور بولے: "یہ آپ نے بہت ہی درست فرمایا۔ پہلے زمانے میں سفر کے لیے، باربرداری کے لیے، پولو کے لیے، ہر مقصد کے لیے گھوڑا رکھا کرتے تھے۔ اب پولو کے سوا کسی کام کے لیے گھوڑے کی ضرورت نہیں ہے۔ اب تو وہی لوگ گھوڑا رکھ سکیں گے جن کے پاس گھاس چارے کی گنجائش ہو اور اس کی پرورش کے اخراجات اٹھا سکتے ہوں، ورنہ اب گھوڑوں کا رہنا کچھ محال ہی نظر آتا ہے۔"

ہماری جیپ دریائے سندھ کے کنارے دوڑتی گئی۔ بہت بڑا دریا مگر بے حد خشک کنارے۔ بہت اجاڑ پہاڑ اور نہایت ویران وادیاں۔ مگر راستے میں کہیں کہیں سرسبز پڑاؤ آتے گئے۔ وہی سڑک کے کنارے چائے خانے، مسجد اور امام باڑوں کے چندے کی صندوقچیاں، کھمبوں پر لگے ہوئے چھوٹے چھوٹے ٹیلرکس، ناشپاتی، سیب اور خوبانی کے درخت، بے لگام گھومتے ہوئے مویشی، بیچ میں ثابت اور کناروں سے ادھڑی ہوئی سڑک اور سڑک کے کنارے بہتے ہوئے چشمے۔

ایسے ہی علاقوں میں چلتے چلتے اور شہیدوں کے ناموں کی تختیاں پڑھتے پڑھتے دوپہر ہو گئی۔ بھوک اب چمکنے ہی کو تھی کہ ہماری جیپ اُس بستی میں جا پہنچی جس بستی والوں کو اچھی طرح معلوم تھا کہ جب گاڑی یہاں پہنچتی ہے وہی کھانے کا وقت ہوتا ہے چنانچہ بستی والوں نے وہاں بڑا سا ہوٹل کھول دیا تھا، دکانیں بنا دی تھیں اور سایہ دار درخت لگا دیئے تھے۔ اس بستی کا نام شِنگش تھا۔ میں اترا تو گاؤں والوں نے حلقہ کر لیا۔ ہر ایک مجھ سے پوچھنا چاہتا تھا کہ میں کون ہوں اور خود بتانا چاہتا تھا کہ وہ کون ہے۔

ان لوگوں میں محمد جمیل بھی تھے۔ چہرے بشرے سے ذہین، مہذب اور تعلیم یافتہ۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی یہ بستی کتنی پُرانی ہے؟

"یہ بہت پُرانی ہے سر۔ کافی سالوں سے ہے۔ میرے دادا وغیرہ یہیں آباد تھے۔ ۲۵ گھر ہیں یہاں پر سَر اور آبادی پورے تین سو افراد پر مشتمل ہے۔"

مَیں نے پوچھا — "لوگ کیا کرتے ہیں روزی کے لیے؟"

"سر یہ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ ان کی اپنی زمینیں ہیں۔ اور ایک دو لوگ ہیں جو کاروبار کرتے ہیں۔"

"آپ خود کیا کرتے ہیں؟ —"

"سر میں نے ایف ایس سی کیا ہے اس سال —"

"آپ کے اس گاؤں میں کچھ اور نوجوان بھی تعلیم پا رہے ہیں؟ —"

"جی سر۔ آٹھویں جماعت تک پڑھ رہے ہیں۔ اس سے آگے کا انتظام نہیں ہے۔ میں اکیلا ہوں جس نے ایف ایس سی کیا ہے۔"

یہ سوچ کر کہ محمد جمیل نے سائنس کی تعلیم پائی ہے، میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں جو کھیت اور

باغ نظر آرہے ہیں ان کو سیراب کرنے کے لیے پانی کہاں سے اور کیسے لاتے ہیں؟

ان کا جواب ادب اور احترام کی جدید علامت ہی سے شروع ہوا۔ "سر ایک دو ایسے گاؤں ہیں جہاں پر چھوٹے چھوٹے چشمے ہیں، چشموں کے پانی سے ہم کاشت کرتے ہیں۔ ایک دو گاؤں ایسے ہیں جہاں پر گرمیوں میں برف کا پانی آتا ہے۔ تو جب پانی آتا ہے ہم کاشت کرتے ہیں ـــ"

نیچے وادی کی تہ میں چٹانوں سے سر پٹختے دریا کی طرف اشارہ کر کے میں نے محمد جمیل سے پوچھا۔

"اور یہ جو نیچے اتنا بڑا دریا بہہ رہا ہے؟ ـــ"

"یہ دریا ویسے ہمارے کسی فائدے کا نہیں ہے، ہم اس سے صرف مچھلیاں پکڑتے ہیں۔ اور کسی کام کا نہیں ہے سر۔"

اتنا بڑا دریائے سندھ اتنی چھوٹی سی بستی کے کسی کام کا نہیں، یہ سن کر حیرت ہوئی۔

وہیں میری ملاقات فدا حسین سے ہوئی۔ کچھ دور کے گاؤں تھوار میں رہتے ہیں مگر کہنے لگے کر ڈیوٹی یہاں ژنگس میں کرتا ہوں۔ میں نے پوچھا کہ کیا ڈیوٹی ہے آپ کی؟

"میں اسکول ماسٹر ہوں جناب"

"پڑھاتے ہیں آپ؟"

"جی سر۔"

"خود آپ کہاں تک پڑھے ہیں؟"

"میں ایف اے تک پڑھا ہوں سر۔"

"کہاں تعلیم پائی آپ نے؟"

"میں ادھر ہی پڑھا ہوں۔ کہیں نہیں گیا سر۔"

"اس علاقے میں اتنی تعلیم ہے؟"

"ہے سر۔ تعلیم پرائیویٹ حاصل کرتا ہوں اور امتحان دینے اسکردو جاتا ہوں۔"

"اور گاؤں کے بچے کہاں جاتے ہیں؟"

"گاؤں کے بچے ژنگس میں پنجم تک تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ اس کے بعد کسی ہائی اسکول جاتے ہیں اور کچھ بچے داموداس ہائی اسکول جاتے ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ ان دیہات میں تعلیم کافی ہے۔"

"کافی ہے لیکن اساتذہ کی کمی ہے، اسکول کی عمارتوں کی کمی ہے، فرنیچر کی کمی ہے۔ اسی وجہ سے عوام کو تکالیف ہیں۔"

"اور کیا کیا تکالیف ہیں۔"

"مہنگائی بہت ہے۔ کھانے پینے کی اشیا دور دراز علاقوں سے لائی جاتی ہیں اس لیے بڑی مہنگی ہیں۔ بس گزارا ہو جاتا ہے —"

"دوا علاج کا کیا انتظام ہے —"

"کوئی اسپتال نہیں ہے۔ مریضوں کو ستر اسّی میل تک لے جانا پڑتا ہے۔ بعض مریض راستے ہی میں مر جاتے ہیں۔ بہت تکلیف اٹھانی پڑتی ہے۔"

فدا حسین کی زبانی اتنی بہت سی شکایتیں سن کر میں نے پوچھا "آپ کے علاقے کے بڑے بوڑھے اور بزرگ کیا کہتے ہیں۔ پرانا زمانہ زیادہ اچھا تھا یا اب زندگی کی سہولتیں زیادہ ہیں؟"

وہ بولے — "ہمارے بزرگ لوگ کہتے ہیں کہ پرانے زمانے میں بہت تکلیف تھی۔ راستے خطرناک تھے۔ کھانے پینے کی اشیا نایاب تھیں۔ بہت تکلیف تھی، اب تو روڈ بن گئی ہے۔ روڈ کی وجہ سے ہر چیز کی سہولت ہو گئی ہے سر۔"

میں نے پوچھا "اب تو لوگ روڈ بننے سے بہت خوش ہوں گے۔"

جواب ملا — "جی سر۔ لیکن اگر اس سے بھی بڑا روڈ بنے تو بہت افضل ہو۔"

فدا حسین کا یہ جواب سُن کر میں رَب سے پوچھے بغیر نہ رہ سکا کہ تمنا کا دوسرا قدم کہاں ہے سر؟

وہیں میری ملاقات ایک نوجوان محمد الیاس سے ہوئی۔ وہ زیادہ پڑھا لکھا نہیں۔ کچھ کرتا بھی نہیں شاید۔ غالباً مارا مارا پھرتا ہے۔ مَیں نے محمد الیاس سے پوچھا کہ اس علاقے کے لوگ سارا سال کیسے گزارتے ہیں؟۔

وہ نہ صرف میرا سوال سمجھ گیا بلکہ اپنے جواب سے میری تشفّی بھی کر دی۔ کہنے لگا — "یہاں عورت اور مرد سب کا زمیندارہ کا کام ہے۔ گرمیوں میں سب لوگ اوپر پہاڑوں پر چلے جاتے ہیں۔ وہاں جا کر مرد بکری چَراتے ہیں اور عورتیں بکریوں کا دودھ نکالتی ہیں۔ لسّی بناتی ہیں، گھی بناتی ہیں۔"

میں نے حیران ہو کر پوچھا، "مطلب یہ کہ زیادہ کام عورتیں کرتی ہیں، مرد صرف بکریاں چراتے ہیں؟"

"نہیں۔ جب آٹا واٹا ختم ہو جاتا ہے تو مرد گدھے لے کر نیچے آتے ہیں اور گاؤں سے گدھے پر آٹا چڑھا کر اوپر پہنچاتے ہیں۔"

"کتنے دن کا راستہ ہے؟"

"بس ایک دن کا راستہ ہے۔ صبح نکلتے ہیں تو شام کو ادھر پہنچ جاتے ہیں۔"

محمد الیاس کی باتوں میں سوچنے کی بہت سی باتیں تھیں۔ ان باتوں کے دوران بہت سے لوگ جمع ہو گئے۔ ان میں ایک بزرگ بھی نظر آئے جو کہیں دور سے چل کر آئے ہوں گے۔ بے حد تھکے ہوئے مگر مسرور نظر آ رہے تھے۔ ان کا نام غلام قیصر تھا۔ کہنے لگے کہ دریائے سندھ کے پار چھ میل دور پہاڑوں پر ان کا گاؤں بلاچی ہے جہاں ایک ایک گز برف پڑی ہوئی ہے اور وہاں سے اُتر کر تِنگس آنے میں پانچ گھنٹے لگتے ہیں۔ پھر ان کی خوشی کا حال کھلا۔ کہنے لگے: "میں وہاں اوپر تھا۔ وہاں سے آپ کی گاڑی دیکھی۔ ایک راہ گیر سے پوچھا کہ کون آیا ہے۔ اس نے بتایا کہ بی بی سی کا نمائندہ ہے۔ بس وہاں سے دوڑا چلا آ رہا ہوں۔ یہ میری خوش قسمتی ہے کہ آپ سے ملاقات ہو گئی۔"

میں نے پوچھا — "آپ وہاں پہاڑوں کے اوپر اپنے گاؤں میں بی بی سی سنتے ہیں؟"

"جی سر، ہم ریڈیو سنتے ہیں۔"

"آپ کو دنیا کی خبریں ملتی ہیں؟ —"

"ملتی ہیں۔ بالکل ملتی ہیں سر۔"

"کیسا ہے آپ کا گاؤں غلام قیصر صاحب —

"بیس گھر ہیں۔ ۱۲۵ لوگ ہیں۔ باقی مویشی ہیں اور جنگل ہیں۔"

"آپ وہاں کیا کرتے ہیں؟"

"میں جنگلات میں ڈیوٹی کرتا ہوں۔ پہلے میں فوج میں تھا اور ۱۹۶۵ء کی لڑائی میں شامل تھا۔ اس کے بعد میری والدہ صاحبہ نے وہاں سے مجھے ڈسچارج کرا دیا اب جنگلات کی نگرانی کرتا ہوں اور شکار کی نگرانی کرتا ہوں۔"

میں نے پوچھا "گاؤں کے نوجوان کیا کرتے ہیں؟"

وہ بولے — "کچھ بھی نہیں کرتے، جہاں جانے کے لیے سڑک نہ ہو، دریا پر پُل نہ ہو، سواری نہ ہو۔ وہاں کوئی کیا کر سکتا ہے سر؟"

میں چلنے لگا تو محمد الیاس نے بڑی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا — میں نے کہا کہ تم نے یہ تو بتا دیا کہ اس علاقے کی عورتیں اور مرد سارا سال کیسے گزارتے ہیں۔ تم نوجوان ہو۔ تم بتاؤ اپنا سارا دن کیسے گزارتے ہو؟

"بس سر۔ دن میں پندرہ سولہ مچھلیاں پکڑ لیتے ہیں دریائے سندھ سے۔ روزے کے دن وہیں نیچے دریا پر گزارتے ہیں۔ شام کو گھر میں آ کر افطار کرتے ہیں اور صبح پھر ادھر دریائے سندھ میں جا کر ڈیوٹی لگاتے ہیں مچھلیاں نکالنے کی۔"

تو یہ ہیں بلتستان کی ان دور دراز بستیوں کے دور دراز باشندے۔ اب ان کی زندگی میں تبدیلیاں آ رہی ہیں، ان کی دنیا بدل رہی ہے۔ سوچتا ہوں کہ کیا اچھا ہو، ان کی تقدیر بھی بدل جائے۔

سڑک کے راستے انقلاب

کیسا عجب تھا یہ دریائے سندھ۔ اسے جنوب کے نشیبوں میں اُترنا تھا مگر بھیانک ویرانوں میں اس نے پہلو بدلا اور شمال کی طرف دوڑنے لگا۔ ان ویرانوں میں کہیں کہیں کسی پہاڑی نالے میں ہریالی اور آبادی نظر آتی لیکن ذرا آگے چل کر پھر وہی ہو کا عالم۔ دیوار کی طرح سر اٹھائے سینہ تانے آسمان کو چھوتے ہوئے پہاڑ اور بالکل ننگے پہاڑ۔

میرے ڈرائیور نے بتایا کہ ان پہاڑوں کی آڑ میں ان سے بھی کہیں اونچا ننگا پربت ہے۔

گلگت اسکردو روڈ سنگلاخ گھاٹیوں میں دوڑتی رہی اور نیچے دریا چٹانوں پر سر پٹختا رہا۔ اوپر پہاڑوں سے لڑھک کر ہاتھی جیسے پتھر دریا میں گرتے رہے ہوں گے۔ کہیں کہیں یہ پتھر دریا میں پنجے گاڑ کر کھڑے ہو گئے تھے۔ وہاں پانی ذرا ٹھہرتا تھا، اونچا ہوتا تھا اور پتھروں کے پہلو سے نکل کر اتنی شدت سے گرتا تھا کہ پہاڑوں کے سینے میں گڑگڑاہٹ سنائی دیتی تھی۔ بلتستان کے علاقے میں ایسے بڑے بڑے اونچے گول پتھر جابجا پڑے تھے کہ اندھیرے میں دیکھیں تو گمان ہو کہ ہاتھی کھڑے جھوم رہے ہیں۔

ایک جگہ دریا دور چلا گیا، سڑک الگ ہو گئی اور سناٹا چھا گیا۔ ذرا میدان سا آیا تو میں نے جیپ رکوا دی۔ جیپ کا انجن بند ہونا تھا کہ پورے علاقے پر سناٹا ٹوٹ پڑا۔ اتنی خاموشی کہ کانوں میں درد ہونے لگا۔

کسی انسان کی آواز نہ کسی مشین کا شور۔ میرے جوتوں تلے کنکر چرچر بولے تو یوں لگا جیسے سارا کرۂ ارض کچلا جا رہا ہو۔ وہیں پتھروں کے کچھ ڈھیر تھے جن کے اندر سانپ تنکوں کے جھنجھنے جیسی آواز نکال رہا تھا۔ وہ صاف سنائی دی۔

اور اوپر وہاں، نچلے پہاڑوں کے کٹے پھواڑے شفاف فضا کی شدید دھوپ میں برف سے ڈھکا ننگا پربت یوں چمک رہا تھا جیسے نیلے شامیانے کے نیچے زمین اپنے سر پر تاج رکھے بیٹھی ہو۔

بلتستان کا علاقہ ختم ہونے لگا۔ میں نے آخری بار پلٹ کر دیکھا اور اس ویرانے میں انسان کے ہونے کی ایک نشانی نظر آئی۔ ہاتھی جیسی ایک چٹان پر کسی نے بڑے حرفوں میں لکھا تھا "اس علاقے کو پانچواں صوبہ بنایا جائے ___"

یہ علاقہ قابلِ رحم ہے۔ نہ کشمیر میں ہے نہ پاکستان میں ہے۔ نہ ان لوگوں کی کسی اسمبلی میں نمائندگی ہے نہ کسی پارلیمان میں۔ کسی ہائی کورٹ یا سپریم کورٹ تک ان کی رسائی نہیں۔ جو کچھ ہے گلگت میں ہے۔ جسے غرض ہو اپنا گھر، اپنے بال بچے چھوڑ کر نکلے۔ جان ہتھیلی پر رکھ کر گلگت پہنچے اور منصف سے انصاف چاہے۔

بس یہاں سے دریا نے اپنا رُخ بدلا اور جنوب کی طرف بہنے لگا۔ راکا پوشی کی طرف سے آتا ہوا دریائے ہنزہ اور مغرب سے آتا ہوا دریائے گلگت مل کر ایک ہوئے اور سندھ کے آنچل میں سما گئے ہمارا یہ دریا اب ننگا پربت کے گرد گھوم کر بہنے لگا اور آسمان کو چھوتے پہاڑوں کی چوٹیوں سے چاندی کی لکیر کی طرح گرتے ہوئے آبشار راہ میں تین تین چار چار جگہ رکتے اور اٹکتے نیچے دریا میں اترنے لگے کہ اچانک چلاس آگیا۔

وہ وسطی ایشیا سے جو تجارتی قافلے ہندوستان آتے ہوں گے وہ گلگت کے راستے یہیں چلاس پہنچتے ہوں گے اور پھر درّہ بابوسر پار کر کے کاغان ہوتے ہوئے یا تو کشمیر کی طرف یا پنجاب کی جانب نکل جاتے ہوں گے۔

چلاس ایک ایسے میدان میں آباد ہے جسے قدرت نے ایک طرف سے اونچا کر کے دریا کے رُخ جھکا دیا ہے۔ وہیں انگریزوں کے زمانے کا چھوٹا سا ہوائی اڈہ ابھی تک ہے اور وہیں بودھوں اور ہندوؤں کے زمانے کے نقش چٹانوں کی پیشانیوں پر اب تک کندہ ہیں۔

یہ شہر کبھی کیسا پسماندہ رہا ہوگا۔ میں پہنچا تو شاہراہ قراقرم کو وہاں پہنچے بیس سال ہو چکے تھے۔ انقلاب ذہن اور فکر کے راستے آیا کرتے ہیں۔ اس علاقے کا انقلاب سڑک کے راستے آیا ___ یہ بات میں نہیں کہہ رہا ہوں۔ یہ بات چلاس والوں نے مجھ سے کہی۔

کرامت اللہ صاحب چلاس کے پرانے باشندے ہیں۔ پاکستان کے اس شمالی علاقے کو خوب جانتے ہیں اور بدلتے ہوئے وقت کو غور سے دیکھتے رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کا یہ شہر چلاس کتنا بدلا ہے؟

"بہت بدل گیا ہے۔ میری پینتالیس چھیالیس سال کی عمر ہے۔ اس دوران یہ شہر بہت بدلا ہے۔ پہلے یہاں ایک جیپ روڈ ہوتی تھی اور پاکستان بننے سے پہلے تو وہ جیپ روڈ بھی نہیں تھی۔ اس کے بعد وادی کاغان اور درّہ بابوسر کے راستے یہ سڑک بنی مگر یہ بھی سال میں صرف تین مہینے کھلتی تھی۔ اس پر جیپیں چلتی تھیں اور وہ بھی سن پچاس کا ماڈل۔ پھر سن ۶۹ میں قراقرم ہائی وے بنی۔ شروع میں یہ کچی تھی البتہ ٹرک وغیرہ آنے لگے۔ اور اس کے بعد پچھلے دس سال میں ہم نے بجلی دیکھی، پکی سڑکیں دیکھیں، ٹریفک دیکھا اور بڑے بڑے ہوٹل بنتے دیکھے۔"

اور کرامت اللہ صاحب سے یہ باتیں پختہ شاہراہ قراقرم کے کنارے ایک بڑے اور جدید ہوٹل کے کشادہ کمرے میں ہو رہی تھیں جس میں چینی فانوس روشن تھا اور سامنے سڑک پر تیز رفتار موٹر گاڑیاں فرّاٹے بھر رہی تھیں۔

کرامت اللہ صاحب کے بڑے بوڑھے بھی اسی علاقے کے باشندے تھے۔ ان کے بچے بھی یہیں پروان چڑھ رہے تھے۔ انہوں نے نئی اور پرانی، دونوں نسلیں دیکھی تھیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ حالات تو بدلے ہیں، یہ بتایئے کہ ذہن کا کیا حال ہے؟

"ذہن بھی بدلا ہے۔ پہلے یہاں لوگ جدید تعلیم کو گناہ سمجھتے تھے۔ علماء کہتے تھے کہ انگریزی پڑھ کر بچے خراب ہو جاتے ہیں۔ مگر اب یہ لوگ تعلیم کی طرف توجہ دے رہے ہیں۔ یقین کیجیے کہ یہاں انٹر کالج بھی بن گیا ہے۔"

کرامت اللہ صاحب نے کہا، میں نے یقین کر لیا۔ مگر ذرا دیر پہلے کسی نے مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں تعلیم پانے والے زیادہ تر بچے وہ ہیں جن کے والدین دوسرے علاقوں سے یہاں آ کر آباد ہوئے ہیں۔ یہ کون لوگ ہیں؟

وہ بتانے لگے "جی ہاں مختلف علاقوں کے لوگ باہر سے آئے ہیں۔ صوبہ سرحد، خصوصاً ہزارہ سے اور کشمیر سے بہت لوگ آئے ہیں، پھر گوجر قبائل نیچے سے آ کر یہاں آباد ہوئے ہیں۔

خود یہاں اصل باشندوں کی تین قومیں ہیں، تو اس طرح یہ ایک مکسچر ہے۔"

یہ تو آج کی بات ہے۔ پہلے کیا حال تھا۔ پاکستان بننے سے پہلے اس دور دراز خطے میں کیسی آبادی تھی یہاں؟ اُس وقت یہ مقامی باشندے کیا کرتے تھے اپنی روزی کمانے کے لیے؟ کچھ تجارت اور کاروبار کرتے تھے یہ لوگ؟

کرامت اللہ صاحب ذرا ٹھہرے۔ اپنے بھائی بندوں کے اندازِ فکر پر انہیں بھرپور تبصرہ کرنا تھا۔ پھر بولے۔ "جب اس علاقے پر ڈوگروں نے قبضہ کیا اس وقت یہاں کے بیشتر تاجر اور دکاندار ہندو تھے۔ سارا لین دین ہندو کیا کرتے تھے۔ سن اڑتالیس میں وہ چلے گئے تو بڑا مسئلہ پیدا ہو گیا کیونکہ یہاں کے باشندوں کا خیال تھا کہ دکان داری کرنا ہندو بنئے کا کام ہے۔ اسی وجہ سے باہر کے خصوصاً صوبہ سرحد کے لوگ یہاں آئے تو کاروبار چلا۔ اب تو خیر یہاں کے مقامی باشندے بھی تھوڑا بہت کاروبار کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کرامت اللہ صاحب۔ ساری دنیا سے الگ تھلگ رہنے والے ان لوگوں کو باقی دنیا کا کچھ علم ہے؟ ان میں کچھ سیاسی شعور ہے؟"

"بہت زیادہ ہے۔" اب کے وہ برجستہ بولے۔" یہ لوگ بی بی سی سنتے ہیں۔ روزانہ اخبار آتے، وہ پڑھتے ہیں۔ تعلیم تو کم ہے مگر سیاسی شعور بہت ہے۔ اس کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ یہ قبائلی معاشرہ ہے۔ قبائلی معاشرے میں سیاست کی حیثیت بنیادی ہوتی ہے کیونکہ ہر قبیلے کی دوسرے قبیلے کے ساتھ ٹکر ہوتی ہے۔ تو خواہ وہ بکریاں چراتا ہو مگر سیاست پر نگاہ ضرور رکھتا ہے۔ میں نے سارے شمالی علاقہ جات میں ملازمت کی ہے اور دیکھا ہے کہ چلاس کے لوگوں میں سیاسی شعور زیادہ ہے۔ پھر وہی بات کہ یہاں پرانی دشمنی اور انتقام کا نظام ہے جیسا کہ آپ نے تاریخ میں پڑھا ہو گا کہ عربوں میں سو سو سال تک دشمنیاں چلتی تھیں۔ یہاں پر آج تک یہی رواج ہے۔"

میں سہم گیا۔ بے شک میں نے تاریخ میں پڑھا تھا کہ عربوں میں صدیوں دشمنی چلتی تھی۔ مگر یہ بھی پڑھا تھا کہ وہ دشمن کو معاف بھی کر دیا کرتے تھے۔ یہاں پہنچتے پہنچتے وہ رواج آدھا رہ گیا۔ کہنے والے کہتے ہیں کہ ان شمالی علاقوں میں چوری چکاری نہیں، راہ گیروں کو نہیں لوٹتے، اغوا کی وارداتیں نہیں ہوتیں۔ بس اگر ہوتا ہے تو قتل۔ لوگ پرانے حساب چکاتے رہتے ہیں اور جان سے

جاتے رہتے ہیں۔

وہیں میری ملاقات عبدالعزیز صاحب سے ہوئی۔ چلاس میں ہوٹل اور ٹرانسپورٹ کا کاروبار کرتے ہیں۔ اُن کے کئی ہوٹل ہیں اور بہت سے ٹرک چلتے ہیں۔ میں یہ جاننے کے لیے بے چین تھا کہ ان کے بزرگ کیا کرتے ہوں گے؟

انہوں نے دیانت داری سے بتادیا۔ ”ہمارے بزرگ چھوٹی چھوٹی زمینداری کرتے تھے اور معمولی تجارت کرتے تھے۔ چھوٹی سی دکان داری تھی اُن کی۔ وہ کاغان کے راستے راولپنڈی سے سامان لاتے تھے اور اس زمانے میں سارا مال اسباب خچروں یا جیپوں پر آتا تھا۔ یہ راستہ سال میں صرف تین مہینے کھلتا تھا۔ بس اس دوران ساری رسد آجاتی تھی اور باقی نو مہینے وہ سامان فروخت ہوتا تھا۔ پھر کہیں جاکر درہ بابوسر کی سڑک دوبارہ کھلتی تھی تو وہ راولپنڈی جاتے تھے۔ یہ تھا ہمارا اُس زمانے کا مشغلہ۔“

میرا اگلا سوال وہی تھا جو ہونا چاہیئے۔ ”پھر یہ تبدیلی کب آئی؟ —“

”یہ تبدیلی آئی ایوب خان کے زمانے میں۔ جب یہ شاہراہ بنی تو ہمارا باقی ملک سے رابطہ قائم ہوا اور اتنی بڑی تبدیلی آئی کہ ہم سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ ہماری زندگی اور معاشرت اتنی بدل جائے گی۔ اِس ایک سڑک کی وجہ سے! یہ سڑک کھُلی تو زندگی کی ساری سہولتیں میسّر آگئیں۔ عابدی صاحب، یقین کیجیے ہم لوگ بالکل قحط کی حالت میں رہتے تھے۔ مٹی کا تیل ٹین کے کنستروں میں بھر کر بڑی مشکل سے یہاں لاتے تھے۔ اس وقت جس کے گھر میں لالٹین ہوتی تھی وہ بڑے لوگوں کا گھر سمجھا جاتا تھا۔ ۱۹۶۵ء تک یہی حال تھا جب یہ سڑک نہیں بنی تھی۔“

”لوگوں کا کھانا پینا کیسا تھا؟ —“

”بے حد سادہ۔ مکئی کی روٹی اور ساگ کھاتے تھے اور بس!“

”لباس، کپڑے، جوتے؟ —“

”نہ پوچھیئے۔ لوگ پاؤں میں چمڑا لپیٹتے تھے اور جو لوگ خوش حال تھے وہ ربڑ کی چپلی پہنتے تھے۔ ان کے کپڑے پنجاب سے آتے تھے۔ اور جب کوئی شخص لباس کا نیا جوڑا بناتا تھا تو لوگ دیکھنے جاتے تھے۔ یقین کیجئے کہ لوگ جاکر مبارکباد دیتے تھے۔ اس کے علاوہ نئے کپڑے پہننے کا دن مقرر ہوتا

تھا۔ لوگ ایک خاص دن نیا لباس پہن کر نکلتے تھے اور لوگوں سے مبارک باد لیتے تھے۔ مگر اس ایک سڑک کی وجہ سے اس زمانے کی فکر میں غیر معمولی فرق آگیا ہے۔ یہ روڈ اس علاقے کے لیے خدا کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اگرچہ اس کی فوجی اہمیت بھی ہے لیکن اس نے عام لوگوں کی زندگی پر جو اثر ڈالا ہے وہ بیان سے باہر ہے۔ بس ایک انقلاب ہے یہ روڈ، ایک بہت بڑا انقلاب!"

عبدالعزیز صاحب کا یہ فقرہ دیر تک ذہن میں گونجا کیا۔

میر عبدالخالق صاحب گورنمنٹ کالج چلاس کے پرنسپل ہیں۔ اس علاقے سے خوب واقف ہیں اور ظاہر ہے کہ تعلیم کے معاملے اچھی طرح سمجھتے ہیں۔ میں یہ جاننے کا مشتاق تھا کہ اس پسماندہ علاقے میں عورتوں کی تعلیم کا کیا حال ہے۔ میں نے میر عبدالخالق صاحب سے پوچھا کہ شہر کے اسکول میں کیسی اور کتنی لڑکیاں پڑھتی ہیں؟

" اس علاقے میں لڑکیوں کا ہائی اسکول قائم ہوا تو پسند نہیں کیا گیا لیکن چونکہ یہاں باہر سے آئے ہوئے لوگوں کی بڑی تعداد ہے اس لیے ان کی بچیوں نے اسکول جانا شروع کیا۔ بس یہ سمجھ لیجئے کہ چلاس کے ہائی اسکول کی میٹرک کی جماعت میں اس وقت دو یا تین بچیاں پڑھ رہی ہیں لیکن میں سمجھتا ہوں کہ یہ دو تین لڑکیاں یہاں کی مقامی آبادی کے لیے روشن مثال بنیں گی اور یہ لوگ بھی آہستہ آہستہ تعلیم کی طرف راغب ہونے لگیں گے۔ جہاں تک لڑکوں کا تعلق ہے، اس میں بھی غیر مقامی باشندوں نے پہل کی۔ ہزارہ، کوہستان، دیر اور سوات سے آئے ہوئے لڑکے پڑھنے لگے۔ ان کے بعد مقامی لڑکے آگے بڑھے۔ اگرچہ ان کی رفتار سست ہے مگر پہلے کی نسبت وہ مسلسل بڑھ رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا ـــ" یہ بتائیے پرنسپل صاحب کہ اس علاقے کے پرانے باشندوں کی زندگی میں تعلیم کا ابھی پوری طرح دخل نہیں۔ یہ سب کچھ ان لوگوں کے لیے نیا اور اجنبی ہے، پھر اسکولوں کالجوں میں یہاں کے نوجوانوں کا رویہ کیسا ہے، طرزِ عمل کیسا اور سلوک کیسا ہے اور تعلیم سے حال ہی میں روشناس ہونے والے یہ جوان ذہنی طور پر کیسے ہیں؟"

پرنسپل صاحب نے اپنے تجربے کا نچوڑ پیش کر دیا ـــ" میں نے ذہنی طور پر یہاں کے طالبعلموں کو بہت اچھا پایا۔ استاد کا احترام بہت کرتے ہیں۔ اگر انہیں بات اچھی طرح سمجھا دی جائے تو پوری طرح قائل ہو جاتے ہیں۔ میرا تعلق چونکہ لڑکوں سے ہے، مسائل اُٹھتے رہتے ہیں مگر جب ہم

ان کے ساتھ بیٹھ کر اچھی طرح بحث کرتے ہیں، انہیں سمجھاتے ہیں تو پھر وہ ہماری بات مان جاتے ہیں۔ میں نے دوسرے علاقوں میں بھی کام کیا ہے مگر یہ چیز بہت کم دیکھی ہے۔ چلاس کے طالب علموں پر مجھے فخر ہے کہ وہ جائز بات مانتے ہیں اور ناجائز بات پر زور نہیں دیتے۔"

میر عبدالخالق صاحب کی یہ بات اچھی لگی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ علاقے کی روایتیں ٹوٹنے میں باہر والوں کا کتنا ہاتھ ہے۔ دوسرے علاقوں کے باشندے یہاں آئے تو مقامی لوگوں کا کیا حال ہوا؟

انہوں نے کہا:" یہاں کے لوگ ایک مقامی ماحول کے اندر بند اور مقامی روایات کے پابند تھے۔ باہر کے لوگوں کے آنے بعد یہاں اُٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے اور کھانے پینے کے آداب بدلنے لگے۔ یہاں کی مقامی خوراک بدل گئی۔ اب اکثر مقامی گھروں میں وہی کھانے پکتے ہیں جو لاہور، راولپنڈی اور پشاور میں پکتے ہیں۔ اسی طرح یہاں کا مقامی لباس پٹو ہوا کرتا تھا۔ اب یہ لوگ شلوار قمیض جیکٹ اور کوٹ پہننے لگے ہیں۔ ان کے رہنے سہنے کا انداز بدل گیا ہے۔ یہاں بڑے بڑے کنبے ایک تنگ کمرے میں زندگی گزارا کرتے تھے لیکن اب انہوں نے جدید مکان بنا لیے ہیں جن میں ہر قسم کی سہولتیں موجود ہیں۔ انہوں نے باہر والوں سے بہت کچھ سیکھا ہے۔"

میں نے پوچھا "میر عبدالخالق صاحب! پُرانا زمانہ یاد ہے آپ کو؛ وہ دن یاد ہیں جب نئی تہذیب اور نئی ایجادیں پہلے پہل ان علاقوں میں پہنچیں؟"

وہ بولے " مجھے وہ وقت یاد آتا ہے جب گلگت میں پہلی سائیکل آئی تو لوگ دکانوں سے اُٹھ اُٹھ کر اُسے دیکھتے تھے لیکن آج گلگت میں بھاری ٹرک چلتے ہیں۔ یہاں چلاس سے گلگت تک ہم گھوڑے پر چار دن میں پہنچتے تھے۔ پھر جیپ آئی تو یہ سفر بارہ گھنٹے میں طے ہونے لگا۔ اور آج یہ حال ہے کہ جب شاہراہ قراقرم پر میری کار دوڑتی ہے اس میں کیسٹ بج رہا ہوتا ہے اور میں باہر راستوں پر نظر ڈالتا ہوں تو یقین نہیں آتا کہ کبھی ان راستوں پر ہم کیسی صعوبتیں اٹھاتے تھے۔ اس شاہراہ قراقرم نے چلاس میں اور شمالی علاقوں میں ایک انقلاب برپا کر دیا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ پاکستان کے دوسرے علاقوں سے ڈاک نو مہینے بعد ملتی تھی اور آج ہم راولپنڈی کا صبح کا اخبار شام پانچ بجے پڑھ لیتے ہیں اور میں سمجھتا ہوں کہ یہی شاہراہ قراقرم کی تعمیر کی سب سے

بڑی پہچان ہے۔"

پرنسپل صاحب کو سڑک اور اخبار دونوں کی اہمیت کا پورا پورا اندازہ تھا۔ وہ اس علاقے کو اور اس کے باشندوں کو خوب سمجھتے ہیں لیکن چلاس میں بسنے والوں کے سوچنے سمجھنے کے انداز پر جیسی روشنی ایک بزرگ نے ڈالی وہ بہت یاد رہے گی۔

حاجی محمد نقیر صاحب نہ صرف چلاس کے پُرانے باشندے بلکہ اس شہر کی میونسپل کمیٹی کے وائس چیئرمین بھی ہیں۔ اس روز خوب گھل مل کر باتیں کر رہے تھے اور چلاس والوں کی خوبیاں بتا رہے تھے۔

کہنے لگے "یہاں کے لوگوں کے اندر دو چیزیں پائی جاتی ہیں۔ ایک یہ کہ بڑے پکے پاکستانی ہیں۔ یہ پاکستان کو اتنا چاہتے ہیں کہ اس کی خاطر جان مال سب داؤ پر لگا دیں گے۔ دوسرے یہ کہ مرکز میں جو بھی حکومت ہوتی ہے اس کے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ ان کی ایک اور خوبی یہ ہے کہ یہاں کے لوگ پکے مسلمان ہیں۔ اپنے دینی معاملات میں بہت پکے ہیں۔ جگہ جگہ دار العلوم بنانا، ان میں اپنے بچوں کو داخل کرانا اور ان کو قرآن حفظ کرانا اور تبلیغ اور تدریس کے لیے زیادہ وقت دینا ان کے معمول میں شامل ہے۔ ہر سال یہاں چلاس میں بہت بڑا اجتماع ہوتا ہے۔ اتنا بڑا اجتماع شمالی علاقوں میں اور کہیں نہیں ہوتا۔ یہاں سے سینکڑوں لوگ تبلیغ کے لیے جاتے ہیں۔ ہمارے لوگ کوریا تک اور جاپان تک جاتے ہیں۔ اس وقت ہماری جماعت چین میں ہے۔ اس کے علاوہ ہمارے لوگ سیام (تھائی لینڈ) بھی گئے ہوئے ہیں اور تبلیغ کر رہے ہیں۔"

جب حاجی صاحب نے کہا کہ ہماری تبلیغی جماعتیں چین بھی جاتی ہیں تو میں سوچنے لگا کہ کیوں نہ جائیں، سامنے سے گزرنے والی سڑک چین ہی جاتی ہے جس پر چل کر یہ لوگ تعلیم دینے چین جاتے ہوں گے۔ پھر سوچتا ہوں کہ کاش یہ لوگ تعلیم لینے کے لیے بھی چین جائیں۔

سنتے آئے تھے کہ دائی سے پیٹ کا حال چھپا نہیں رہتا۔ اس کی تصدیق وہاں ننگا پربت کے دامن میں ہوئی۔

میں شہر چلاس کی واحد خاتون ڈاکٹر سے ملنے جا رہا تھا۔ میری جیپ پہلے خشک بلندی پر چڑھی

اور پھر سرسبز نشیب میں اُترنے لگی۔ سڑک کی دو جانب دو بستیاں تھیں۔ کسی نے بتایا کہ داہنی جانب فلاں قبیلہ اور بائیں جانب فلاں قبیلہ رہتا ہے۔ یہ ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ یہ سنا تو یوں لگا جیسے میں چکّی کے دو پاٹوں کے درمیان آگیا۔ میں نے دم سادھ لیا اور جب تک خاتون ڈاکٹر کے انگریزوں کے زمانے کے بنگلے میں نہیں پہنچ گیا، اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے رہی۔

ڈاکٹر یاسمین ممتاز اس پورے علاقے کی واحد خاتون ڈاکٹر ہیں ویسے یہاں ڈاکٹر ہونا ان کے فرائض میں شامل نہیں۔ وہ تو محض ڈپٹی کمشنر کی اہلیہ ہیں۔ کراچی کے ڈاؤ میڈیکل کالج کی تعلیم یافتہ ہیں لیکن دیکھتی ہیں کہ کسی خاتون ڈاکٹر کو اس علاقے میں آنا گوارہ نہیں اس لیے اپنے خالی وقت میں عورتوں کا علاج کرتی ہیں۔

اپنے اس عمل میں یاسمین ممتاز اس علاقے کو، اس کے باشندوں کو، خصوصاً خواتین کو اتنا جان گئی ہیں کہ واقعی اب اُن سے کچھ چھپا نہیں رہا۔

بے حد دلچسپ باتیں تھیں ان کی۔ میں نے فرمائش کی کہ چلاس اور کوہستان کی عورتوں کے بارے میں بتائیے۔ اُن کا جواب کچھ یوں تھا:

"یہ عورتیں بہت زیادہ محنتی ہیں، بے انتہا محنتی ہیں۔ ان کو گھر میں بھی کام کرنا پڑتا ہے اور گھر کے باہر بھی۔ گھر میں کھانا پکانا سب ان کے ذمّے ہے۔ اس کے بعد باہر جاکر کھیتوں میں سارا سارا دن محنت کرتی ہیں، مویشی کی بھی دیکھ بھال کرتی ہیں۔ اوپر سے یہ کہ سب سے چھوٹا والا بچہ چادر میں لپٹا ان کی پیٹھ پر سوار رہتا ہے۔ یہ رسم صدیوں سے چلی آرہی ہے کہ عورتیں رات دن مشقت کررہی ہیں اور دودھ پیتا بچہ ان کی پیٹھ سے بندھا ہوا ہے۔ خود عورتوں کا یہ حال ہے کہ جوار بوتی ہیں، اگاتی ہیں، کاٹتی ہیں۔ صبح تڑکے اٹھ کر جانوروں کو چارا دیتی ہیں۔ ان کا دودھ دوہتی ہیں۔ دودھ نکالنے کے بعد اس سے مکھن نکالتی ہیں، دہی بناتی ہیں لسّی بناتی ہیں۔ ان لوگوں کا ناشتہ بھی اسی لسّی اور مکئی کی روٹی سے ہوتا ہے۔ ایک بہت بڑی روٹی بناتی ہیں اور پورا کنبہ وہی روٹی کھاتا ہے۔ تھوڑا بہت ناشتہ خود کیا، باقی گھر والوں کو کرایا، بس اس کے بعد دن بھر کی مشقت شروع ہوجاتی ہے۔"

میں نے پھر وہ کہاوت دہرائی کہ آپ سے تو پیٹ کا حال چھپا نہیں رہتا، اس علاقے کی عورتوں کی صحت کیسی پائی آپ نے؟

وہ جھٹ بولیں: "یہاں میں نے کوئی عورت موٹی نہیں دیکھی۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ عورتوں میں موٹاپا نام کو نہیں۔ اتنی دُبلی پتلی ہوتی ہیں اور پیٹ کی جلد اتنی ملائم ہوتی ہے کہ جب پیٹ پر ہاتھ رکھتی ہوں، اندر کے سارے اعضا صاف محسوس ہوتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ سخت جسمانی محنت اور کام کرتی ہیں۔ مرد بھی کام کرتے ہیں مگر اتنا زیادہ نہیں۔ مردوں کو گھر کا کام تو کرنا نہیں پڑتا، باہر کا کام کرتے ہیں مگر وہ بھی بہت کم۔ کچھ یہاں جنگل کی ملکیت کا رواج بھی ہے۔ یہ لوگ جنگل کے مالک ہوتے ہیں جس سے کچھ پیسہ مل جاتا ہے اس لیے انہیں کمانے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ بہت سے لوگ اِدھر اُدھر سڑکوں پر پھرتے نظر آتے ہیں۔ ان سے پوچھو کہ یہ خالی گھومنے والے لوگ کون ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ ان کو محنت مزدوری کی ضرورت نہیں کیونکہ ان کو جنگل سے آمدنی ہو جاتی ہے۔ تھوڑے سے لوگ ہیں جو پڑھ لکھ گئے ہیں لیکن یا تو میٹرک پاس ہیں یا آٹھویں کلاس تک پڑھے ہوئے ہیں۔"

یاسمین ممتاز کی گفتگو کا رُخ بدلنے لگا لیکن میں ان سے عورتوں کے بارے میں کچھ جاننا چاہتا تھا۔ میں نے کہا: "چلیے چھوڑیے مَردوں کو۔ یہ بتائیے کہ دریائے سندھ کے کنارے پہاڑوں میں آباد ان عورتوں کا لباس کیسا ہوتا ہے؟"

"لباس ان کا بہت ہی پُرانے انداز کا ہے۔ چھپے ہوئے کپڑے کے بڑے بڑے گھگھرے پہنتی ہیں۔ کپڑا یہیں کا لوکل ہوتا ہے جس پر ٹھپّے کی چھپائی ہوتی ہے۔ ان کی شلواریں بہت گھیر والی ہوتی ہیں۔ تقریباً نو گز کی شلوار بنتی ہے۔ سر پر ٹوپی ہوتی ہے۔ ہر عورت کے سر پر ٹوپی ضرور ہوتی ہے۔ اس گول ٹوپی پر کشیدہ کاری ہوتی ہے۔ غریب عورتوں کی ٹوپی پر معمولی کام بنا ہوتا ہے اور امیر عورت کی ٹوپی پر چاندی کے سکّے اور موتی لگے ہوتے ہیں۔ موتیوں کا رواج بہت زیادہ ہے۔ ہر دلہن کے گلے میں موتیوں کی مالائیں بھری ہوتی ہیں۔ تقریباً بیس کے جی کے ہار ڈالتی ہیں گلے میں۔ پھر کشیدہ کاری بھی گھریلو ہوتی ہے اور بہت مشکل اور محنت طلب ہوتی ہے۔ اگر آپ دیکھیں تو حیران رہ جائیں کہ یہ عورتیں کتنا وقت لگا کر کس طرح یہ کام کرتی ہوں گی۔ میرا خیال ہے کہ پورے پاکستان میں ایسی کشیدہ کاری نہیں ہوتی۔ کبھی میرے پاس آتی ہیں اور کہتی ہیں کہ آپ کے لیے ٹوپی بنا دیں؟ میں کہتی ہوں کہ کس طرح بناؤ گی، کتنا وقت لگے گا؟ کہتی ہیں، کوئی بات نہیں،

ایک مہینے میں بن جائے گی۔"

مَیں نے ڈاکٹر صاحبہ سے پوچھا کہ یہ عورتیں بناؤ سنگھار کیسا کرتی ہیں، چاندی سونے کا یہاں کتنا رواج ہے؟

"سونے کا یہاں رواج نہیں۔ قیمتی پتھروں سے بھی یہ لوگ واقف نہیں۔ یہاں مصنوعی موتی ہوتے ہیں، وہی استعمال کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کسی میک اپ کو یہ لوگ بالکل نہیں جانتے۔ لپ اسٹک، نیل پالش، پاؤڈر اور پرفیوم سے یہ بالکل واقف نہیں۔"

"اچھا یہ بتائیے۔" مَیں بُری طرح اس گفتگو کی لپیٹ میں آگیا۔ "اچھا یہ بتائیے کہ اس علاقے میں ایک ماں کے اوسطاً کتنے بچے ہوتے ہیں؟"

"اوسطاً ایک ماں کے دس سے بارہ پندرہ تک بچے ہوتے ہیں اور ایک شوہر کی دو، تین بلکہ چار سے کم بیویاں نہیں ہوتیں۔ لڑکی کی بہت کم عمر میں شادی ہو جاتی ہے۔ وہ گیارہ، بارہ یا تیرہ کی ہوئی تو اس کی شادی کر دیتے ہیں۔ شوہر کی عمر کبھی اتنی ہی ہوتی ہے اور کبھی بڈھا ہوتا ہے۔ غریب لوگ زیادہ تر اپنی لڑکیوں کی شادی بوڑھوں سے کرتے ہیں۔ لڑکی والے شادی سے پہلے کچھ پیسے لیتے ہیں۔ جہیز دینے کا یہاں کوئی رواج نہیں البتہ شادی سے پہلے لڑکے سے رقم لیتے ہیں۔ امیر آدمی زیادہ پیسہ لیتا ہے۔ غریب آدمی تھوڑے پیسے لیتا ہے، پھر اُس سے لڑکی کو کچھ معمولی سادے کر رُخصت کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "تو آپ کیا محسوس کرتی ہیں، یہاں کے معاشرے میں عورت کی کیا حیثیت ہے؟ —"

وہ بولیں۔ "عورت کی حیثیت بہت ہی افسوسناک ہے کیونکہ تعلیم نہیں ہے۔ عورت کو تعلیم دلانا پسند نہیں کرتے۔ بس چاہتے ہیں کہ اولاد زیادہ سے زیادہ ہو۔ کہتے ہیں کہ جتنے زیادہ بچے ہوں گے اتنی ہی زیادہ جائیداد بڑھے گی — خاندانی منصوبہ بندی کی بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں۔ اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی لوگ ہیں۔ ان کی زندگی کا مذہب سے بھی کافی تعلق ہے چنانچہ کٹر مذہبی ہیں۔ بہت زیادہ اولاد چاہتے ہیں اور بچوں کو کہتے ہیں کہ یہ ہمارا مال ہے۔ مویشی کو بھی مال کہتے ہیں اور جس طرح پیسہ ہے، اسی طرح اولاد ہے۔ اگر عورت سے اولاد ہونا بند

ہوجائے تو فوراً دوسری شادی کرتے ہیں۔اگر لڑکیاں پیدا ہوں اور لڑکا نہ ہو تو پھر بھی دوسری شادی کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ جب عمر زیادہ ہونے لگتی ہے اور عورتیں بانجھ ہوجاتی ہیں تو میرے پاس آتی ہیں کہ اس حال میں بھی بچہ ہوجائے کسی طرح۔ ۴۵ سے اوپر کی ہوجاتی ہیں مگر چاہتی ہیں کہ اولاد ہوتی رہے۔"

اب مجھے بات کا رُخ مردوں کی طرف موڑنا پڑا۔" بیوی جو بیاہ کر لاتے ہیں تو کیا چاہتے ہیں، کنواری ہو یا طلاق پائی ہوئی یا بیوہ عورت بھی قبول کر لیتے ہیں؟—"

برجستہ جواب ملا—" کنواری کے ساتھ وہ بھی آجائے تو کوئی بات نہیں کیونکہ ہر وقت شادی کے لیے تیار ہیں۔ ابھی دوسری کی اب تیسری کی فکر ہے، پھر چوتھی کے لیے تیار ہیں اور اسّی نوّے کی عمر میں بھی شادی کرتے ہیں۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔"

"بوڑھوں سے کیوں بیاہ دیتے ہیں بیٹیوں کو؟—"

" بس، سمجھتے ہیں کہ فرض ادا ہوگیا اور لڑکی کی سلامتی کا بندوبست ہوگیا۔ اکثر ہمارے ملازم وغیرہ بہت غریب ہیں۔ انہیں جوان داماد نہیں ملتا تو اپنی بیٹی بوڑھوں کو دے دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ چلو شادی ہوگئی۔ بڈھا بھی لڑکی کو آرام سے قبول کر لیتا ہے اور تھوڑے سے پیسے بھی کہیں سے اکٹھا کر کے دے دیتا ہے۔"

" یہ تو شادی کی بات ہوئی۔ میاں بیوی میں اَن بَن ہوتی ہے کیا اور کیا طلاق بھی ہوتی ہے آپ کے اس علاقے میں؟"

" ہاں طلاق بھی ہوتی ہے۔ مرد بہت شکّی ہوتے ہیں کیونکہ تعلیم نہیں ہے۔ ایک ہی گھر میں اتنے اتنے لوگ رہتے ہیں۔ ذرا سوچئے کہ چار بیویاں بھی ایک کمرے میں سوجاتی ہیں اور پندرہ پندرہ بیس بیس بچے بھی اسی کمرے میں رہتے ہیں اور کمرہ دس فٹ لمبا اور آٹھ فٹ چوڑا ہوتا ہے، اس سے زیادہ نہیں۔ اس میں اتنے بہت سے لوگ سو جاتے ہیں یہاں تک کہ اپنے جانور بھی ساتھ سلاتے ہیں۔ جب علاج کے لیے میرے پاس آتے ہیں تو آپ یقین کریں کہ مجھے اپنی ناک پر اپنا ماسک خوب کس کر باندھنا پڑتا ہے۔ اتنی زیادہ بدبو ہوتی ہے کہ اگر آپ میری ڈسپنسری میں آئیں تو لگے گا جیسے اصطبل میں بیٹھے ہیں۔"

"کیا صرف جانوروں کی بو آتی ہے، مکھن کی خوشبو نہیں آتی؟—"

"ذرا سی وہ بھی آتی ہے اور آنی بھی چاہیے کیونکہ اس علاقے میں عورتیں مکھن نکالنے کے لیے بکرے کی کھال کو ہر طرف سے سی لیتی ہیں، صرف اس کی گردن کھلی ہوتی ہے۔ اس کے راستے یہ کھال کے اندر دودھ بھرتی ہیں اور پھر اس کھال کے بڑے سے تھیلے کو اپنی گردن میں ڈال کر اور کمر کے گرد لپیٹ کر یعنی اپنے پیٹ پر ٹکا کر زور زور سے دائیں بائیں ہلتی ہیں۔ بس سمجھیے جیسے ڈانس کرتے ہیں یا ٹوئسٹ کرتے ہیں، یہ خوب تیزی سے اِدھر اُدھر گھومتی ہیں۔ گھنٹے دو میں اس میں سے مکھن الگ ہو جاتا ہے اور لسی الگ ہو جاتی ہے۔ اس سے یہ لوگ پنیر بھی بناتے ہیں اور مکھن کو درخت کی چھال میں لپیٹ کر زمین میں دبا دیتے ہیں اور کافی عرصے وہیں رکھتے ہیں۔ پھر ضرورت پڑنے پر اس کو نکال کر کھاتے ہیں۔"

"اور کیا کیا کھاتے ہیں؟"

"زیادہ تر جوار کی روٹی ہوتی ہے جسے لسی کے ساتھ کھاتے ہیں، بس یہی ان کی خوراک ہے، اور کوئی خاص خوراک نہیں۔ بالکل سادہ زندگی ہے، بالکل قدرت پر چھوڑی ہوئی۔ جو پھل ہوتے ہیں وہ کھا لیتے ہیں۔ کوئی ملاوٹ یا باہر کی آمیزش نہیں ہوتی۔ تازہ ہوا میں رہتے ہیں اسی لیے صحت اچھی ہے لیکن چونکہ جانوروں کے ساتھ رہتے ہیں اور صفائی کا خیال نہیں اس لیے یہاں تپ دق اور سینے کی بیماریاں بہت ہیں۔ البتہ اعصاب کی یہاں کوئی بیماری نہیں، بلڈ پریشر کی تکلیف کسی کو نہیں۔ موٹاپا نہیں اور اس سے متعلق کوئی بیماری نہیں۔ ذیابیطس کے مریض یہاں بالکل نہیں ہوتے—"

یہ تھیں چلاس کے ڈپٹی کمشنر کی اہلیہ اور علاقے کی واحد خاتون ڈاکٹر محترمہ یاسمین ممتاز کی باتیں۔ دریا کے ساتھ اب ہم بھی آگے بڑھیں گے اور اس علاقے میں قدم رکھیں گے جو کوہستان کہلاتا ہے، جہاں لوگوں کی نگاہوں میں وحشت دیکھ کر ایک بار تو میں بھی ڈر گیا تھا۔

وحشت کی سرحد

"یہاں چالیس سال پہلے ایک قتل ہوا تھا اور اس کے بدلے میں ابھی دو تین مہینے پہلے دو قتل ہو گئے، اس کے انتقام کے طور پر۔ تو یہاں چالیس سال بعد بھی اپنا بدلہ لیتے ہیں۔ چھوڑتے نہیں ہیں۔"

اُس روز ضلع کوہستان کے ایک ڈاکٹر نے مجھ سے یہ بات کہی۔ یہ بات مجھے آج بھی یاد ہے اور شاید چالیس سال بعد بھی یاد ہو گی۔

تو یہ ہے کوہستان کا علاقہ — دریائے سندھ بلتستان سے اُتر کر، ننگا پربت کی ٹھوکروں سے بے نیاز ہو کر، گہری اندھیری گھاٹیوں سے گزر کر، چمکتے نیلے آسمان کے عکس میں خود بھی چاندی کی طرح چمکتا ہوا پاکستان کے صوبہ سرحد میں داخل ہوا تو منظر جوں کے توں رہے، دریا کی چال میں فرق نہ آیا، سڑک جتنی خطرناک تھی اتنی ہی خطرناک رہی البتہ ایک نئی خوفناک چیز نظر آئی۔ یہاں کے لوگوں کی آنکھوں میں چھپی ایک وحشت سی۔

میری جیپ ضلع کوہستان کے صدر مقام داسو میں، داخل ہوئی۔ نئی سرکاری عمارتوں کے درمیان سے گزر کر، چینی انجینئروں کے بنائے ہوئے چینی طرز کے پُل پار کر کے شہر کے بازار میں پہنچی اور ایک بڑے چائے خانے کے سامنے رکی۔

شہر کے نوجوان، کچھ نہ کرنے والے، بیکار گھومنے والے بے روزگار نوجوان جیپ کے گرد جمع ہو گئے اور مجھے غور سے دیکھنے لگے۔ یہاں تک تو غنیمت تھا۔ کچھ دیر بعد ایک دوسری جیپ آ کر رُکی۔ اس کے اندر کچھ خواتین بیٹھی تھیں۔ اب تو ان نوجوانوں کا دیکھنا مجھ سے دیکھا نہیں گیا۔ میں گھبرا کر چائے خانے کے اندر چلا گیا۔ بہت سے لوگ بیٹھے چائے پی رہے تھے۔ میں نے اپنا تعارف

کرایا۔ سب بی بی سی سنتے تھے۔ سب مجھے جانتے تھے۔ ذرا دیر بعد گھُل مِل کر باتیں ہونے لگیں۔
وہ سب اچھی خاصی اُردو بول رہے تھے البتہ قریب بیٹھے ہوئے نوجوان آپس میں علاقائی بولی بول رہے تھے۔ مَیں دھیان سے سننے لگا۔ کچھ عید کا ذکر تھا۔ بات ختم ہونے تک ان کی پوری بات میری سمجھ میں آگئی۔ عید سے پہلے کی بارشوں اور سڑکیں بند ہو جانے کا تذکرہ تھا۔ ایک نوجوان کو شکوہ تھا موسم خراب رہا۔ عید تو ہوئی لیکن مزا نہیں آیا۔

اُردو نے اس علاقے کی زبان کو اپنے رنگ میں رنگ دیا تھا۔

میں نے سوچا کہ داسو کے اس نوجوانوں سے اردو میں باتیں کر کے دیکھوں۔ ایک نوجوان سے میں نے اُردو میں سوال کیا، وہ اس کی سمجھ میں نہیں آیا۔ مجھے اپنا سوال مختصر اور سہل کرنا پڑا اور پھر جو وہ بولا تو اتنی روانی سے کہ میں حیران رہ گیا۔

میں نے پوچھا ــ "آپ جو اتنی دور اور سارے ملک سے اتنے فاصلے پر رہتے ہیں ایبٹ آباد اور پشاور جیسے شہر بہت دور ہیں، آپ اپنے آپ کو دنیا سے الگ تھلگ کٹا ہوا محسوس کرتے ہیں؟"

وہ بھولی سی صورت بنا کر بولا ـــ "جی؟ آپ نے کیا کہا؟"

میں نے ساری بات چند لفظوں میں کہہ دی ـــ "آپ کا یہاں دل لگتا ہے؟"

اب اس کا جواب سنیے: "اِس جگہ میں؟ ہاں۔ ہمارا تو یہاں بہت دل لگتا ہے کیونکہ یہ ہمارا اپنا علاقہ ہے۔ ہر آدمی اپنے اپنے علاقے کو پسند کرتا ہے۔ ہمیں ایبٹ آباد، یا پشاور یا گلگت پسند نہیں۔ ہماری پیدائش اسی جگہ ہوئی ہے۔ ہم اسی جگہ کے باشندے ہیں۔ ہم اسی علاقے میں رہتے ہیں۔ یہ ہمارے آباؤ اجداد کا وطن ہے۔ اس میں تو ہم بہت خوشی سے رہتے ہیں۔"

اب میں نے دوسرے کوہستانی نوجوان سے یہی سوال پوچھا۔ اس نے شستہ اُردو میں جواب دیا اور جہاں کہیں بے چارے کو جواب دینے میں دشواری ہوئی اس کے ساتھیوں، دوستوں، مجمع کے لوگوں یہاں تک کہ راہ گیروں نے جھٹ اس کی مدد کی۔ میں نے پوچھا کہ دنیا سے الگ تھلگ اس علاقے میں آپ کا دل لگتا ہے؟

"بالکل جی۔ لگتا ہے۔ بہت۔ کیونکہ (حالانکہ) یہ ہمارا پسماندہ علاقہ ہے۔ یہاں کچھ اتنا اچھا نہیں ہے مگر ہمارا اپنا علاقہ ہے۔"

میں نے کہا— "مگر یہاں ٹیلی ویژن نہیں۔ ویڈیو نہیں۔ سینما نہیں۔ آپ کا دل نہیں گھبراتا؟—"
جواب ملا— "نہیں۔ سینما کو ہم پسند نہیں کرتے ہیں۔ بہرحال۔ اور ہمارے علاقے میں بجلی پانی وغیرہ کا سسٹم بالکل نہیں ہے لیکن دل نہیں گھبراتا۔"
میں نے کہا "آپ کے علاقے میں تو اخبار بھی نہیں آتے —"
"آتے ہیں۔ اخبار بھی آتے ہیں۔ ہم ریڈیو بھی سنتے ہیں—"
"لیکن آپ کو سینما ناپسند ہے۔ آپ ریڈیو کو پسند کرتے ہیں؟—"
"ہاں ریڈیو پسند ہے؟"
"کیوں؟—"
سارے مجمع کے مشورے پر اس نے جواب دیا "کیونکہ ہم دنیا کے حالات جاننا چاہتے ہیں۔"
داسو کے نوجوانوں کی اس گفتگو کے بعد میں کسی سے اس شہر اور اس علاقے کے حالات جاننا چاہتا تھا۔ میں نے لوگوں سے کہا کہ ہے کوئی شخص جو مجھے کوہستان اور اس کے باشندوں کے بارے میں بتائے۔ لوگ دوڑے ہوئے قریب کی مسجد میں گئے اور شہر کے معالج، ڈاکٹر محمد امین صاحب کو بلا لائے۔ وہ خوب جانتے ہیں اپنے اس علاقے کو اور چونکہ اسی سرزمین کے باشندے ہیں اس لیے یہاں کے مردوں اور عورتوں کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے حالات کو اک ذرا جُدا زاویے سے دیکھتے ہیں۔
مجھے بتا رہے تھے کہ شہر داسو کو مقامی باشندے کیلا کہتے ہیں۔ اس کی آبادی تین ہزار ہے اور زیادہ تر لوگ تجارت، سرکاری ملازمت اور محنت مزدوری کرتے ہیں۔ وہیں چائے خانے میں ان سے گفتگو ہو رہی تھی۔ شور مچ رہا تھا۔ برتن کھنک رہے تھے اور میں پوچھ رہا تھا کہ داسو کے اس علاقے میں اس عظیم شاہراہ ریشم کے بننے سے پہلے بھی کیا اتنی رونق اور اتنی چہل پہل تھی؟
"جی نہیں۔ سڑک بننے سے پہلے یہاں شاید دو دکانیں تھیں۔ آتے جاتے لوگ یہاں قیام کرتے تھے۔ بس دو دکانوں کے سوا یہاں کچھ بھی نہیں تھا بلکہ یہ ویران جگہ تھی۔ ایک دو گھر تھے اور بس!"
"یہ کتنے برس پہلے کی بات ہے؟"
"یہ تقریباً ۲۵ برس پہلے کی بات ہے۔"

"آپ کا مطلب ہے کہ صرف چوتھائی صدی میں اس مقام کا حلیہ بدل گیا ؟ مگر دا سو سے لگا لگا جو اتنا بڑا دریائے سندھ بہہ رہا ہے، علاقے کی ترقی میں اس کا دخل ہے یا نہیں ؟ "

"جی نہیں۔ اس کی ترقی میں سب سے زیادہ دخل شاہراہِ ریشم کو ہے۔ جب سڑک یہاں سے گزر گئی تو یہ تمام ترقی ہوئی۔ اس کے علاوہ یہاں پر ۱۹۷۴ء میں جو زلزلہ آیا تھا اس کے بعد یہاں حکومت نے ترقیاتی منصوبہ شروع کیا جو کوہستان ڈیولپمنٹ پراجیکٹ یا کے ڈی پی کے نام سے مشہور تھا۔ اس میں مختلف محکمے ہوتے تھے۔ ان تمام محکموں نے یہاں ترقیاتی کام شروع کیے اور یہاں خوش حالی آ گئی۔ زلزلے کے ایک سال بعد یہاں پر ضلع بن گیا۔ اس سے پہلے دریائے سندھ کا مغربی کنارہ ضلع سوات میں شامل تھا اور مشرقی کنارہ قبائلی علاقہ تھا۔ اس کے بعد دریا کی دونوں طرف باقاعدہ ضلع بن گیا۔ یہ بات ۱۹۷۶ء کی ہے۔ زیادہ تر ترقیاتی کام اس کے بعد ہوا — کوہستان ڈیولپمنٹ پراجیکٹ ۱۹۸۲ء میں ختم ہو گیا۔ اس کا زیادہ تر عملہ بشام یا ایبٹ آباد میں ہوتا تھا۔ اس کے خاتمے کے بعد سارے محکمے یہیں آ گئے اور لوگوں کو سہولت ہو گئی۔"

ترقی کی بات ہو رہی تھی۔ میں نے ڈاکٹر محمد امین صاحب سے پوچھا کہ آپ کے علاقے میں صحت اور دوا علاج کا کیا حال ہے ؟

"صحت کے بارے میں تو یہ ہے کہ یہاں ایک دیہی مرکزِ صحت ہے جس میں ہم دو ڈاکٹر ہیں۔ اس کے علاوہ یہاں پر چھوٹے چھوٹے شفاخانے بھی ہیں جو بیسک ہیلتھ سنٹر کہلاتے ہیں۔ یہ شفاخانے پورے علاقے میں پھیلے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "ان شفاخانوں میں عملہ اور دوائیں ہوتی ہیں ؟ —"

ڈاکٹر صاحب بولے — "جی۔ لیکن یہاں کے لوگ غریب ہیں اس لیے دوا کی ضرورت زیادہ ہوتی ہے، یہ خود نہیں خرید سکتے۔ اس کے علاوہ غریبی کے لحاظ سے بیماریاں بھی زیادہ ہیں۔ مثلاً غذائیت کی کمی کی وجہ سے کئی بیماریاں ہیں۔ ایک سے دوسرے کو لگنے والے متعدی مرض بھی زیادہ ہیں۔ ان کی نسبت سے یہاں دوائیں کم ہیں۔ اگرچہ کافی دوائیں آتی ہیں، پھر بھی کم پڑتی ہیں۔"

اب میں نے موضوع بدلا — "اور تعلیم کا کیا حال ہے ؟ —"

"یہاں پر ایک ہائی اسکول ہے۔ یہ پہلے مڈل اسکول تھا اب اُسے ترقی دے کر ہائی اسکول

بنایا جا رہا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں کوئی پرائیویٹ اسکول نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "یہاں لڑکیوں کی تعلیم ہے؟"

جواب ملا — "لڑکیوں کی تعلیم کوہستان میں بالکل نہیں ہے۔ اگرچہ لڑکیوں کے اسکول جگہ جگہ بنے ہیں مگر خود داسو میں جو لڑکیوں کا اسکول ہے اس میں دس بارہ، زیادہ سے زیادہ پندرہ لڑکیاں ہیں —"

"اور گنجائش کتنی ہے؟ —"

"گنجائش تو بہت زیادہ ہے۔ تقریباً دو سو لڑکیوں کی گنجائش ہے۔"

"والدین نہیں پڑھواتے کیا؟"

"نہیں۔ یہاں لڑکیوں کو پڑھوانے کا تصور ہی نہیں ہے کیونکہ یہاں روایت یہ ہے کہ لوگ لڑکیوں کو پڑھانا معیوب سمجھتے ہیں۔ اسی لیے لوگ پسند نہیں کرتے کہ ان کی لڑکیاں اسکول میں پڑھیں بلکہ سچ پوچھیے تو لڑکوں کے بارے میں بھی ابھی تک یہی تصور تھا کہ ان کو نہیں پڑھانا چاہیے۔"

اب میں نے پوچھا — "ڈاکٹر صاحب کوہستان کی عورتوں کے بارے میں بتائیے۔ ان کی زندگی کیسی ہے؟ زندگی کے مسائل کیسے ہیں؟۔ ان کے ساتھ مردوں کا رویہ اور سلوک کیسا ہے؟ —"

وہ بولے — "کوہستان کی عورتیں بہت باپردہ ہوتی ہیں۔ وہ اپنے گھروں ہی میں رہتی ہیں اور باہر نکلنا پسند بھی نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ وہ روزے نماز کی پابند ہوتی ہیں۔ روزانہ قرآن شریف پڑھتی ہیں۔ وہ مذہبی ذہن رکھتی ہیں۔ اپنے بچوں کی پرورش میں بہت دلچسپی لیتی ہیں۔ بچوں کے علاوہ گھر والوں کا، شوہر کا، سسر کا اور سسرال والوں کا بہت خیال رکھتی ہیں البتہ تعلیم یافتہ بالکل نہیں ہیں۔"

میں نے پوچھا — "اس علاقے میں جرائم کی کیا صورتِ حال ہے؟"

انہوں نے کہا "کوہستان میں دو قسم کے جرائم بالکل نہیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی راہ گیر کو لوٹتے نہیں ہیں یا ان کی بے عزتی نہیں کرتے اور دوسرے یہ کہ چوری نہیں کرتے۔ یہ کوہستان میں عام چیز ہے کہ یہاں جو بھی باہر کا آدمی آئے وہ محفوظ ہوگا۔ یہ اس علاقے کی خصوصیت ہے۔ لیکن یہاں جو دشمنیاں ہیں وہ تو عام روایت کے مطابق ہیں۔ یہاں پرانی دشمنیاں چلتی رہتی ہیں۔ قتل اور انتقامی قتل ہوتے رہتے ہیں۔ اسی دشمنی کی وجہ سے جرائم ہوتے ہیں۔ اس میں زیادہ تر جہالت کا دخل ہے۔ جو لوگ

ان پڑھ اور جاہل ہیں ان کو اپنے اور دوسروں کے حقوق کا اتنا پتہ نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دشمنی چلتی ہے اور چالیس سال بعد بھی انتقام لیتے ہیں۔"

ڈاکٹر محمد امین صاحب بتا رہے تھے کہ چالیس سال پہلے کوئی قتل ہوا تھا اس کے انتقام کے طور پر حال ہی میں دو قتل ہو گئے ــــــ چالیس سال بعد!

سوچتا ہوں کہ آج سے چالیس سال بعد جب میرے بچے اسی دریا کے کنارے، اسی سڑک کے راستے، اسی شہر میں آئیں گے تو کیا اُس وقت بھی آج کی دو ہلاکتوں کا انتقام لیا جا رہا ہوگا یا لوگ پچھلے قتل بھلا کر تازہ بستیاں آباد کر رہے ہوں گے۔

اور پھر ایک بات اَور بھی سوچتا ہوں، بہت پریشان کرنے والی بات۔

چالیس سال بعد جب میرے بچے یہاں آنا چاہیں گے تو کیا یہ شاہراہ قراقرم یہاں یوں ہی موجود ہوگی۔ اس پر ٹریفک دوڑ رہا ہوگا۔ یا ایک ٹوٹی پھوٹی پگڈنڈی بچی ہوگی جس پر سے باربردار خچر اپنے اسباب سمیت پھسل کر نیچے دریا میں گر رہے ہوں گے۔

سوچتا ہوں کہ وہ بڑے جیالے تھے جنھوں نے ہمالیہ اور قراقرم کا سینہ تراش کر یہ شاہراہ نکالی تھی۔ اب اس کی حالت خستہ ہے۔ کہتے ہیں کہ پہلے فوج دیکھ بھال کرتی تھی، اب ہائی وے سب ڈویژن دیکھ بھال کرتا ہے۔ جو کوئی بھی کرتا ہے، اگر سڑک میں پڑنے والے گڑھوں کی بجائے بدنیت لوگوں کی جیبیں بھری گئیں تو بس یہ شاہراہ قراقرم صرف نقشے پر رہے گی۔ اور وہ جو کتنے ہی فرہاد آس پاس کے قبرستانوں میں آنکھیں موندے سو رہے ہیں، وہ سچ مچ مر جائیں گے۔

داسو کے ڈاکٹر محمد امین کی بات آج بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہے اور کاش اُن کانوں میں بھی گونجے جو قدرت نے با اختیار لوگوں کو عطا کیے ہیں۔

انہوں نے کہا تھا "ہم اس سڑک کو اُس روز سے دیکھ رہے ہیں جس روز یہ بن کر مکمل ہوئی تھی۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ پہلے یہ ایک پختہ شاہراہ تھی، اب یہ کسی گاؤں کو جانے والی کچی سڑک ہے"

مَیں اُس روز دریا کے ساتھ ساتھ چلا تو سوچتا چلا کہ یہ خود تو کیسی دلیری سے بہا چلا جا رہا ہے اور مجھ پر کتنی دہشت طاری ہے۔ سڑک خراب تھی۔ اوپر پہاڑوں سے بڑے بڑے پتھر جب چاہیں

آبشاروں کی طرح نیچے سڑک پر برس سکتے تھے اور اس بات کی کوئی ضمانت نہ تھی کہ جب میری گاڑی گزر جائے گی اس کے بعد برسیں گے۔

ایک کار دیکھی کہ اوپر کہیں ایک بڑی سی چٹان جیسے اسی کی منتظر تھی۔ کار کا نیچے آنا تھا کہ چٹان گری اور اس کی چھت پر یوں دراز ہوئی کہ کار پچک کر سپاٹ ہو گئی۔ ایک ٹرک دیکھا جس کے اوپر چٹان نہیں گری تھی بلکہ وہ خود نیچے دریا میں جا گرا تھا اور فوج والے اپنی کرینوں کی مدد سے اس کا ملبہ اوپر کھینچ رہے تھے۔ آگے شہر پٹن تھا۔ یہ فوجی جوان وہیں رہتے ہیں اور اس شاہراہ قراقرم پر اگر کہیں بُرا وقت آن پڑے تو یہی فوج والے جا کر مشکل کشائی کرتے ہیں۔

راستہ بدستور ویران تھا۔ بس کہیں کہیں کوئی اکا دکا شخص نظر آتا تھا جو سر پر کچھ اٹھائے ہوتا تھا ــــــ یا پھر بھیڑ بکریاں نظر آتی تھیں جن کا چرواہا یا گڈریا کہیں دکھائی نہ دیتا تھا۔

میرا ڈرائیور کہتا تھا کہ ہر بکری ایک ایک ہزار روپے کی ہوتی ہے۔ کہیں دس بکریاں دیکھتا تو کہتا ــــــ وہ دیکھئے صاحب، دس ہزار روپے چلے جا رہے ہیں۔ مگر شاید انہیں کوئی چراتا نہیں اس لیے چرواہا انہیں چراتا نہیں، وہ خود ہی چر لیتی ہیں۔

یہ تو مجھے یقین تھا کہ یہاں کے لوگ چوری نہیں کرتے اور مسافروں کو نہیں لوٹتے۔ اس خیال سے ذرا دیر کو جی سنبھلتا مگر پھر وہ بات یاد آتی کہ یہ لوگ قتل کرنے سے ذرا بھی نہیں گھبراتے۔ یہ سوچ کر دل کی دھڑکن کے بارے میں یہ طے کرنا مشکل ہو جاتا کہ یہ تیز ہو رہی ہے یا بند ہو رہی ہے۔

پچھلا شہر داسو خاصا بڑا تھا۔ وہاں کے لوگ سلجھے ہوئے تھے مگر اب اس ویرانے میں فضا کا سناٹا اور دریا کا شور گتھم گتھا تھے۔

پٹن نہ جانے کتنی دور تھا۔ میں نے گردن اٹھا کر بہت دیکھا۔ نظر نہ آیا۔ اور نظر آتا بھی تو کیسے۔ پٹن اس علاقے کا شاید واحد ایسا شہر ہے جو پہاڑ کی اونچائیوں پر، شاہراہ کے کنارے نہیں بلکہ ایک چھوٹی سڑک اتر کر، بہت نیچے دریا کے برابر جاتی ہے، پٹن وہاں آباد ہے۔ شاید اس علاقے کا واحد شہر ہے جو دریا کی سطح کے برابر ہونے کی وجہ سے دریائے سندھ کے پانی سے فیض اٹھاتا ہوگا۔

دریا شہر سے لگا لگا بہہ رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ دریا میں خدانہ کرے بڑی طغیانی آجائے تو پٹن کا کیا حشر ہوگا۔ یہ تو سوکھے پتے کی طرح بہہ جائے گا۔ کسی نے بتایا کہ دریا نے اسے دو چار نہیں

بیسیوں مرتبہ روندا ہے۔ لیکن بڑا سخت جان شہر ہے کہ آج بھی موجود ہے۔ اس کے باشندے بُدھ کے ماننے والے ہوتے تو کہتے کہ اِس پر گوتم کا سایہ ہے مگر آج کے لوگوں نے صدیوں پُرانی ایک مسجد کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا کہ یہ خانۂ خدا کا اعجاز ہے۔

یہ باتیں سن کر مجھے دریائے سندھ کے ان سیلابوں کا خیال آیا جو تاریخ میں رقم ہیں۔ کہتے ہیں کہ ۱۸۳۰ء کے عشرے میں ایک بڑا سا گلیشئر ٹوٹ کر دریائے شیوک میں گر گیا تھا اور اس نے دریا کا راستہ روک دیا تھا چنانچہ اس کے پچھواڑے بہت بڑی جھیل بنتی گئی اور بعد میں کچھ تو گلیشئر اور اُس کا دل پگھلا، کچھ پانی کے ذخیرے نے دباؤ ڈالا اور پھر جو پانی کا ریلا آیا تو دریائے سندھ اُبل پڑا۔ کہتے ہیں کہ دریائے کابل، جو اٹک کے مقام پر دریائے سندھ میں گرتا ہے، اُلٹا بہنے لگا اور وادیٔ پشاور میں دریا سے ایک عورت نکالی گئی تھی جو بھیڑ کی کھال پہنے ہوئے تھی اور کوئی اجنبی زبان بولتی تھی۔ ہو سکتا ہے کہ وہ بلتی ہو۔ اس صورت میں وہ دریائے سندھ میں تین سو میل بہی ہوگی۔ مگر سچی بات یہ ہے کہ اس بات کو سچ نہ سمجھنا چاہیے۔

دریائے سندھ میں بدترین تباہی ۱۸۴۱ء میں آئی تھی۔ کہتے ہیں کہ اس سے پہلے دریا کی وادی میں بہت ساری بستیاں تھیں اور خوب کھیتی باڑی ہوتی تھی۔ پھر ۱۸۴۱ء کے جاڑوں میں ننگا پربت کے دامن کا ایک پورا پہاڑ ٹوٹ کر دریا میں آرہا۔ یہ وہ جگہ ہے جہاں استور اگر سندھ میں گرتا ہے۔ پہاڑ گرنے سے دریا میں بڑا سا ڈیم بن گیا اور چھ مہینے کے اندر وادی میں ۳۵ میل لمبی ایک جھیل بن گئی جس کا دوسرا سرا شہر گلگت کو چھونے لگا۔

کچھ عرصے بعد یہ ڈیم ٹوٹا۔ لوگوں کو معلوم تھا کہ ایک نہ ایک دن یہ ہونا ہے چنانچہ وہ پہلے ہی اپنے ڈیرے اٹھا کر اونچے مقامات پر چلے گئے لہٰذا جانی نقصان تو بہت کم ہوا لیکن زمین تباہ ہو گئی اور گاؤں دیہات بہہ گئے۔ سندھ کے زیریں علاقوں میں لوگ اس سیلاب کے لیے تیار نہ تھے۔ وہاں اب تک یہ داستان مشہور ہے کہ ایک مرتبہ پہاڑوں کی طرف سے بے حد اونچی لہر آئی تھی۔

۱۸۵۸ء میں بھی دریائے گلگت یا شاید ہنزہ میں ایسا ہی ڈیم بن گیا تھا۔ وہ جب ٹوٹا تو تین سو میل نیچے تک دریا صرف ایک دن میں نوّے فٹ اونچا ہو گیا تھا۔

وقت گزرنے کے ساتھ یہ خطرے ختم نہیں ہوئے ہیں۔ انگریزوں نے نگرانی کا نظام قائم کیا

تھا اور پاکستان کے ہوائی جہاز آج بھی خطرناک مقامات پر نگاہ رکھتے ہیں اور کوئی گلیشیر دریا میں گر جائے تو اسے بم یا بارود سے اڑا دیا جاتا ہے۔

ہاں تو پٹن قریب آ گیا۔ میں نے اخبار میں اس کا نام پڑھا تھا کیونکہ یہیں کسی عورت کو صدیوں پرانا سونے کا ہار ملا تھا کہ انسان کی گردن اس کے بوجھ کی متحمل نہیں ہو سکتی۔

میری جیپ شہر میں داخل ہوئی۔ عجیب شہر تھا، مکان تھے، دفتر تھے جن کے باہر بورڈ لگے تھے، سڑکیں تھیں، چار دیواریاں تھیں، بیرکیں تھیں، ہیلی پیڈ تھا مگر لوگ نہیں تھے۔ جب پٹن کا تھانہ آیا تب کچھ صورتیں نظر آئیں، ایک سائیکل سوار دکھائی دیا، ایک راہ گیر بھی گزرا۔

تھانے میں میری ملاقات علی اکبر صاحب سے ہوئی۔ خود مانسہرہ کے باشندے ہیں لیکن تقریباً بارہ سال سے یہاں کوہستان کے چھوٹے بڑے تھانوں میں ان کی تعیناتی رہی ہے اور اس علاقے کے لوگوں کو اور ان کے طور طریقوں کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح کوئی پولیس والا جان سکتا ہے۔

علی اکبر صاحب ضلع کوہستان کی تحصیل پٹن کے اس صدر مقام کے تھانے میں محرر ہیں اور میں تصور کر سکتا ہوں کہ اپنی بارہ برس کی ملازمت میں انہوں نے قتل کے کتنے مقدمے تحریر کیے ہونگے۔ اُس روز جوشِ خطابت میں انہوں نے جو کچھ کہا اس پر مشتاق احمد یوسفی کی وہ بات یاد آ گئی کہ ہم نے عالمِ اسلام میں آج تک کسی بکری کو طبعی موت مرتے نہیں دیکھا۔

علی اکبر صاحب پولیس والے ہوتے ہوئے بھی سادہ لوح اور صاف گو ہیں۔ مجھ سے گفتگو ہو رہی تھی۔ کہنے لگے:

"یہاں کے لوگ نمازی ہیں، پرہیزگار ہیں، مگر بیان لکھواتے ہوئے غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔ سخت قسم کے جفاکش لوگ ہیں، اچھے ہیں، خوش اخلاق اور مہمان نواز بھی لیکن اگر آپ اوپر پہاڑوں میں چلے جائیں تو جنگلوں میں کچھ وحشی نما انسان بھی ملیں گے۔ اندر جنگلوں میں بعض لوگ انسانیت سے ناواقف ہیں۔ کچھ تو ایسے ہیں جنہوں نے آج تک سڑک اور موٹر گاڑیاں بھی نہیں دیکھیں۔ وہاں قتل اور اقدام قتل کی وارداتیں بہت زیادہ ہوتی ہیں۔ یہاں نیچے کے لوگ تو باقی دنیا کو دیکھ کر مہذب ہو گئے ہیں۔ لیکن وہاں پہاڑوں کے بعض لوگوں کے لیے قتل کرنا کوئی خاص بات نہیں

ہے، عام بات ہے۔"

میں نے علی اکبر صاحب سے پوچھا "یہ بتائیے کہ یہ سڑک نکلنے کے بعد ان لوگوں کی تہذیب اور ان کے تمدن میں کچھ فرق آیا ہے؟—"

وہ بولے —" ہاں جی۔ ان لوگوں میں بہت فرق آیا ہے۔ یہ سمجھئے کہ ایک روپے میں آٹھ آنے کا فرق آچکا ہے۔"

میں نے پوچھا —" تعلیم کا اب کیا حال ہے؟—"

کہنے لگے "جگہ جگہ حکومت نے اسکول بنائے ہیں، ٹیچر رکھے ہیں، یہاں مہذب علاقے میں تو خیر ہے مگر دور دراز علاقوں میں استاد صحیح طریقے پر ان لوگوں پر کنٹرول نہیں کر سکتے۔"

"کیوں؟—"

خالص پولیس کی زبان میں جواب ملا "کیوں کہ اگر استاد بچے پر ذرا سختی کرتے ہیں تو بچے کے والدین استاد سے آمادۂ فساد ہوتے ہیں۔"

میں نے علی اکبر صاحب سے پوچھا کہ جنگلوں اور پہاڑوں کے جن علاقوں کی آپ بات کر رہے ہیں اور جہاں ہمارا پہنچنا دشوار ہے اور جہاں پولیس والے ہی پہنچ سکتے ہیں وہاں لوگوں کی گزر بسر کیسے ہوتی ہے، وہ روزی کیسے کماتے ہیں؟

علی اکبر صاحب اپنے بے تکلفانہ انداز میں بولے —" یارا جی۔ یہ لوگ اپنے جنگل فروخت کرتے ہیں۔ اسی طرح کچھ حکومت کے فنڈ ہوتے ہیں جو ان لوگوں پر خرچ ہوتے ہیں۔ کچھ ان کے اپنے جنگل ہوتے ہیں جنہیں ٹھیکیدار محکمے کی معرفت خرید لیتے ہیں۔ ان لوگوں کے پاس پیسہ تو کافی ہے —"

پیسے پر یاد آیا کہ قدیم زمانے میں بھی یہ علاقہ مالدار رہا ہوگا تبھی تو میں نے اخباروں میں پڑھا تھا کہ چند برس پہلے یہاں ہزاروں سال پرانا سونے کا اتنا بڑا اور وزنی ہار ملا تھا کہ جس کے گلے میں ڈال دیا جائے وہ ہار کے بوجھ سے جھک کر کمان ہو جائے۔ میں نے علی اکبر صاحب سے پوچھا کہ اس کا کیا قصہ تھا؟

"جی دو سال پہلے ایک بڈھی جیسی غریب عورت تھی تو اس کو ۱۴ کیلو وزنی سونے کا ہار

ملا۔ بعد میں میرا خیال ہے کہ آثار قدیمہ والے وہ ہار لے گئے یا پھر وہ حکومت کے کھاتے میں چلا گیا۔ سنا ہے کہ کئی صدی پرانا تھا اور ۱۴ کیلو سے بھی کچھ اوپر تھا۔ انسان کی گردن اس کا وزن نہیں اُٹھا سکتی۔"

میں نے علی اکبر صاحب سے کہا کہ آپ پورے کوہستان کے تھانوں اور پولیس چوکیوں میں کام کرتے رہے ہیں۔ آپ ایسے ایسے علاقوں میں پہنچے ہوں گے جہاں ہم، ہماری نگاہ اور ہمارا تصوّر تک نہیں پہنچ سکتا۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟

جواب ملا ــــ "آپ نے غاروں کے اور پتھر کے زمانے کے انسان کی تاریخ پڑھی ہوگی۔ کہیں کہیں تو لوگ آج بھی ویسی ہی زندگی گزارتے ہیں۔ بعض لوگ اسی قدیم زمانے کی طرح کھانا پینا رہنا سہنا کرتے ہیں۔ ایسے ایسے لوگ ہیں جنھوں نے آج تک کسی ٹرانسپورٹ پر سفر بھی نہیں کیا ہے۔"

میں نے پوچھا ــــ "سنا ہے وہ لوگ غسل بھی نہیں کرتے؟ ــ"

"جی نہیں۔ بعض لوگ سال میں ایک دو دفعہ یا شاذو نادر ہی غسل کرتے ہیں۔ یہ میں ہر ایک کی نہیں، بعض لوگوں کی بات کر رہا ہوں۔"

"اچھا۔ ان بعض لوگوں کا اپنی عورتوں کے ساتھ کیسا رویہ ہوتا ہے؟"

"دیکھئے ــــ اکثر تو سلجھے ہوئے لوگ ہیں لیکن بعض ایسے ہیں کہ ان کی عورتیں غسل کر لیں یا صاف کپڑے پہن کر کسی سے بات کر لیں تو یہ بُرا مناتے ہیں کیونکہ شکّی مزاج ہوتے ہیں۔ یہ لوگ عموماً تین تین چار چار شادیاں کرتے ہیں۔ عورتوں کو کوئی خاص حقوق نہیں دیئے جاتے کہ وہ اپنی مرضی سے کچھ کر لیں۔ انہیں گھر والوں کی مرضی پر چلنا پڑتا ہے۔"

میں نے پوچھا ــــ "جو لوگ چار چار شادیاں کرتے ہیں ان کے اوسطاً کتنے بچے ہوتے ہیں؟"

"بچے ان لوگوں کے بہت کم ہوتے ہیں کیونکہ ان کی عورتیں رات دن مشقت کرتی ہیں اور بری طرح تھکی ہوئی ہوتی ہیں اور یہ لوگ خود ڈیروں میں جسے ہم بیٹھک کہتے ہیں، وہیں رہتے ہیں۔ گھر کا خیال بہت کم رکھتے ہیں اور رائفل اٹھائے دشمن کی تاک میں رہتے ہیں۔"

"اور بچے؟ وہ کیا کرتے ہیں؟"

"وہی جو والدین کرتے ہیں۔ لڑکے انتظار کرتے ہیں کہ جلدی سے بڑے ہوں اور باپ دادا

کے دشمن سے بدلہ لیں۔"

"میں نے سنا ہے کہ وہاں پہاڑوں پر اور جنگلوں میں کوئی مرد قتل کر دیا جائے تو اس کی بیواؤں کو خاندان کے دوسرے مرد اپنے نکاح میں لے آتے ہیں۔ کیا ایسا ہوتا ہے؟"

"جناب۔ اگر ایک بھائی قتل ہو جائے تو اس کا وارث، جسے میراث کا حق دار کہا جاتا ہے تو وہ مقتول کی عورت کو میراث سمجھ کر اس سے شادی کر لیتا ہے۔"

میں نے پوچھا — "وہاں پہاڑوں کے لوگ بھی روزے نماز کے پابند ہوتے ہیں یا نہیں؟"

فوراً جواب ملا — "روزے نماز کی تو اتنی پابندی کرتے ہیں کہ پورے پاکستان میں کوئی نہیں کرتا ہوگا مگر جب بیان لکھواتے ہیں تو غلط بیانی سے کام لیتے ہیں۔"

یہ تھا ایک پولیس محرّر کا بیان۔

اچھا آیئے اب یہی ساری باتیں ایک بڑے عالم اور تاریخ دان سے پوچھیں اور دیکھیں کہ خود میری وہ بات کہاں تک درست ہے کہ علمی گفتگو کا کچھ اور لطف ہوتا ہے۔ مَیں نے اسلام آباد میں جناب احمد حسن دانی سے پوچھا کہ کوہستان میں یہ کون اور کیسے لوگ ہیں جو برسوں نہیں نہاتے اور لباس نہیں بدلتے۔ وہ ہنس کر بولے:

"ایک تو میں آپ کی یہ بات نہیں مانتا کہ وہ برسوں نہیں نہاتے اور لباس نہیں بدلتے۔ وہ نہاتے بھی ہیں اور نیا لباس بھی پہنتے ہیں لیکن وہاں سردی زیادہ ہوتی ہے چاہے وہ سوات کوہستان کا علاقہ ہو یا انڈس کوہستان ہو۔ کوہستان کے دو حصے ہیں۔ ایک ضلع سوات کے اندر اور دوسرا دریائے سندھ کے دونوں کناروں پر۔ میرا خیال ہے کہ آپ کا سوال انڈس کوہستان کے متعلق تھا تو وہاں سردی اتنی زیادہ پڑتی ہے کہ اور گرم پانی کا حصول اتنا مشکل ہوتا ہے کہ نہانا ان کی زندگی کا معمول نہیں رہتا۔ ہم گرمی کی وجہ سے متواتر نہاتے ہیں، وہاں نہانے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ لیکن وہ کبھی کبھار ضرور نہاتے ہیں۔"

مجھے مزید سوال پوچھنے کی ضرورت نہیں پڑی۔ علم کا دریا خود ہی بہہ نکلا اور دانی صاحب بتاتے گئے: "یہ لوگ جنہیں ہم کوہستانی کہتے ہیں پہلے ان کے نام مختلف تھے۔ کوہستانی تو جدید لفظ ہے۔ انگریزوں کے زمانے میں اس علاقے کو یاگستان کہا کرتے تھے یعنی غیر انتظامی علاقہ۔

یہاں کوئی انگریز جا نہیں سکتا تھا۔ یہاں کوئی خاص ایڈمنسٹریشن نہیں تھا۔"

اس کے بعد دانی صاحب نے بتایا۔" ان لوگوں کی جو زبان ہے اس کو آج تک ہم دارد ک زبانوں میں شمار کرتے ہیں۔ یہ پشتو سے مختلف ہے اور شینا سے بھی مختلف ہے۔ اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس علاقے میں بہت سی زبانیں بولی جاتی ہیں لیکن اُن سب کو ہم دارد ک گروپ میں شمار کرتے ہیں اور خیال کیا جاتا ہے کہ ان لوگوں کا تعلق بھی درد قوم سے رہا ہوگا ـــ اب آپ پوچھیں گے کہ درد کون ہیں ؟ ـــ"

دانی صاحب نے ہمارا کام آسان کر دیا۔ ہمارا سوال بھی خود پوچھا اور خود ہی جواب دے دیا ـــ" درد ایک لفظ ہے جو سنسکرت کتابوں میں ملتا ہے اور ویسٹرن کلاسیکل کتابوں میں بھی یہ لفظ ملتا ہے، خاص طور پر دردائی کے نام سے۔ ہیروڈوٹس کی کتاب میں یہ نام آتا ہے۔ یہ لفظ کہاں سے نکلا، یہ معلوم نہیں۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ یہ لفظ دُرد سے نکلا ہے جس کے معنی ہیں چور چکار اور ڈاکو ـــ بہرحال یہ لوگ خود اپنے لیے یہ لفظ کبھی استعمال نہیں کرتے۔ کوئی دردائی باشندہ اپنے آپ کو درد نہیں کہتا۔ صرف غیر ملکی ان کو درد کہتے ہیں۔ اسی نام سے یہ لوگ دو ہزار سال سے آباد ہیں۔ ان میں گلگتی بھی شامل ہیں۔ ان کے اندر ہُنزہ کے لوگ بھی شامل ہیں، انڈس کوہستان کے لوگ اور سوات کوہستان کے لوگ بھی شامل ہیں گو کہ ان کی زبانیں ایک دوسرے سے مختلف ہیں۔"

احمد حسن دانی صاحب کی باتیں ختم ہوئیں مگر ہمارا سفر جاری رہا۔ ہم داسو اور پٹن سے آگے بڑھے اور جوں ہی نالہ ڈُبیر پار کیا، دیکھا کہ لوگوں کی آنکھوں سے وحشت جاتی رہی۔

ہم نے اپنے پاؤں پہاڑی نالے کے جھاگ اڑاتے سرد پانی میں ڈال دیے اور آنکھیں بند کر دیں۔

اپنی۔

عورتیں ہماری، مسیحا اُن کے

آپ نے کبھی دودھ کی نہر دیکھی ہے ؟

میں نے دیکھی ہے۔

دریائے سندھ کے کنارے کنارے چلتے ہوئے چینی طرز کا ایک پل نظر آیا۔ اس پر لکھا تھا، نالہ ڈُبیر۔

اور پہاڑوں کے اندر سے برآمد ہونے والے نالے کا پانی چٹانوں سے ٹکرا کر جھاگ ہوا جا رہا تھا۔ بالکل یوں لگا جیسے دودھ اُبلا پڑ رہا ہو۔ دونوں طرف لوگوں نے پتھروں کی دیواریں اٹھا کر زمین کے زینے سے بنا دیئے تھے۔ جن پر فصلیں اُگی تھیں اور لمبے لمبے اونچے درخت اتنے گھرے ہرے تھے کہ دور سے کالے نظر آتے تھے۔

ایسے دلکش پہاڑی نالے کے پاس رہنے والے بعض لوگوں نے اپنے مکان نیچے نہ صرف نالے کے کنارے بلکہ پانی کے درمیان دھری چٹانوں کے اوپر اس طرح بنا لیے تھے کہ کہیں سفید پانی دہلیزوں کو چھو رہا تھا اور کہیں فرش کو۔ میں نے سوچا کہ رات کو ان مکانوں میں سونے والوں کو غضب کی لہروں اور ان کے شدید تھپیڑوں اور بلا کے شور کے باوجود کیسی اچھی نیند آتی ہو گی۔

اس چھوٹی سی بستی کا نام رانگیلا تھا۔ نالہ ڈُبیر پار کرتے ہی رانگیلا کا بازار آگیا۔ سودے سلف کی دکانیں، مسافر خانے، چائے خانے اور درزیوں، حجاموں، مستریوں اور جنت سازوں کی دکانیں اور بازار میں خالی خولی گھومتے ہوئے لوگ ہر جانب نظر آئے۔ میری جیپ رُکی تو سارا بازار رک گیا۔ رانگیلا کے بچوں اور جوانوں نے جیپ کو گھیر لیا۔ میں ان کے چہرے دیکھ کر حیران رہ گیا۔

بھورے بال، کھلی رنگت، موٹے مگر گلابی ہونٹ۔ چوڑی ناکیں اور کرنجی آنکھیں۔ میرے گرد بچے نہیں، ایک پوری آریائی نسل کھڑی تھی۔ شاید یہی تھے وہ لوگ جو وسطی ایشیا اور ترکستان کی طرف سے اتر کر نیچے ہندوستان کے میدانوں میں آئے ہوئے ہوں گے۔

بے شمار لوگوں نے دعوت دی "آیئے صاحب، چائے پی لیجئے" اور پھر اچھا بھلا ہجوم مجھے سامنے چائے خانے میں لے گیا۔ وہاں میری ملاقات ایک ڈرائیور سے، ایک باخبر باشعور شہری سے، پی ڈبلیو ڈی کے ایک ٹھیکیدار سے، ایک چھوٹے سے دکان دار سے اور اوپر پہاڑوں پر جو جنگل کھڑے ہیں ان کے ایک محافظ محمد فقیر سے ہوئی۔ میں ان سے باتیں کر رہا تھا۔ پس منظر میں نالہ شور مچا رہا تھا جو شاید صرف مجھے سنائی دے رہا تھا۔ یہ لوگ تو عادی تھے اس شور کے۔

میں نے محمد فقیر سے پوچھا کہ وہاں اوپر آپ جنگلوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ کیا جنگلوں کو کوئی خطرہ ہے؟

"خطرہ تو نہیں ہے مگر یہ قومی خزانہ ہے۔ بہر حال بچانا ہے اِسے" محمد فقیر کو محکمہ جنگلات کے پوسٹروں کی عبارت زبانی یاد تھی۔

میں نے پوچھا "کیا لوگ چوری چھپے درخت کاٹتے ہیں؟"

"نہیں، چوری چھپے تو نہیں کاٹتے لیکن بعض لوگ قانون سے واقف نہیں ہیں وہ اس طرح کے کام کرتے ہیں"

"آپ صرف موجودہ درختوں کو بچاتے ہیں یا نئے درخت بھی لگاتے ہیں؟"

"نئے درخت بھی لگاتے ہیں۔ یہاں جگہ جگہ نرسریاں ہیں جہاں پودے اگائے جاتے ہیں۔ زمین تیار کی جاتی ہے جہاں پھر شجر کاری ہوتی ہے۔ یہ کام ہر موسم میں ہوتا ہے اور بلا ناغہ ہوتا ہے"

محمد فقیر کی باتیں سن کر میں نے اوپر پہاڑوں پر نگاہ ڈالی۔ چٹانوں کے پچھواڑے جنگل ہی جنگل کھڑے تھے اور چھدرے بادل ان میں تیر رہے تھے۔ میں نے پوچھا "ان جنگلوں میں درند اور پرند بھی ہیں؟"

"جی، بہت ہیں"

"کون کون سے؟"

"مثلاً مرغ زریں ہے۔ اس کی مونث شان ہے۔ جنگلی بھیڑ ہے۔ مارخور ہے۔ اس طرح کافی جانور ہیں۔ بعض کے تو ہمیں نام بھی نہیں معلوم۔"

میں نے پوچھا — "کیا لوگ چوری چھپے مارتے ہیں ان کو؟"

محمد فقیر لوگوں پر الزام دھرنے کے قائل نہیں۔ جھٹ بولے۔ "نہیں، چوری چھپے تو نہیں مارتے لیکن لوگ قانون سے ناواقف ہیں۔ اور خاص طور پر جہاں قانون کے ہاتھ بہت کمزور ہوں وہاں پر یہ کام ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یقین کیجئے کہ بعض مقامات ایسے ہیں جہاں محکمے کا آدمی پہنچ ہی نہیں سکتا۔ ہزاروں فٹ کی اونچائی ہے۔ وہاں برف ہی برف ہے۔ گلیشئر ہیں اور طوفان آتے رہتے ہیں۔"

اتنی دور دراز آبادی میں ایک سادہ لوح شخص کی زبان سے قانون کے ہاتھ کمزور ہونے کی بات سُنی تو میں نے اُٹھ کر محمد فقیر کو گلے سے لگا لیا۔

ان کے برابر تنومند اور خوش شکل شاہ نذر بیٹھے تھے۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟

"ہم ڈرائیور ہیں۔ ڈاٹسن چلاتے ہیں۔ پسنجر سنجر لے جاتے ہیں۔"

"کہاں تک؟ —"

"نیچے بشام تک اور اوپر ہنزہ تک۔"

"اور کرایہ کتنا لیتے ہیں —"

"دونوں طرف پانچ روپے —"

"ذرا مجھے یہ بتائیے شاہ نذر صاحب۔ آپ تو صبح و شام اس شاہراہ ریشم پر سفر کرتے ہوں گے۔ اس سڑک کی حالت پہلے کیسی تھی اور اب کیسی ہے؟ —"

"پہلے تو ٹھیک تھا لیکن اب بہت خراب ہوگیا ہے۔ بارش ہوتی ہے تو اوپر سے پہاڑ گرتا ہے۔ پہلے چائنا والوں نے ٹھیک رکھا تھا۔ ان کے چلے جانے کے بعد روڈ کی مرمت کا کوئی پروگرام نہیں ہے۔ فوج والے کبھی ٹھیک کر دیتے ہیں لیکن ان کے پاس بھی پوری مشنری نہیں ہے۔ ابھی کچھ روز ہوئے موٹر گاڑیوں کی ریس ہو رہی تھی۔ وہ ساری گاڑیاں گلگت میں پھنس

گئیں کیونکہ ادھر بارش ہونے سے یہ روڈ جگہ جگہ سے بند ہوگیا تھا۔ رات رات بھر سلائیڈنگ ہوتا تھا۔ اتنے زیادہ کام کرنے والے بھی نہیں تھے۔ مشینری بھی نہیں تھی۔ بڑی مشکل سے راستہ کھُلا ــــ"

شاہ نذر نے اپنی شاہراہ کی حالت کا نوحہ ختم کیا تو میری نگاہ بائیں جانب بیٹھے ضابط خان پر پڑی۔ چہرے سے نظر آتا تھا کہ سمجھ دار اور باشعور ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں کوہستان میں اور اس نالہ دبیر کے آس پاس رہنے والے لوگ عام طور پر کیا کرتے ہیں؟

"لوگ زمیندارہ کرتے ہیں اور بعض لوگ دکانداری بھی کرتے ہیں۔ اس بازار میں باہر سے آئے ہوئے لوگ زیادہ ہیں۔ مثلاً سوات چار باغ کے لوگ یہاں زیادہ ہیں۔ اپنے کوہستان والے تھوڑے ہیں۔ یہ لوگ تجارت مجارت نہیں جانتے۔ بس زمیندارہ کرتے ہیں اور جنگل کاٹ کر بیچتے ہیں۔"

جس وقت چائے خانے میں یہ باتیں ہو رہی تھیں، چائے خانے کے در پر نوجوانوں کا اتنا بڑا مجمع تھا کہ اندر اندھیرا ہوگیا تھا۔ میں نے ضابط خان سے پوچھا کہ رانگیلا کے نوجوان خالی وقت میں کیا کرتے ہیں؟

"نوجوان؟۔ بس فضول پھرتا ہے۔"

ضابط خان نے کوہستان کے بارے میں بہت سی دلچسپ باتیں بتائیں۔ میں نے کہا کہ یہاں سب سے الگ تھلگ ان اونچے پہاڑوں پر سیاست کا کیا حال ہے۔ یہاں با اثر لوگ کون ہیں؟۔ انہوں نے دو قدیم خاندانوں کا ذکر کیا۔ کہنے لگے:

"کوہستان دو حصّوں میں تقسیم ہے۔ ایک حصّے میں ملک سیّد احمد اور دوسرے میں ملک علیم اللہ کے خاندان با اثر ہیں۔ یہ سلسلہ والئ سوات کے وقت سے چلا آرہا ہے۔ ایک خاندان کا تعلق ایک پارٹی سے ہے تو دوسرے خاندان کا تعلق دوسری پارٹی سے۔ اب ملک علیم اللہ کا لڑکا ایم پی ہے اور منسٹر ہے۔ ملک سید احمد کا لڑکا پیپلز پروگرام میں ایڈمنسٹریٹر ہے۔ اس سے پہلے وہ ضلع میں پارٹی کا صدر تھا۔ وہ دونوں ڈبیر کے ہیں۔"

میں نے پوچھا ــــ "ڈبیر میں کیا سیاسی سرگرمیاں زیادہ ہیں؟"

وہ بولے ــــ "بہت زیادہ ہیں کیونکہ ضلع کوہستان کے بڑے جو ہیں وہ دونوں دبیر میں ہیں۔ یہ

دونوں خاندان قدیم ہیں۔ ان ہی کی وجہ سے یہاں سیاست بہت ہے ۔"

گفتگو جاری تھی۔ باہر دھوپ چمک رہی تھی۔ دھوپ کے اور ہمارے درمیان بیسیوں نوجوانوں کے سیاہ سر تھے اور نالے کا شور تھا۔ میرے سامنے پیالی سے طشتری میں انڈیل کر چائے پینے والے عبدالودود بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کیا کرتے ہیں؟۔

"ہم تو پی ڈبلیو ڈی میں ٹھیکے داری کا کاروبار کرتے ہیں"

"ان سڑکوں اور پُلوں کی مرمت سے تعلق ہے آپ کا؟ ۔"

"جی جناب ۔"

"مجھے بتایئے کیا حال ہے سڑکوں کا؟ ۔"

"پہلے کی نسبت بہت خراب ہے۔ اور آپ تو یہ بڑی سڑکیں دیکھ رہے ہیں یہ تو بہت غنیمت ہیں۔ چھوٹی سڑکوں کی حالت نہ پوچھیئے۔ ان پر تو کوئی توجہ نہیں دیتا۔ سڑکیں ہیں مگر صحیح تعمیرات کا پروگرام سیٹ نہیں ہے ۔"

انہوں نے سچ ہی کہا ہوگا۔ بڑی سڑکوں کا جب یہ حال ہے تو گاؤں دیہات کو جانے والی چھوٹی سڑکوں کی کیا دُرگت بنی ہوگی۔ میرے قیاس نے بھی عبدالودود کی بات حرف بہ حرف دُہرا دی۔

چائے خانے کے سامنے لوگوں کے مجمع پر ایک نگاہ ڈالی۔ ایک نوجوان نے بڑے تپاک سے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے بھی گرم جوشی سے ہاتھ ملایا۔ اس کا ہونہار چہرہ اچھا لگا۔ میں نے پوچھا۔

"آپ نے تعلیم پائی ہے؟ ۔"

"نہیں۔ تعلیم نہیں ہوئی میری ۔"

"کیا نام ہے آپ کا؟ ۔"

"عمر خان ۔"

"تعلیم نہیں پائی تو آپ کیا کرتے ہیں رانگیلا میں؟ ۔"

"یہاں دکان کا کاروبار کرتے ہیں ۔"

"کتنا کما لیتے ہیں مہینے بھر میں؟"

"مہینے میں ہزار بارہ سو روپے ۔"

"ہزار بارہ سو کافی ہیں آپ کے لیے ؟—"

"ہاں—کافی ہیں—گزارا ہو جاتا ہے—"

"مگر آپ نے تعلیم کیوں نہیں پائی۔ چہرے سے تو آپ اتنے ہونہار لگتے ہیں"

" بس کیا کریں۔ ادھر کوہستان میں لوگ لڑکوں کو پڑھاتے نہیں کیونکہ ادھر کوئی خاص شوق نہیں ہے تعلیم کا—چھوٹے لڑکے بازار میں ایسے ہی پھرتے ہیں۔ یہاں تو بازار کا ماحول ہے۔ ہم لوگ تعلیم سے مجبور ہیں۔ اور بس' پھر گزارا ہوتا ہے—"

گزارا۔

بس یہی ان کا آغاز ہے، یہی ان کا انجام۔ ان لوگوں کی فکر' ان کے جذبے' ان کے حوصلے بس اسی ایک چھوٹے سے لفظ پر آ کر رُک جاتے ہیں۔

اب میں نالہ ڈُبیر سے آگے چلا۔

سڑک کبھی دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر چلی جاتی تو بائیں کان میں لہریں گونجتیں اور کبھی پُل پار کر کے بائیں کنارے پر آجاتی تو دریا کا شور داہنے کان میں بھر جاتا اور اونچے پہاڑوں سے اترنے والی اور گہری وادیوں سے اٹھنے والی ایسی شفاف ہوا کہ جسے نہ کسی انسان نے ہاتھ لگایا ہو نہ کسی جن نے، تن بدن میں اُتر جاتی اور یوں لگتا کہ اگر فردوس روئے زمیں پر ہے تو یہیں ہے۔

چلتے چلتے ایک جگہ سڑک کے کنارے بستی کے آثار نظر آئے یعنی خود بستی اور اس کے مکان تو دکھائی نہیں دیئے، وہ کہیں چٹانوں کی آڑ میں ہوں گے۔ لیکن بستی والوں کے بچے سڑک کے کنارے کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر میں نے اپنی جیپ رکوائی اور مجھے دیکھ کر وہ بچے سر پر پاؤں رکھ کر بھاگے۔ صرف تین نوعمر لڑکے کھڑے رہے۔ میں ان کے پاس گیا۔ ان سے باتیں کیں۔ تب پتہ چلا کہ اس سارے غول میں بس یہی تین لڑکے ہیں جو اسکول جاتے ہیں اور تعلیم پاتے ہیں۔ باقی سارے جو وحشی ہرن بن کر ہوا ہوئے وہ اَن پڑھ تھے۔ خیر، تو تعلیم یافتہ بچوں کے رویئے سے خوش ہو کر میں نے انہیں انعام دینا چاہا اور اپنی جیب سے سنگتروں کا ایک تھیلا نکال کر ان کے ہاتھوں میں تھما دیا۔ اگلے ہی لمحے چٹانوں کی اوٹ سے وہ سارا غول دوبارہ نمودار ہوا اور

جھپٹ کر سنگتروں پر ٹوٹ پڑا۔ جب میری جیپ روانہ ہوئی تو منظر یہ تھا کہ لڑکے ایک دوسرے سے وہ سنگترے چھین رہے تھے اور کچلے ہوئے سنگتروں کا رس ان کی انگلیوں سے ٹپک رہا تھا۔

مگر دلچسپ بات یہ تھی کہ بچّے ہنستے جاتے تھے اور شور مچاتے جاتے تھے۔ میں نے بہت دیکھا کہ ان کا شور سن کر شاید پہاڑیوں کے اُوپر سے کسی کی ماں جھانک کر دیکھے مگر توبہ!— کوہستان کے اس سارے علاقے میں مجھے کہیں ایک بھی عورت دکھائی نہیں دی۔ ایک بھی نہیں۔

لیکن جیپ شہر بشام میں داخل ہوئی تو میری حیرت زدہ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ میں نے ایک دو نہیں، دس بیس نہیں، کم سے کم ڈیڑھ سو عورتیں دیکھیں۔ بے حد باپردہ۔ دبیز برقعوں کے اندر قلعہ بند۔ کسی کا ہاتھ نظر آیا ہو تو آیا ہو ورنہ کلائی ایک نہ دکھائی دی۔ نہ کسی کی عمر کا اندازہ، نہ کسی کے رنگ اور روپ کا احساس۔ سب ایک جیسے برقعوں کے اندر روپوش تھیں مگر ایک بات تھی جو ہر برقعے اور ہر سراپے سے صاف ظاہر تھی۔ وہ سب مضمحل تھیں، سب لاغر تھیں اور تب پتہ چلا کہ وہ سب بیمار تھیں۔ اور تب پتہ چلا کہ مملکت پاکستان کے اس وسیع و عریض کوہستان کے اس اچھے خاصے مہذب اور آباد علاقے میں عورتوں کے علاج کے لیے ایک بھی لیڈی ڈاکٹر نہیں۔ بشام جیسے بارونق شہر کے سول اسپتال میں صرف دو سند یافتہ ڈاکٹر تھے۔ ایک مسلمان اور ایک سکھ اور بس!۔ حکومت کے اس اسپتال میں عورتوں کے علاج کے لیے کوئی نرس تک نہ تھی —اور خواتین کا یہ سارا مجمع اُس مسیحی شفا خانے کی طرف رواں تھا جو چھ ہزار میل دور ناروے، سویڈن اور ڈنمارک کے لوگوں نے غریبوں کی خاطر اپنے عطیات جمع کر کے قائم کیا تھا اور بس صرف اس ایک شفا خانے میں صرف ایک خاتون تھیں جو باضابطہ ڈاکٹر نہیں بلکہ سند یافتہ نرس تھیں اور زحمتیں اور صعوبتیں اٹھا کر اس دور دراز علاقے کی عورتوں کا علاج کرنے کے لیے پاکستان کے میدانی علاقوں سے نہیں بلکہ سات سمندر پار ناروے سے آئی تھیں۔ ان کی باتیں ذرا دیر بعد!

میں یہ سوچ کر حیران تھا کہ اس لمبے چوڑے ضلع کوہستان کے اس خطّے میں، جو اُن علاقوں سے زیادہ دور نہیں جو مہذّب کہلاتے ہیں، عام لوگوں، دیہاتیوں اور غریبوں کے دوا علاج کے لیے کوئی خدا کا بندہ نہیں اُٹھا۔

تب ایک گوشے سے آواز آئی کہ یہ سرزمین بھی جیالوں سے خالی نہیں۔ یہاں کے نوجوانوں نے کوہستان ہیلتھ گارڈ ایسوسی ایشن کے نام سے ایک تنظیم بنالی ہے جس کے ہیلتھ گارڈ خود اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر دور دور کے دیہات تک اور اونچے اونچے پہاڑوں پر جاتے ہیں اور مریضوں کی جانیں بچاتے ہیں۔

کوئی ہے اس تنظیم کا عہدیدار؟ میں نے پوچھا۔ ایک طرف سے آواز آئی: میں ہوں اس کا نائب صدر۔

یہ فیض الابرار تھے۔ نوجوان ہیں۔ ذہین ہیں۔ تعلیم یافتہ ہیں اور جوشیلے ہیں اور ان سے باتیں کیں تو اندازہ ہوا کہ کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں۔

وہ بولے — "ہم یہ کرنا چاہتے ہیں کہ کسی طرح اس علاقے سے غریبی دور ہو کیونکہ ہمارا یہ علاقہ بہت پس ماندہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ لوگوں کو دوا علاج کی زیادہ سے زیادہ سہولتیں کسی طریقے سے پہنچائیں جس کے لیے ہم نے کچھ منصوبے بھی بنائے ہیں۔ ہماری کوہستان ہیلتھ گارڈ ایسوسی ایشن پہاڑوں کے اندر اپنے ہیلتھ گارڈز بھیجتی ہے جو لوگوں کا مفت علاج کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "یہ ہیلتھ گارڈز کون ہیں؟ —"

جواب ملا — "یہ وہ لوگ ہیں جو یہاں پارامیڈیکل انسٹی ٹیوٹ میں تربیت پاتے ہیں۔ یہ ادارہ ایک تنظیم نے کھولا ہے اور اس میں ہر سال ساٹھ سے زیادہ لڑکے دوا علاج کی بنیادی تربیت پاتے ہیں۔ ان میں سے بعض کو تو سرکاری اسپتالوں میں یا دوسرے اداروں میں نوکری مل جاتی ہے لیکن اگر وہ فارغ ہوں یا اپنا کوئی کاروبار کرتے ہوں تو ہم انہیں کچھ معاوضے کی پیشکش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے سینے میں بھی دردمند دل ہوتے ہیں اور وہ خود چاہتے ہیں کہ پہاڑوں کے اندر جائیں اور بیماروں اور کمزوروں کی دیکھ بھال کریں۔ خصوصاً زچگی میں بڑی دشواری ہوتی ہے۔ اگر زچگی پیچیدہ ہو تو یہ لوگ مریضہ کو شہر لانے کی کوشش کرتے ہیں لیکن بارہا خواتین راستے ہی میں مرجاتی ہیں۔"

میں نے پوچھا — "کیا آپ کے سارے ہیلتھ گارڈ مرد ہیں۔ ان میں خواتین نہیں ہیں؟ —"

وہ بولے — "خواتین تو نہیں ہیں البتہ ضلع کے اندر دو مڈوائف موجود ہیں۔ بعض اوقات ہم ان

کو بھیجتے ہیں۔"

فیض الابرار صاحب نے یہ دو مڈوائفوں کی بات کچھ ایسے کہی جیسے انہیں خود اپنی بات پر اعتبار نہ ہو۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ ابھی بتا رہے تھے کہ پہاڑوں میں جو لوگ رہتے ہیں وہ بہت غریب ہیں۔ بتائیے ان کی اور ان کے علاج کی کیا حالت ہے؟

انہوں نے کہا ــ"ان کی حالت تو یہ ہے کہ اول تو ان کے علاقوں میں کوئی سڑک نہیں، اور اگر ہے تو اس کی حالت ٹھیک نہیں۔ ابھی چند روز پہلے کا واقعہ ہے، موسم خراب تھا۔ بارشیں ہو رہی تھیں اور اوپر پہاڑوں میں ایک مریض کی حالت تشویشناک تھی۔ ہمارے کوہستان کے ملک سید احمد اس مریض کو اپنی گاڑی میں لا رہے تھے۔ راستے میں خدا جانے کیا ہوا کہ گاڑی نیچے نالے میں گر گئی۔ تین آدمی تو وہیں فوت ہو گئے۔ خود ملک سید احمد معجزانہ طور پر بچ گئے۔ اور اس حالت میں انہوں نے بڑی بہادری کا مظاہرہ کیا اور ایک زخمی کو بہت مشکل سے باہر نکالا۔ اوپر سے بستی والوں نے رسیاں پھینکیں اور انہیں کھینچ کر اوپر لائے ــــ تو یہ حال ہے ہمارے علاقے کا۔ کوئی اچھی سڑک نہیں۔ کوئی ان کی دیکھ بھال نہیں۔ خود لوگ بے حد غریب ہیں۔ وہاں اوپر روزگار اور آمدنی کا ذریعہ نہیں۔ بعض لوگ یہیں نیچے مزدوری کر کے کچھ کماتے ہیں اور اوپر لے جا کر کھاتے ہیں۔"

کیسے غریب، کیسے سادہ اور کیسے دکھی لوگ ہیں مگر اولادیں بہت ہوتی ہیں اور ان کی ذمہ داری کے بوجھ تلے دبے جاتے ہیں۔ میں نے فیض الابرار صاحب سے پوچھا کہ کیا یہ لوگ خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں کچھ جانتے ہیں؟ کچھ پوچھنے آتے ہیں آپ سے؟ ــــ

"جی ہاں، جو سمجھ دار دیہاتی ہوتے ہیں اور جو سمجھ دار اَن پڑھ ہوتے ہیں وہ ہمارے پاس آتے ہیں اور ہمارے فیلڈ آفس سے مشورہ اور دوائیاں وغیرہ لیتے ہیں۔"

"ماؤں کو اور خواتین کو بتانے کا کوئی امکان، کوئی طریقہ ہے؟ ــ"

"جی ہاں۔ ہمارے ہاں مقامی طور پر تربیت یافتہ دائیاں ہیں۔ باہر سے لیڈی ڈاکٹرز آ کر ان دائیوں کو خاندانی منصوبہ بندی کے بارے میں لیکچر دیتی ہیں اور ساری باتیں وضاحت سے سمجھاتی ہیں۔ اس کے بعد یہ دائیاں ہمارے گاؤں دیہات کی اَن پڑھ خواتین کو سمجھاتی ہیں اور چونکہ

دائیاں خود بھی اَن پڑھ ہوتی ہیں اس لیے ایک دوسری کی بات سمجھنا ان کے لیے آسان ہوتا ہے۔"

اب میں نے فیض الابرار صاحب سے وہ سوال پوچھا جسے پوچھنے کے لیے میں دیر سے بے چین تھا۔ میں نے کہا کہ یہ بتایئے کہ اس خطے میں جہاں روزے نماز کی بے حد پابندی ہے، لوگ شریعت پر جان دیتے ہیں، اس خطے میں سڑک کے کنارے جدید، عمدہ اور صاف ستھری عمارت میں اسلامی نہیں، مسیحی شفاخانہ قائم ہے، کیوں؟

جواب ملا — "مقامی طور پر ہمارا ایک سول اسپتال ہے جس میں دو مرد ڈاکٹر ہیں اور چونکہ ہمارے سول اسپتال کے اندر کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں ہے اور چونکہ اس مسیحی شفاخانے کے اندر صرف عورتوں کا علاج ہوتا ہے اسی لیے اس شفاخانے پر عورتوں کا اتنا ہجوم ہوتا ہے۔ ہمارا یہ کوہستان کا علاقہ بہت لمبا چوڑا ہے اور اس میں عورتوں کا یہ ایک ہی اسپتال ہے اس لیے تمام عورتیں وہیں جاتی ہیں حالانکہ اس میں کوئی سندیافتہ ڈاکٹر بھی نہیں۔ صرف ایک یورپین خاتون ہیں جو غالباً نرس ہیں مگر وہ شاید علاج اچھا کرتی ہیں، اسی لیے غریبوں کے علاوہ اور خواتین کے علاوہ دوسرے لوگ بھی علاج کے لیے ان ہی کے پاس جانے کی کوشش کرتے ہیں۔"

فیض الابرار صاحب سے بات کر کے میں سیدھا بشام کے مسیحی شفاخانے پہنچا۔ اندر باہر اَن گنت کوہستانی عورتیں جمع تھیں۔ میں نے اندر پیغام بھجوایا اور فوراً ہی مجھے بلوا لیا گیا۔ ہر طرف مریض خواتین بیٹھی تھیں اور درمیان میں ایک سفید فام یورپین خاتون نہایت سلیقے سے پاکستانی لباس پہنے کھڑی تھیں۔ نہایت شستہ اردو میں بولیں "آیئے، تشریف لایئے۔ فرمایئے آپ کی کیا خدمت کی جائے؟ —"

تب پتہ چلا کہ وہ لائیلہ جوزف ہیں۔ سندیافتہ نرس ہیں اور ناروے سے آئی ہیں۔ میں نے لائیلہ جوزف سے پوچھا کہ آپ کے اسپتال کے اندر اور باہر اتنی عورتوں کا مجمع کیوں ہے؟ قدرے پنجابی لہجے میں بولیں:

"اس لیے کہ اس علاقے میں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں۔ دو اسپتال بیشک ہیں لیکن وہاں مردانہ ڈاکٹر ہوتے ہیں۔ یہ عورتیں بہت پردہ کرتی ہیں اور ان کے لیے مرد ڈاکٹر کے پاس جانا بہت مشکل ہوتا ہے تو اس مسیحی شفاخانے میں عورتیں ہیں، بیشک صرف نرسیں ہیں لیکن عورتیں ہیں لہٰذا وہ کھل

کر بات کر سکتی ہیں۔ ہم اچھی طرح ان کو دیکھ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کو یقین ہے کہ ہم ان کا صحیح علاج کرتے ہیں اس لیے وہ یہاں آتی ہیں۔"

میں نے پوچھا — "لیکن اتنا بڑا مجمع کیوں ہے مریضوں کا؟ —"

لائیلہ بولیں — "یہاں کافی غربت ہے۔ لوگ اَن پڑھ ہیں اور صحت اور صفائی کے اصولوں سے ناواقف ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں بیماریاں کافی ہیں۔ کچھ لوگ اونچے اونچے پہاڑوں پر رہتے ہیں۔ وہاں پانی حاصل کرنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ نہا نہیں سکتے اور اپنے آپ کو صاف نہیں رکھ سکتے۔ ان کا پینے کا پانی بھی صاف نہیں ہوتا اس لیے پیٹ کی بیماریاں عام ہیں۔"

میں نے پوچھا — "آپ صرف علاج کرتی ہیں یا ان لوگوں کی تربیت بھی کرتی ہیں؟"

وہ بولیں — "میں کوشش تو کرتی ہوں ان کو سمجھانے کی۔ میری مشکل یہ ہے کہ مجھے صرف اُردو آتی ہے اور یہ پشتو بولتی ہیں۔ اگرچہ میری ایک ترجمان موجود ہیں پھر بھی جب براہ راست بات نہیں ہوتی تو ذہن میں پوری طرح اترتی نہیں۔ لیکن میں کوشش کرتی ہوں۔ کبھی کبھی بہت رش ہوتا ہے تو ہر ایک کے ساتھ گفتگو کرنے کا وقت نہیں ہوتا —"

"آپ مہینے میں کتنے دن مریضوں کو دیکھتی ہیں؟ —"

"میں دس دن دیکھتی ہوں مہینے میں —"

"باقی بیس دن یہ خواتین علاج سے محروم رہتی ہیں؟ —"

"یہی تو مشکل ہے۔ فی الحال یہاں اسٹاف نہیں ہے اور میرے بچے ہیں تو مجھے ان کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ گھر کو سنبھالنا ہوتا ہے۔ پھر یہ کہ ہماری دوائی ختم ہو جاتی ہے تو ہم جا کر ایبٹ آباد سے ساری چیزیں لاتے ہیں۔ یہاں کے بازار میں تو کھانے کی چیزیں بھی نہیں ملتیں اس لیے ہماری مجبوری یہ ہے کہ ہم خود یہاں ہر وقت نہیں رہ سکتے۔"

میں نے پوچھا "دوا علاج اس زمانے میں بہت مہنگا ہے اور لوگ نہایت غریب ہیں۔ آپ ان کی مدد کرتی ہیں؟ —"

"جی ہاں۔ ہم مدد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کے پاس پیسے ہیں ہم ان سے پوری قیمت لیتے ہیں لیکن اگر ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے پاس پیسے نہیں تو ہم مفت دوا دے دیتے ہیں۔

اس علاقے میں تپ دق کے مریض بہت ہیں اور تپ دق کا علاج مہنگا ہے اس لیے ہم پچاس فیصد تک رعایت دیتے ہیں اور کبھی کبھی تقریباً مفت علاج کر دیتے ہیں۔"

میں نے پوچھا ۔" آپ جو مدد اور رعایت دیتی ہیں اس کا سارا خرچہ کہاں سے ملتا ہے آپ کو؟"

لائیلہ جوزف نے بتایا ۔" یہ خرچہ ہمیں ناروے اور سویڈن سے ملتا ہے ۔ میں ناروے کی ہوں اور وہاں ہمارے مسیحی بھائی ہیں جو اس کام کے لیے پیسے دیتے ہیں۔"

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ بشام میں اپنے اس اسپتال کی توسیع کریں گی؟ اسے ترقی دیں گی؟ کیا آپ اس میں سال بھر کام کرنے والی خواتین ڈاکٹر اور نرسیں رکھیں گی؟ —— ان کا جواب کچھ یوں تھا:

" ضرور —— کافی سالوں سے ہم اسی کوشش میں ہیں کہ دو تین نرسیں آجائیں، ایک دو لیڈی ڈاکٹر ہوں تاکہ ہم اپنا اسپتال ہر وقت کھلا رکھیں لیکن فی الحال کوئی آنے کے لیے تیار نہیں۔ یہ تو خیر ناروے کی بات تھی۔ ہم نے کوشش کی کہ پاکستان سے کوئی آجائے لیکن کوئی اس جگہ رہنا پسند نہیں کرتا۔ یہ علاقہ خوبصورت تو بہت ہے لیکن اس علاقے میں کچھ اتنی سہولتیں نہیں ہیں۔ یہ دوسرے علاقوں سے دور ہے۔ لوگ اپنے خاندانوں اور گھر والوں سے دور رہنا پسند نہیں کرتے ——"

لائیلہ جوزف نے یہ کہا اور چپ ہوگئیں لیکن میرے وجود کے اندر کوئی بولنے لگا۔ کوئی بولنے لگا اور کہنے لگا کہ نیچے میدانوں میں جو درجنوں میڈیکل کالج کھلے ہیں ان میں داخلہ لینے کے لیے ہزاروں لڑکے لڑکیاں جان دیئے دیتے ہیں۔ جس طرح بھی بنتا ہے میڈیکل کالجوں میں داخل ہوتے ہیں۔ جیسے بھی بنتا ہے پڑھتے ہیں اور امتحان پاس کرتے اور بس! پھر ان کے دل درد سے خالی ہو جاتے ہیں۔ غول در غول پاس ہو ہو کر نکلنے والی خواتین میں ایک بھی ایسی جیالی ڈاکٹر نہیں جو ان دکھیوں کے تاریک گھروں میں رحمت کے دیئے جلائے۔

ایک بھی نہیں ہے۔

ایک بھی نہیں۔

میں بشام سے چلنے لگا تو کسی نے کہا کہ مجتبیٰ صاحب سے ملے بغیر نہ جایئے گا۔ بشام کے

بہت سے زمانے دیکھے ہیں اور بہت دنیا بھی دیکھی ہے انہوں نے۔ یہ سنا تو میں نے بھی مجتبےٰ صاحب کو دیکھنے کی ٹھانی اور انہیں ڈھونڈنا بھی بہت آسان نکلا۔ ان کے گھر کی دہلیز علین شاہراہِ ریشم پر ہے۔ جس سڑک نے یہ پورا علاقہ کھول دیا، ان کے مکان کا دروازہ اسی سڑک پر کھلتا ہے۔

محمد مجتبٰی صاحب بہت خلیق، ملنسار اور پڑھے لکھے نکلے۔ اوپر سے مہم جُو ایسے کہ دینی تعلیم پانے کے لیے ان پہاڑوں سے اترے اور دِلّی جا پہنچے اور پھر روزگار کی تلاش میں برما چلے گئے۔ وہیں شادی کی اور سارے بچے وہیں پیدا ہوئے — آخر جی نہ مانا اور تقریباً چالیس برس کی عمر میں بال بچوں سمیت یہیں پہاڑوں میں لوٹ آئے۔ میں نے محمد مجتبٰی صاحب سے پوچھا کہ آپ جب پیدا ہوئے، ان دنوں یہاں بشام میں پیدائش کا کوئی رجسٹر ہوتا تھا؟ کچھ یاد ہے آپ کو آپ کب پیدا ہوئے تھے؟

ذہن پر زور ڈالے بغیر فوراً بولے — "۱۹۲۴ء میں"

"اور یہیں، اسی بشام میں؟ —"

"اسی بشام میں"

"آپ کے بزرگ یہاں کیا کرتے تھے؟ —"

"یہ — کوئی — ایسا — زمیندارہ کا کام کرتے تھے۔ کھیتی مویشی کا۔ ایسا ہی کام کرتے تھے۔"

"آپ بشام میں کتنی عمر تک رہے؟ —"

"اس وقت والیٔ سوات یہاں کا بادشاہ نہیں تھا۔ ہر خاندان کے بڑوں کی حکمرانی تھی۔ ان میں ایک خان ہوتا تھا۔ ہر شخص اس کی رائے سے کام کرتا تھا۔ سب اس کے ماتحت تھے۔ کبھی کبھی ایسا ہوتا تھا کہ ان خان لوگوں میں آپس میں جھگڑے فساد ہوتے تھے۔ یہ لوگ لڑائی جھگڑوں میں مبتلا تھے۔ لیکن جہاں تک عام لوگوں کا تعلق ہے وہ بڑے اخلاق والے تھے اور مہمان نواز تھے۔ آپس میں کچھ بھی ہو لیکن باہر سے کوئی آدمی آتا تھا تو اس کی بڑی خاطر اور عزّت کی جاتی تھی"

میں نے کہا — "چلیئے۔ یہ لوگ آپس میں لڑتے تھے۔ مگر کیا یہ صحیح ہے کہ انگریزوں کو انہوں نے اس علاقے میں قدم نہیں رکھنے دیئے اور سفید فام حکمرانوں کو اس طرف آنے کی اجازت نہیں تھی"۔

وہ بولے ۔" جب انگریزوں کی بادشاہی تھی اس وقت انگریز اس علاقے میں نہیں آتا تھا۔ انگریز کا نام سن کر اس علاقے والے متفق ہو جاتے تھے۔ غزوہ کے نام سے ان کے خون میں جوش آتا تھا۔ اس وقت یہ اپنا اختلاف بھلا کر انگریز کے اوپر چڑھائی کرتے تھے لہٰذا انگریز اس طرف نہیں آسکتا تھا۔"

میں نے کہا ۔" مجتبیٰ صاحب۔ کل کوئی کہہ رہا تھا کہ یہ سڑک بننے کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوا ہے کہ خوانین کی لڑائیاں بند ہو گئی ہیں۔ کیا یہ صحیح ہے؟"

وہ بولے ۔" بالکل۔ بالکل بند ہو گئی ہیں۔ اب خوانین کی لڑائی نہیں ہوتی۔ یہ لڑائی اس وقت بند ہو گئی تھی جب یہاں والیٔ سوات نے قبضہ کیا۔ اس کے قبضے کے بعد یہاں شخصی حکومت بن گئی تو ان خوانین کا دبدبہ ختم ہو گیا۔"

میں نے کہا ۔" آپ کا یہ علاقہ اب تک پسماندہ ہے اور یہاں کے لوگ آج اس صدی کے آخری برسوں میں بھی غریب ہیں۔ آپ کے لڑکپن کے دنوں میں یہاں کے غریبوں کی کیا حالت تھی؟ ۔۔۔"

مجتبیٰ صاحب نے کہا ۔" اس وقت غریبوں کی حالت بہت خراب تھی۔ کاشت وغیرہ کرتے تھے اور اُس کے اوپر اپنا گزارا کرتے تھے۔ باہر جا کر کچھ تھوڑا بہت سامان لاتے تھے اور فروخت کرتے تھے۔ اس سے روزی ملتی تھی۔ اور کچھ نہیں تھا۔"

" اس وقت لباس کیسا تھا۔ ٹوپی جوتی کیسی تھی؟"

" جوتی چمڑے کی بہت کم تھی۔ جو آدمی تھوڑا پیسے والا تھا وہ چمڑے کی جوتی پہنتا تھا۔ یہاں جنت ساز ہوتا تھا جس کو پانڑا کہتے تھے۔ وہ جوتیاں بناتا تھا۔ باقی لوگ دھان کو ہاتھوں سے بٹ کر رسیاں بنا کر اس کی جوتی بناتے تھے اور وہی پہنتے تھے۔ میں نے خود پہنی ہے وہ چپل ۔"

دن ڈھل رہا تھا۔ مجھے آگے جانا تھا اس لیے اپنی بات مختصر کرتے ہوئے میں نے مجتبیٰ صاحب سے پوچھا۔ یہ تو بتایئے کہ یہ جو اتنا بڑا دریائے سندھ شہر بشام کے قدموں کو چھوتا ہوا بہہ رہا ہے اس دریا سے اس شہر کو کبھی کوئی فائدہ بھی پہنچا؟ ۔۔۔"

ان کا جواب کچھ یوں تھا ۔" اس سے کبھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ بلکہ کبھی کہیں اوپر کوئی پہاڑ

ٹوٹ کر دریا میں گرتا تھا تو اس سے دریا بند ہو جاتا تھا اور بڑی جھیل بن جاتی تھی۔ وہاں سے انگریزوں کے ہوائی جہاز گزرتے تو خبر ملتی کہ دریا بند ہوگیا ہے آپ لوگ جو دریا کے کنارے بستے ہیں جان و مال سے ہوشیار رہیں۔ ایک مرتبہ تو دریا میں اتنا شدید سیلاب آیا کہ یہ جگہ جہاں آپ بیٹھے ہیں یہاں بھی پانی تھا۔ دریا اپنے ساتھ مال مویشی لے گیا۔ تو دریائے سندھ سے بشام کو فائدہ کم تھا اور نقصان زیادہ تھا۔"

گفتگو ختم ہوئی۔ ہم بغل گیر ہوئے۔ باہر سڑک پر بڑے بڑے ٹرک چین کی طرف چلے جا رہے تھے اور نشیب میں دریائے سندھ آہستہ آہستہ بہہ رہا تھا۔ اس میں کچھ ایسا سکوت اور ایسا سکون تھا جیسے وہ اپنی گردن پر کوئی الزام لینے کو تیار نہ ہو۔

زندگی اجیرن ہے

کوہستان کا علاقہ ختم ہوا۔ دریا اور سڑک، دونوں نیچے اُترنے لگے۔ وادیاں ہتھیلیوں کی طرح پھیلنے لگیں۔ ننگے پہاڑوں کی جگہ سرسبز پہاڑ اور چیڑ کے جنگل آ گئے۔ گویا ہم اس جگہ پہنچ گئے جہاں بارشیں لے کر بادل بھی پہنچ جاتے ہیں اور جہاں ہمالیہ ان کا راستہ نہیں روکتا۔

ہوا میں چیڑ کے دھوئیں کی خوشبو گھلنے لگی۔ پہاڑی ہوا آہستہ آہستہ میدانی ہواؤں میں تبدیل ہونے لگی۔ پاکستانی اور چینی انجینئروں کی بنائی ہوئی شاہراہ قراقرم کا یہ حصہ ثابت اور صحیح سلامت تھا۔ اب راہ میں وہ بڑا سا پل آیا جس پر ہم نے دریائے سندھ کو یہاں پہاڑوں میں آخری مرتبہ پار کیا۔

اب منظر بدلا۔ کوٹ پتلون پہنے ہوئے لوگ، نئی نئی موٹر گاڑیاں، بچے، یہاں تک کہ ان کی مائیں بھی نظر آنے لگیں۔ اور ذرا دیر بعد شہر تھاکوٹ کے ہوٹلوں کی چمنیوں سے اٹھتا ہوا دھواں دکھائی دیا۔

اگلے ہی لمحے ہماری جیپ تھاکوٹ کے بازار میں داخل ہوئی اور پکّی سڑک سے کچے کنارے پر اُتری تو پہاڑی مٹی اس کے پہیوں تلے چرچرائی۔

یہاں خوب رونق تھی۔ دکانیں کھلی ہوئی تھیں۔ ہوٹل گاہکوں سے بھرے ہوئے تھے اور لوگ بیکار نہیں بلکہ مصروف نظر آ رہے تھے۔

میں اپنے سر کے درد کی دوا خریدنے کے لیے کیمسٹ کی اچھی خاصی صاف ستھری دکان میں داخل ہوا۔ سجی دھجی الماریوں کے درمیان نوجوان کیمسٹ محمد غنی بیٹھے تھے۔ وہ اس علاقے کے تین چار اور نوجوانوں کی طرح سند یافتہ ڈسپنسر تھے اور ذرا سی گفتگو سے اندازہ ہوا کہ دواؤں اور بیماریوں سے خوب واقف تھے۔

محمد غنی سے باتیں ہونے لگیں۔ میں نے پوچھا کہ یہ تھاکوٹ کا علاقہ کیسا ہے؟ یہاں کے لوگ کیسے

ہیں؟ ان کی زندگی کیسی ہے؟

جواب ملا ــــ "جناب: تھاکوٹ ایک غریب علاقہ ہے۔ یہاں کے اکثر لوگ پہاڑوں میں رہتے ہیں جہاں پانی بہت کم ہے۔ لوگ کھیتی باڑی پر گزارا کرتے ہیں اور کھیتی باڑی کا دارومدار بارش پر ہے۔ یہاں پر زندگی اجیرن ہے ــــ"

زندگی اجیرن ہے۔ وہاں اوپر پہاڑوں میں ایک مقامی نوجوان کی زبان سے ایسا شستہ اور شگفتہ لفظ سُن کر زندگی باغ باغ ہوگئی۔

لیکن پورے بلتستان اور سارے کوہستان کے سفر کے بعد یہ پہلی جگہ تھی جہاں کسی نے زندگی کی سہولتیں دستیاب نہ ہونے کا شکوہ کیا، ورنہ وہاں اوپر رہنے والوں کو تو شاید معلوم بھی نہ تھا کہ ان کی زندگی میں کیا کمی ہے۔ انہیں جو نصیب نہ تھا اس کی انہیں تمنا بھی نہ تھی اور جو کچھ نصیب تھا، وہ سمجھتے تھے کہ دنیا کے گودام میں بس اتنا ہی مال ہے۔

میں نے محمد غنی سے پوچھا کہ اب تو آپ کے علاقے میں شاندار شاہراہ قراقرم نکل آئی ہے اور آپ پورے پاکستان سے جُڑ گئے ہیں۔ اس سڑک کے کھلنے سے کچھ فرق آیا؟

وہ کہنے لگے ــــ "اس سڑک سے تھاکوٹ کے لوگوں کی زندگی میں بہت کچھ فرق آیا۔ پہلے یہاں کے لوگ روزمرہ ضرورت کی چیزوں کے لیے مانسہرہ اور ایبٹ آباد جایا کرتے تھے۔ آج سے تقریباً اٹھارہ بیس سال پہلے تک لوگوں کو نہایت تکلیف تھی۔ اگر کوئی شخص بیمار ہو جاتا یا اس کو گولی لگ جاتی تو اسے اٹھا کر پشاور، راولپنڈی یا ایبٹ آباد لے جاتے تھے۔ ایک بڑا مسئلہ یہ تھا کہ یہاں خان خوانین آپس میں لڑا کرتے تھے۔ عام لوگ ان کے محکوم تھے اور ان کی خاطر گولیاں کھاتے تھے۔ سڑک کے آنے سے وہ پرانا خان خوانین کا ظلم و ستم نہایت کم ہوا ہے اور اب تو یہاں کے لوگ نہایت تعلیم یافتہ اور بااخلاق ہوگئے ہیں۔"

سڑک کی بات چل رہی تھی اور سامنے کچھ فاصلے پر چینی طرز کا بہت بڑا اور خوش نما پُل نظر آرہا تھا۔ محمد غنی نے مجھے بتایا کہ جب یہ سڑک بن رہی تھی، اس جگہ چینی انجینیروں کا بہت بڑا کیمپ تھا۔ میں نے پوچھا "آپ کو یاد ہے، سینکڑوں چینیوں کی موجودگی میں یہاں کیسا ماحول تھا؟ ــــ"

وہ بتانے لگے یہ بہت اچھا ماحول تھا اور خاص کر چین والوں میں بہت ڈسپلن تھا اور وہ کام میں نہایت محنت کرتے تھے۔"

"آپ کے ساتھ ان کا ملنا جلنا تھا؟"

"ہاں بالکل تھا۔"

"بازار میں خریداری کرتے تھے وہ؟"

"ہاں۔ ہماری دکانوں پر آتے تھے اور میرا خیال ہے کہ ان میں دو تین مسلمان بھی تھے۔"

"یہ آپ کو کیسے اندازہ ہوا؟"

"جس طرح وہ ہمارے ساتھ اٹھتے بیٹھتے تھے اس سے اندازہ ہوتا تھا۔"

"آپ کی دکان کے بالکل سامنے مسجد ہے جس کے برآمدے دریا کی جانب کھلتے ہیں اور سامنے دلکش منظر ہے، چینی انجینئر یہاں نماز پڑھتے تھے؟"

"وہ تو مجھے یاد نہیں لیکن جو سینکڑوں چینی حاجیوں کے قافلے یہاں سے گزرتے ہیں۔ ان کا یہاں پڑاؤ ہوتا ہے اور وہ حج پر جاتے ہوئے بھی اور واپسی میں بھی یہاں نماز پڑھتے ہیں۔"

"جب چینی حاجی یہاں سے گزرتے ہیں تو کیسا منظر ہوتا ہے؟"

"دیکھنے کے قابل۔ ہر شخص بہت خوش ہوتا ہے۔ پوری آبادی ان سے مصافحہ کرنے نکل آتی ہے اور لوگ ان کی خوب خاطر مدارات کرتے ہیں۔ مَیں آپ کو کیسے بتاؤں لوگ کتنے خوش نظر آتے ہیں۔"

یہ کہتے کہتے محمد غنی کا چہرہ دمکنے لگا۔ اسی وقت سامنے مسجد میں نماز ختم ہوئی اور بہت سے نمازی اُٹھ کر دہیں کیمسٹ کی دکان میں آگئے۔ ان میں حاجی سلطان زرصاحب بھی تھے۔ باشعور، تعلیم یافتہ اور اپنے اس علاقے سے خوب اچھی طرح واقف۔ میں نے سلطان زرصاحب سے کہا کہ کچھ تھاکوٹ کے باشندوں کے بارے میں بتائیے۔

وہ بڑی مستعدی سے بتانے لگے "یہاں جو لوگ آباد ہیں یہ زیادہ تر یوسف زئی پٹھان ہیں اور سواتی ہیں۔ یہ لوگ بہت عرصے پہلے سوات سے نقلِ وطن کر کے اس طرف آئے تھے اور تھاکوٹ کے پہاڑوں میں آباد ہوگئے تھے ان کی مادری زبان پشتو ہے۔"

میری دلچسپی دیکھ کر حاجی سلطان زر صاحب اور تفصیل بتانے لگے۔ ان یوسف زئی پٹھانوں کے رسم و رواج اور قبائلی نظام کی بات چھڑ گئی۔ کہنے لگے: "یہ سب قبائلی ہیں۔ یہاں قبیلے کو ناکائی کہا جاتا ہے۔ تو ہمارے ہاں تھاکوٹ کے علاقے میں آٹھ ناکائی کے لوگ ہیں۔ ان کے مختلف نام ہیں مثلاً خان خیل، مالکال، دو دال اور جہانگیری وغیرہ۔ یہاں کے باشندوں کی روزی زمیندارہ سے ہے۔ اب ساتھ ساتھ لکھائی پڑھائی کا انتظام بھی ہے۔ یہاں پر ہائی اسکول ہے اور نواحی علاقوں میں پرائمری اسکول ہیں البتہ ابھی تک یہاں تعلیم یافتہ لوگ کم ہیں۔ یوں سمجھیے کہ اس علاقے کی پچاس ہزار کی آبادی میں مشکل سے پندرہ بیس گریجویٹ ہوں گے۔ یہاں کے باشندوں کے لیے اسپتال تو ہے مگر اس پورے علاقے میں ایک بھی ایم بی بی ایس ڈاکٹر نہیں۔ اب بشکل کچھ لڑکوں نے ڈسپنسر کا کورس کیا ہے۔ مثلاً ہمارے سامنے محمد غنی بیٹھے ہیں۔ دو تین لڑکے اور ہیں جو ڈسپنسر کا کورس کر چکے ہیں۔ یہاں کوئی کالج نہیں ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ یہاں کالج قائم کیا جائے۔ یہاں لڑکیوں کا اسکول نہیں ہے۔ پرائمری سطح پر البتہ اب ایک اسکول کھلا ہے مشکل سے۔ اور ہاں، اس پر یاد آیا کہ یہاں لیڈی ڈاکٹر تو کجا کوئی کمپاؤنڈر لڑکی تک نہیں ہے۔ اس طریقے سے ہمارا یہ علاقہ کافی پسماندہ ہے۔ اس شاہراہ ریشم کی وجہ سے اب ترقی ہو رہی ہے اور یہاں کچھ رابطہ سڑکیں بھی نکل رہی ہیں لیکن ابھی کافی کمی ہے۔"

بات قبیلوں سے شروع ہو کر اسپتالوں اور اسکولوں تک پہنچ گئی۔ میں نے سلطان زر صاحب سے پوچھا کہ چلیے اسکول تو ہیں، یہ بتائیے کہ ان میں پڑھنے کے لیے بچے بھی ہیں؟

اُن کا جواب چند میل اوپر کوہستان والوں کے جواب سے بالکل مختلف تھا۔ کہنے لگے "پہلے جب ہم لوگ پڑھتے تھے تو اُس زمانے میں یہاں کے ہائی اسکول میں مشکل سے چالیس لڑکے تھے۔ یہ بات ۱۹۵۸ء کی ہے جب ہم نے میٹرک کیا تھا۔ اِس وقت پوزیشن یہ ہے کہ اسکول میں کمرے بھی زیادہ ہیں لیکن لڑکے اتنے زیادہ ہیں کہ ان میں نہیں سما سکتے اور جو آس پاس کے علاقوں میں پرائمری اسکول ہیں وہاں سے چوتھی جماعت پاس کر کے وہ لڑکے جب پانچویں جماعت میں داخلہ لینے یہاں آتے ہیں تو یہاں کوئی جگہ نہیں ہے لہٰذا ان کو واپس بھیج دیا جاتا ہے۔ لیکن اسی حساب سے بے روزگاری بھی ہے۔ لازمی بات ہے کہ ہر سال پچاس لڑکے

میٹرک پاس کر کے نکلتے ہیں لیکن مشکل سے چار پانچ لڑکوں کو یہاں روزگار ملتا ہے۔ باقی لڑکے شہروں کا رُخ کرتے ہیں، پشاور، لاہور، اسلام آباد اور کراچی"۔

حاجی سلطان زرصاحب کے ساتھ منوّرصاحب بھی تھے جو تھاکوٹ ہائی اسکول میں استاد ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یوسف زئی پٹھانوں میں بچوں کو، خصوصاً لڑکیوں کو تعلیم دلانے کا شعور پیدا ہو رہا ہے یا نہیں؟

وہ بولے "یقیناً پیدا ہو رہا ہے اور بہت سنجیدگی سے تعلیم دلانے کا احساس اُجاگر ہو رہا ہے۔ میں خود یہاں سے دو کیلومیٹر آگے رہتا ہوں۔ وہاں دو یونین کونسلیں ہیں۔ وہاں پانچ سال سے لڑکیوں کے لیے ایک پرائمری اسکول قائم ہے لیکن یقین کیجیے کہ اس میں آج تک کوئی استانی پڑھانے نہیں آئی۔ کچھ لوگ کہتے ہیں کہ کوئی استانی یہاں آنے کے لیے تیار نہیں، کوئی کہتا ہے کہ حکام نے آج تک بندوبست ہی نہیں کیا اور یہ بھی سننے میں آتا ہے کہ کاغذوں میں استانی کا نام تو درج ہے، اُسے تنخواہ بھی جا رہی ہے مگر یہاں پر حاضری نہیں ہے ——"

کتنی عجیب بات ہے کہ ان تمام باتوں میں جس پر اعتبار نہ ہونا چاہیے، اُسی ایک بات پر یقین آتا ہے۔

سامنے گہرائی میں دریائے سندھ بہہ رہا تھا۔ کچھ نوجوان اس میں نہا رہے تھے یا شاید مچھلیاں پکڑ رہے تھے۔ ہو سکتا ہے پانی پینے اُترے ہوں۔ لیکن پانی کافی ریتلا تھا۔ میں نے سینکڑوں میل اوپر لدّاخ میں بھی ایسا ہی گدلا پانی دیکھا تھا۔ لوگ غٹا غٹ پی رہے تھے اس یقین کے ساتھ کہ اس پانی سے معدے یا گردے میں کوئی تکلیف نہیں ہوتی۔

میں نے حاجی سلطان زرصاحب سے پوچھا کہ یہاں ہزارہ کے لوگ اس ریتلے پانی کے بارے میں کیا کہتے ہیں؟

جواب ملا —— "یہاں بھی اسی طرح کا رجحان ہے۔ یہاں پر جو لوگ دریا کے قریب ہیں وہ دریا کا پانی استعمال کرتے ہیں اور جو دریا سے دور ہیں وہ پہاڑی چشموں کا پانی استعمال کرتے ہیں۔ اس میں بھی اکثر ریت شامل ہوتی ہے لیکن یقین کیجیے کہ کسی کے گُردوں میں پتھری نہیں بنتی اور اگر بنتی بھی ہے تو ڈاکٹر یہ کبھی نہیں کہتے کہ یہ ریتلے پانی کی وجہ سے بنی ہے۔ یہ پانی

اتنا طاقتور ہے کہ آپ چاہے جتنا زیادہ کھانا کھائیں، اوپر سے اس پانی کا صرف ایک گلاس پی لیں، سارا کھانا ہضم ہو جاتا ہے اور جو لوگ جا کر اس پانی میں تیرتے اور نہاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان کی بھوک کھل جاتی ہے اور ریتلے پانی سے انہیں کوئی نقصان نہیں پہنچتا۔"

سلطان زر صاحب کی باتیں ختم ہوئیں تو میں بازار کی سیر کو نکلا جس میں دکانیں کم اور ہوٹل اور چائے خانے زیادہ تھے۔ ظاہر ہے کہ پاکستان کی اتنی اہم شاہراہ پر آتے جاتے لوگ یہاں ٹھہر کر کھاتے پیتے ہوں گے۔

تمام طعام خانے میزوں، بنچوں، کرسیوں اور گاہکوں سے بھرے ہوئے تھے۔ چولہوں پر پتیلیاں اور کیتلیاں چڑھی ہوئی تھیں اور قریب ہی تنور دہک رہے تھے۔ میں ان چائے خانوں میں گیا اور ان میں کام کرنے والے نوجوانوں سے باتیں کرنے لگا۔ ایک بیرے سے میں نے پوچھا: "آپ تعلیم یافتہ ہیں؟"۔

"ہاں"

"کتنی تعلیم ہے آپ کی؟"

"میٹرک تک"

"کہاں پائی تعلیم آپ نے؟"

"یہیں، تھاکوٹ میں"

"اور میٹرک کب پاس کیا تھا؟"

"ایک سال پہلے"

"اس کے بعد کوئی ملازمت ملی؟"

"نہیں ملی۔ اسی لیے ہوٹل میں کام کرتے ہیں۔ بہت لڑکوں نے میٹرک پاس کیا لیکن ان کو ملازمت نہیں ملی"

"تو اب آپ کیا کرتے ہیں؟"

"ہوٹل میں ٹیبل مین ہیں"

"یہ ہوٹل آپ کے کسی عزیز کا ہے؟"

"ہاں یہ ہمارے چاچا کا ہے —"

قریب ہی چائے خانے کا دوسرا نوجوان کھڑا ہماری باتیں سُن رہا تھا۔ میں اُس سے مخاطب ہوا — "آپ کیا کرتے ہیں؟ —"

"اسی ہوٹل میں کام کرتے ہیں —"

"آپ نے تعلیم پائی ہے؟ —"

"نہیں۔ تعلیم نہیں پائی —"

"ہوٹل میں آپ کیا کام کرتے ہیں —"

"ہم ٹیبل بین کا کام کرتے ہیں —"

"آپ کو تنخواہ ملتی ہے یا کمیشن ملتا ہے —"

"تنخواہ ملتی ہے —"

"تیس دن کے کام کا کتنا معاوضہ ملتا ہے آپ کو؟"

"ایں؟ —"

"کتنی تنخواہ ملتی ہے؟ —"

"سات سو روپئے —"

"آپ کے بچے ہیں؟"

"جی، ایک بچہ ہے"

"سات سو روپئے کافی ہیں آپ کے کنبے کے لیے؟ —"

"نہیں۔ بس گزارا ہو جاتا ہے"

"کیا خیال ہے آپ کی کتنی تنخواہ ہونی چاہیے؟ —"

"ہزار بارہ سو روپئے"

"آپ کا اپنا مکان ہے؟"

"ہاں چھوٹا سا ہے۔ گزارہ ہو جاتا ہے —"

"شادی کو کتنا عرصہ ہوا؟"

"چار سال۔"

مَیں نے پوچھا — "کیسی ہے آپ کی دلہن؟—"

اس کا چہرہ سُرخ ہوگیا اور شرما کر بولا — "اچھی ہے۔"

ذرا میری جرأت دیکھئے کہ ایک یوسف زئی پٹھان سے اس کی دُلہن کے بارے میں پوچھ بیٹھا۔ پتہ نہیں اسے اپنی جرأت کہوں یا حماقت مگر یہ جانتا ہوں کہ یہ بات اوپر پہاڑوں میں کسی کوہستانی سے نہیں پوچھ سکتا تھا۔ پوچھ لیتا تو آپ میری یہ تحریر نہ پڑھتے، میرے بارے میں کوئی ہولناک خبر سنتے۔

مگر پھر سوچتا ہوں کہ جیسے بھی ہیں، اچھے ہیں وہ لوگ بھی۔

دریائے سندھ اور شاہراہ قراقرم، ان دونوں کے کنارے تھا کوٹ آخری شہر تھا۔ میں رخصت ہونے لگا تو قریب قریب ساری آبادی خداحافظ کہنے کے لیے باہر سڑک پر نکل آئی۔ ذرا آگے چلا تو دریا کا رُخ بدلنے لگا۔ سڑک دوسری جانب مڑنے لگی اور دریائے سندھ کا ساتھ چھوٹ گیا۔ دریا نیچے ہزارہ کی وادیوں میں تربیلہ ڈیم کی طرف نکل گیا اور میں مانسہرہ اور ایبٹ آباد کی جانب چل پڑا۔ بس یہاں سے برہنہ پہاڑ ختم اور سبزہ زار شروع ہوئے۔ دونوں طرف چیڑ کے اونچے اونچے درخت، سڑکوں کے کنارے بلندی سے جھکی ہوئی گلاب کی بیلیں جن پر سات پنکھڑیوں اور دھیمے رنگوں والے پھول کھلتے ہیں۔

نیچے وادیوں میں جہاں گاؤں اور گھاس پھونس کے مکان دکھائی دیا کرتے تھے اب پتھروں کی نئی صاف ستھری عمدہ عمارتیں نظر آنے لگیں جن پر ٹین کی چھتیں اتنی نئی تھیں کہ دھوپ میں جھلملا رہی تھیں اور جن گہری وادیوں میں دھوپ کی رسائی نہیں تھی وہاں ٹھنڈے سائے میں پہاڑی نالے ہلکا ہلکا شور مچا رہے تھے۔

جو بچے بھیڑ بکریاں چرا رہے تھے ان کے ہاتھوں میں چھڑیاں تھیں جن سے وہ کبھی کسی چٹان کو مارتے اور کبھی خود اپنی ہی ایک ٹانگ کو مگر ریوڑھ چھوڑ کر جانے والی بکری کو کبھی کسی نے نہیں مارا —

میں پہاڑوں سے نیچے اتر رہا تھا نیچے سے راہ گیر اُوپر آ رہے تھے۔ ہم قریب سے گزرے تو انہوں نے سلام ضرور کیا بلکہ سلام میں پہل کی۔ کہیں دیہاتی عورتیں پانی کے گھڑے اٹھائے جا رہی تھیں، غیر مرد کو آتا دیکھ کر انہوں نے گھڑے کا کاندھا بدل دیا تاکہ چہرہ گھڑے کی آڑ میں چھپا رہے۔

کہیں کہیں گاؤں کے اسکولوں میں چھٹی ہوئی تھی۔ ملیشیا کی وردی، پٹو کی ٹوپی اور کینوس کے جوتے پہنے سینکڑوں بچے خوشی خوشی گھر لوٹ رہے تھے۔ جو بچے چٹانوں کے پچھواڑے تھے اور نظر نہیں آ رہے تھے ان کی آوازوں سے ان کی خوشی ٹپکی پڑتی تھی۔

رفتہ رفتہ دریا کا شور مدھم ہو گیا اور چیڑ کی اونچی شاخوں میں ٹھنڈی ہوا سرسرانے لگی کہ اچانک سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے ایک بزرگ کے گانے کی آواز سنائی دی۔

یہ نیلا چھنگ کا علاقہ تھا۔ سڑک کے قریب ایک چائے خانے کے سامنے چارپائیوں پر بیٹھے ہوئے لوگ نہایت گندی پیالیوں میں نہایت بدرنگ اور اس سے بھی زیادہ بدمزہ چائے پی رہے تھے اور سامنے سڑک کے دوسرے کنارے پر بیٹھے ایک بزرگ گانے میں مصروف تھے خوب تھا ان کا گانا ـــــ انسان کی تخلیق سے شروع ہوا اور قصۂ یوسف و زلیخا کی طرف نکل گیا اور اللہ ہو، کے نعرۂ مستانہ پر ختم ہوا ـــ میں بزرگ کے قریب گیا۔ ادب سے انہیں سلام کیا اور پوچھا "بابا، آپ کی عمر کتنی ہے؟"

کہنے لگے "مجھے چھوڑو اور زمین کی فکر کرو۔ وہ بہت تیزی سے بوڑھی ہو رہی ہے۔"

زمین کی فکر کسے نہیں۔ یہ تو زمین ہی کی فکر کرنے کا زمانہ ہے۔ یہی سوچتا ہوا میں اپنے اگلے پڑاؤ پر پہنچا تو دیکھا کہ لوگوں نے زمین کی دیوار اٹھا دی ہے اور دو پہاڑوں کے درمیان تیسرا پہاڑ کھڑا کر کے میرے دریا کا راستہ روک دیا ہے۔

یہ تربیلہ ڈیم تھا۔ پاکستان کے سب سے بڑے دریا پر کھڑا ہوا سب سے بڑا ڈیم۔ اس کے پیچھے دریا کا پانی جمع تھا۔ سچ پوچھیے تو توانائی کا بڑا خزانہ جمع تھا۔ میں سوچنے لگا کہ یہاں تربیلہ سے وہاں اوپر اسکردو تک پانی کیسا بپھرا ہوا تھا۔ اس کی توانائی اکٹھا کر لی جائے تو زمین کی چھاتی دہل جائے۔

اس پر مجھے مشہور تاریخ داں احمد حسن دانی کی بات یاد آگئی وہ ایک مرتبہ ایک جرمن ماہر کو تھاکوٹ سے اسکردو تک لے گئے۔ ماہر نے جو دریائے سندھ کو چٹانوں سے سر ٹکراتے دیکھا تو دانی صاحب سے جو کچھ کہا وہ انہوں نے مجھے بھی بتایا:

"وہ کہنے لگا کہ اللہ تعالیٰ نے اتنی توانائی دی ہے اور اس دریا میں اتنی طاقت ہے کہ اگر آپ اسے بروئے کار لائیں تو نہ صرف پورے پاکستان بلکہ پورے وسط ایشیا کو بجلی مہیا کر سکتے ہیں۔"

جس کسی نے دریائے سندھ کو دیکھا ہے، اس کی توانائی کا اندازہ لگانے کے لیے اس کا ماہر ہونا ضروری نہیں۔ برہنہ آنکھ بتا دیتی ہے کہ اس کی قوت کو سمیٹا جائے تو پوری سرزمین کی جھولی بھر جائے۔

ایک زمانے میں تجویز تھی کہ اسکردو کو بڑی سی جھیل بنا کر وہاں سے بجلی پیدا کی جائے۔ پھر منصوبہ بنا کہ بُنجی کے مقام پر جہاں دریائے سندھ ننگا پربت کے گرد چکر کاٹ کر میدانوں کی سمت مڑتا ہے وہاں بند باندھ کر اور ننگا پربت کے نیچے سے سرنگ نکال کر بجلی پیدا کی جائے۔

لیکن اب اُدھر نیچے باشا کے مقام پر بہت گہری وادی میں ڈیم اٹھانے کی تجویز ہے۔ اگر یہ ڈیم بُنجی میں بنتا تو آبادی اس کی جھیل میں غرق نہ ہوتی۔ اگر یہ ڈیم باشا میں بنا تو چلاس سمیت سارے گاؤں، قصبے، پُرانے آثار، سارے تاریخی مجسّمے، قدیم بستیوں کے آثار اور چٹانوں پر تراشے ہوئے تاریخی نقش و نگار، سب دریا بُرد ہو جائیں گے۔ آج کے انسان کی بستیاں ڈوبیں گی اور کل جو انسان گزر گیا، اس کی نشانیاں مٹیں گی۔

خیر۔ یہ لمبی بحث ہے۔

تربیلہ ڈیم تک پہنچنا آسان نہیں۔ اس پر سخت پہرہ ہے۔ آنے جانے والوں سے بہت باز پرس ہوتی ہے۔ میں بھی ان سارے مرحلوں سے گزرا۔ نام، ولدیت، قوم، سکونت، یہ سب درج کرا کے اونچی نیچی پہاڑیوں میں بل کھاتی سڑکوں سے گزر کر میں اُس جگہ پہنچا جہاں سامنے تربیلہ ڈیم کھڑا تھا۔ وہ منظر دیکھا تو جا سکتا ہے، بیان نہیں ہو سکتا۔

ڈیم کے اوپر سے گزر کر میں اس جگہ پہنچا جہاں سامنے تربیلہ ڈیم کے نظارے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ باغ لگے ہیں، پھول کھلے ہیں، چائے خانے میں پشتو گانوں کے ریکارڈ بج رہے ہیں اور

باپ اپنے بچوں کو کاندھوں پر بٹھائے تربیلہ ڈیم دکھانے لا رہے ہیں۔

وہاں بہت سے لوگوں سے ملاقات ہوئی۔ ان میں ممتاز حسن بھی تھے جو ۱۹۶۸ء سے ۱۹۷۵ء تک تربیلہ ڈیم کی تعمیر میں خود بھی شریک تھے۔ میں نے ممتاز حسن سے پوچھا کہ جب یہ ڈیم پورا ہوا، اس کا سارا کام ختم ہوا اور جیسے مصوّر اپنی تصویر مکمل کرنے کے بعد پیچھے ہٹ کر اُسے دیکھتا ہے، اس کے معماروں نے جب پیچھے ہٹ کر اسے دیکھا ہوگا اس وقت یہاں کام کرنے والے ہزاروں لوگوں کی کیا حالت تھی؟

وہ کہنے لگے "میں نے لوگوں کو کبھی اتنا خوش نہیں دیکھا۔ وہ جشن کے دن تھے۔ مجھے یاد ہے جب ٹی وی کمپنی، ڈھلنگھم کمپنی اور ڈیکو کمپنی نے اپنا کام مکمل کیا اور وہ اپنی بڑی بڑی مشینوں کو گاڑیوں پر لاد کر واپس روانہ ہوئے تو راستے بھر میلہ لگا ہوا تھا۔ وہ مشینیں اتنی بڑی بڑی تھیں کہ اگر راہ میں سڑک کے اوپر بجلی کے تار آجاتے تو مزدور ان تاروں کو بانسوں کے ذریعے اونچا کرتے تب مشینیں گزرتیں۔ اور بعض مشینوں کو گزارنے کے لیے یہ تار کاٹنے پڑتے اور جوں ہی مشینیں گزر جاتیں، تار دوبارہ جوڑ دیئے جاتے۔"

میں نے پوچھا "جب ڈیم کی تعمیر کا کام اپنے عروج پر ہوگا اس وقت رات دن کام ہوتا ہوگا، مشینوں کا شور مچتا ہوگا، رات بھر اجالا رہتا ہوگا، دن بھر پہاڑ کاٹے اور ڈھوئے جاتے ہوں گے۔ آپ کو یاد ہے؟——"

ممتاز حسن نے صرف ایک مثال دے کر پورے منظر کی تصویر کھینچ دی۔ کہنے لگے —"لوگ بڑی محنت کرتے تھے البتہ جمعے کی شام ہم لوگ نہا دھو کر، کپڑے بدل کر غازی جاتے تھے، وہاں کھانا کھاتے تھے، دو سینما تھے، ان میں فلمیں دیکھتے تھے۔ یقین کیجیے کہ بارہا یہ ہوا کہ ہم خالی میدان دیکھتے ہوئے گئے اور واپس آئے تو دیکھا کہ اسی میدان میں ایک بڑا کارخانہ لگ گیا ہے۔ چند گھنٹوں میں ویرانوں کے حلیے بدل جایا کرتے تھے۔ اتنی تیزی سے اور اتنا آٹومیٹک کام ہو رہا تھا۔ ایسے ہی مناظر لوگوں کے لیے دلکشی کا باعث بنتے اور وہ ایک عجیب سی خوشی محسوس کرتے۔"

میں نے پوچھا "مگر اس دوران حادثے بھی ہوتے ہوں گے۔ جانیں بھی جاتی ہوں گی۔"

ممتاز حسن بولے ــــ "جی ہاں۔ بہت زیادہ حادثے ہوتے تھے۔ بہت لوگ مرتے تھے۔ خصوصاً بجلی کی ڈرل بہت جان لیوا تھی۔ پہاڑیوں کو توڑ ڈالنے والی یہ ڈرل بے حد طاقتور ہوتی تھی اور جب کبھی مزدوروں کے قابو سے باہر ہو جاتی تھی تو بڑی تباہی مچاتی تھی۔ بجلی کے جھٹکے لگنے سے بہت لوگ مرتے تھے۔ پہاڑی تودے گرنے سے بھی بہت اموات ہوئیں۔ بہت لوگ پانی میں گرے اور پھر ان کا نشان تک نہیں ملا۔"

وہیں میری ملاقات ضلع صوابی کے مشتاق احمد صاحب سے ہوئی۔ صوابی کا علاقہ ڈیم سے نیچے ہے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کی بستیوں اور آبادیوں کے اوپر یہ پہاڑ جیسا ڈیم کھڑا ہے۔ اس کی تعمیر کے فائدے تو بہت ہیں۔ اس سے کیا کچھ نقصان بھی ہوا ہے؟

وہ بولے "ہاں، نقصان یہ ہوا ہے کہ یہ سارا علاقہ سیم اور تھور کی لپیٹ میں آگیا ہے۔ زمین کے نیچے سے نمکیات پانی کے ساتھ اوپر آگئے ہیں۔ فصلیں کافی حد تک متاثر ہوئی ہیں۔ حکومت ابتدا سے کوشش کر رہی ہے کہ بیمار زمینوں کا کوئی علاج نکل آئے، سیم و تھور ختم ہو جائے ــــ"

میں نے پوچھا ــــ "ڈیم بننے سے نیچے بستیوں کے لوگ خوش ہیں؟ ــــ"

کہنے لگے ــــ "اب تو خوش ہیں۔ شروع میں ڈر گئے تھے۔ ان سے چند میل اوپر ایک پورا سمندر کھڑا تھا، لوگ خوفزدہ تھے کہ کہیں کوئی حادثہ نہ ہو جائے، کئی مرتبہ تو افواہیں اڑیں یا خوف پھیلا اور لوگ بھاگنے کے ارادے کرنے لگے۔ مگر اب صورتِ حال مختلف ہے۔ کبھی کبھی انہیں یہ کہہ کر ڈرایا جاتا تھا کہ اگر جنگ چھڑ گئی تو دشمن کے ہوائی جہاز بمباری کر کے ڈیم کو تباہ کر سکتے ہیں۔ اب یہ لوگ کہتے ہیں کہ فکر کی کوئی بات نہیں۔ ہم اپنا انتظام کر لیں گے۔ ہم طیارہ شکن توپیں لگا کر اپنا بچاؤ کر سکتے ہیں۔"

میں نے مشتاق احمد صاحب سے پوچھا: "آپ جانتے ہیں کہ دریائے سندھ پر نیچے کالا باغ ڈیم بنانے کی تجویز بھی ہے۔ آپ ایک ڈیم بنتا ہوا دیکھ چکے ہیں۔ اب اس دوسرے ڈیم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟"

کہنے لگے: "مجھے کئی سرد ٹرمل چکے ہیں اور میرا اپنا خیال ہے کہ کالا باغ ڈیم بن جانا چاہیے۔ یہ درست ہے کہ کئی سیاسی لیڈر اس کے خلاف آواز اٹھاتے رہے ہیں۔ بلاشبہ اس میں کچھ فنی

مسئلے تھے مگر اب وہ مسئلے حل کر لیے گئے ہیں۔ ڈیم کی تعمیر سے جو جھیل بنے گی اس کی سطح کافی کم کر دی گئی ہے لہٰذا نسبتاً کم علاقے زیرِ آب آئیں گے۔ بہرحال ہمارے ملک کو برقی قوت کی شدید ضرورت ہے۔ اگر کچھ علاقے زیرِ آب آجاتے ہیں تو یہ ضروری تو نہیں کہ ہم وہیں رہیں۔ ہم پاکستان کے کسی بھی خطّے میں رہ سکتے ہیں۔"

یہ تھے مشتاق احمد صاحب جو کالا باغ ڈیم کی تعمیر کی خاطر اپنی زمینیں چھوڑ کر چلے جانے کے لیے تیار ہیں اور یہ ہے وہیں موجود ایک جذباتی نوجوان جو کالا باغ ڈیم کی تعمیر کا سخت مخالف تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ اس کی کیا رائے ہے، کالا باغ ڈیم بننا چاہیے یا نہیں؟

جواب بالکل صاف تھا۔ "نہیں ـــ بالکل نہیں۔ کالا باغ ڈیم بنے گا تو صوبہ سرحد میں پٹھانوں کی زمینیں ڈوب جائیں گی۔ چارسدہ کے سارے میدانی علاقے میں پانی پانی ہو جائے گا۔ لوگ کیا چاہتے ہیں، کیا پٹھان مہاجر بن کر دوسرے علاقوں کو چلے جائیں؟"

کالا باغ ڈیم بننا چاہیے۔

کالا باغ ڈیم نہ بننا چاہیے۔

جہاں تک یہ دریا چلا، وہاں تک یہ بحث بھی چلی۔

ڈیم سے اتر کر میں دریا کے کنارے کنارے چلنے لگا۔ میں سوچنے لگا کہ تربیلہ ڈیم کی تعمیر سے یہ جو علاقہ پانی پانی ہو گیا، اس کے باشندے کہاں گئے۔ کیا مہاجر بن کر دوسرے علاقوں کو سدھارے یا حکام نے انہیں بڑے پیار سے ان کے آبائی ٹھکانوں سے اٹھایا اور بڑے چاؤ سے نئی بستیوں میں بسا دیا۔ مجھے یاد تھا کہ بے گھر ہونے والوں کے لیے سڑکیں، پل، مسجدیں، مینار اور مکان سبھی بن رہے تھے، وہ کدھر ہیں؟

یہ سن کر میرے میزبانوں نے میری انگلی تھامی اور ان کی ایک بستی میں پہنچا دیا۔ منہ سے تو نہ بولے، اشارے سے کہا، ملاحظہ فرمائیے۔

وہ بستی اجڑنے والوں کے حوالے نہیں کی گئی تھی بلکہ حالات، دھوپ اور بارش کے رحم و کرم پر چھوڑ دی گئی تھی۔ اس کی ہر چیز ادھوری تھی اور جو کبھی پوری رہی ہوگی اُسے برسات کا پانی کاٹ کاٹ کر بہائے لیے جا رہا تھا۔ جیسے کنوؤں کے اندر چنی ہوئی اینٹیں سطح زمین کے اُوپر مینار بن کر

کھڑی ہوجایا کرتی ہیں۔

میں نے اتنے مایوس، اتنے اداس لوگ کہیں نہیں دیکھے۔ سب کی گردنیں جھکی ہوئی تھیں۔ بچے بھی کھیل نہیں رہے تھے بلکہ منڈیروں پر خاموش بیٹھے تھے۔

میں گیا تو سب میرے گرد جمع ہو گئے۔ اپنے پُرانے دنوں اور اچھے دنوں کے قصّے سنانے لگے اپنے باپ دادا کی ہڈیوں کے غرقاب ہونے کے منظر بیان کرنے لگے۔ نئی بستیوں اور نئے مکانوں کی نوید کے وہ پہلے پہلے احساسات انہیں یاد آنے لگے —— اور پھر جب ڈیم کھڑا ہو گیا اور نویدیں ڈھے گئیں تو مجھے وہ اپنے منہدم جذبات یوں دکھانے لگے جیسے کوئی کسی کو گھاؤ دکھاتا ہے۔

میں اچھا بھلا گنگناتا، مسکراتا گیا تھا، ان ہی کی طرح گردن ڈھلکائے مایوس لوٹا۔ میں سوچنے لگا کہ اتنے بڑے دریائے سندھ کے کنارے ہر جگہ میری بولی، میری زبان بولنے والے لوگ ملے۔ کیا یہاں ایسا نہیں ہو سکتا کہ ان لوگوں کی زبان کوئی اور ہوتی، میری زبان کوئی اور۔

دریا چُپ ہے

دریائے سندھ یوں تو خاموشی سے بہا جا رہا ہے لیکن اگر اس کے منہ میں زبان ہوتی تو یہ رات دن تاریخ کی داستانیں سنایا کرتا۔ یہ بتایا کرتا کہ کیسے کیسے لشکروں نے اسے پار کیا۔ کیسی کیسی فوجیں اس کے کنارے آپس میں ٹکرائیں اور کب کب اس کا پانی سُرخ ہوا۔

دریائے سندھ کے دو کناروں پر دو مقامات ایسے ہیں جو میں خاص طور پر دیکھنا چاہتا تھا: پشاور کی جانب ہنڈ اور راولپنڈی کی طرف حضرو۔

شمال سے جو لشکر ہندوستان آیا کرتے تھے ان کے گھوڑے اسی ہنڈ کے مقام پر دریا میں اترتے تھے اور احتیاط سے قدم اٹھاتے ہوئے اسی حضرو کے قریب دوسرے کنارے پر چڑھتے تھے۔ یہی کنارہ چھچھ کہلاتا ہے۔ میں اسی چھچھ کو دیکھنے حضرو پہنچا۔

کہتے ہیں کہ ۲۴ میل چوڑا اور بارہ میل لمبا یہ علاقہ پیالے کی شکل کا اور پان کے پتے جیسا ہے۔ اس کے تین کنارے اونچے اور چوتھا کنارہ نیچا ہے، بالکل جیسے اپنی طرف دانے پھٹکنے کا چھاج ہوتا ہے۔ پرانی کتابوں میں لکھا ہے کہ پہلے اس علاقے کا نام چھچ تھا۔

حضرت عیسیٰ سے ۳۲۷ سال پہلے سکندر اعظم اسی چھچھ کے گاؤں ملاح میں داخل ہوا تھا۔ سنہ ایک ہزار کے ذرا بعد راجا آنند پال اور محمود غزنوی کی لڑائی یہیں حضرو کے مقام پر ہوئی اور سید احمد شہید نے یہیں سکھوں سے ٹکر لی تھی اور مولانا ظفر علی خاں کو یہیں حضرو میں مجرم قرار دیتے ہوئے سزائے قید کا حکم سنایا گیا تھا۔

میں حضرو پہنچا تو شہر کے گرد خونخوار فوجیں نہیں بلکہ سرسبز فصلیں کھڑی تھیں۔ کھیتوں میں ٹیوب ویل اور ٹریکٹر چل رہے تھے۔ زمین سے ہرے پودے پھوٹے پڑ رہے تھے اور ہوا تک کی رنگت سبز

ہو گئی تھی۔ کسانوں کے بیٹے شہر کے انٹر کالج کی طرف جا رہے تھے اور دکانیں کھل رہی تھیں۔

ہندوؤں اور سکھوں کے زمانے کے مکان دیکھتا ہوا جن کے چاروں طرف قلعہ نما بڑے بڑے پھاٹک ہیں اور اندر اونچی اور پختہ عمارتیں ہیں، تنگ سڑکوں سے گزرتا ہوا جن پر نئے زمانے کی موٹر گاڑیاں نہیں چل سکتیں، میں حضرو کے کوٹلہ بازار پہنچا جہاں میری ملاقات محمد روح اللہ خاں صاحب سے ہوئی۔ یوں تو وہ کے سامان کی دکان چلاتے ہیں مگر غزل بھی کہتے ہیں اور ادب سے بھی گہرا تعلق ہے۔ اس چھوٹے سے شہر سے چھوٹا سا ادبی رسالہ نکالتے ہیں اور شعر و سخن کی محفلیں آراستہ کرتے ہیں۔

میں نے محمد روح اللہ خاں صاحب سے پوچھا کہ آپ کے شہر حضرو اور آپ کے علاقے چھچھ کا اب کیا حال ہے، اس میں اب کیسے لوگ آباد ہیں؟

وہ کہنے لگے "یہاں پر مختلف لوگ آباد ہیں۔ ان میں پٹھان بھی ہیں، کشمیری بھی ہیں۔ قریشی بھی ہیں۔ اور بہت سے کام کرنے والے لوگ ہیں۔ ویسے بھی حضرو ایک قدیم شہر ہے جس کی تاریخی لحاظ سے بہت اہمیت ہے۔ البتہ کاروباری لحاظ سے یہاں کچھ نہیں ہے۔ یہ ضرور ہے کہ پاکستان بننے کے بعد بہت فرق پڑا ہے۔ کاروبار بھی بڑھا ہے۔ تعلیمی پسماندگی دور ہوئی ہے۔ لوگ اپنے بچوں کی تعلیم میں دلچسپی لے رہے ہیں۔ ایک انٹر کالج بن گیا ہے اور اب سنا ہے کہ لڑکیوں کے لیے بھی کالج کھولنے کی کوشش ہو رہی ہے۔

یہاں زیادہ تر لوگ زراعت پیشہ ہیں۔ اسی وجہ سے یہاں زراعت بھی بہت ہے۔ ہر قسم کی پیداوار ہے۔ گندم اور مکئی خوب ہوتی ہے۔ اب لوگ سبزیوں کی طرف بھی توجہ دے رہے ہیں۔ اس علاقے میں نہریں نہیں ہیں آبپاشی کنوؤں سے ہوتی ہے لیکن یہ لوگ محنت کر کے خوب سینچائی کرتے ہیں۔ کیمیاوی کھاد کا استعمال اچھی طرح سیکھ گئے ہیں اور اس سے بھی فائدہ اٹھاتے ہیں۔

زراعت میں تو ترقی ہوئی ہے، البتہ اگر صنعت بھی ہوتی تو بہت فائدہ ہوتا۔ مشکل یہ ہے کہ یہاں قدرتی گیس نہیں ہے۔ اب اگر کوئی صنعت لگانا بھی چاہے تو گیس نہ ہونے کی وجہ سے اپنا ارادہ بدل دیتا ہے ــــ"

اس پر میں نے کہا کہ روح اللہ صاحب۔ وہ پہاڑ جیسا تربیلہ ڈیم آپ کے پچھواڑے ہے جہاں کی گھن گرج میں خوب بجلی پیدا ہو رہی ہے، آپ کے علاقے میں تو توانائی کی ریل پیل ہونی

چاہیے تھی۔

جواب ملا — " نہیں صاحب۔ تربیلہ یقیناً بہت قریب ہے لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ تربیلہ کی بجلی ہمیں نہیں ملتی۔ ہمارے لیئے بجلی درسک سے آتی ہے۔ تربیلہ قریب ضرور ہے مگر اُس سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں "

محمد روح اللہ خاں صاحب اپنے دھیمے اور شُستہ لہجے میں بول رہے تھے۔ وہ بتا رہے تھے کہ اس علاقے کے بہت سے لوگ انگلستان، ہانگ کانگ اور مشرق وسطیٰ گئے ہوئے ہیں اور وہاں سے اپنے گھروں کو پیسہ بھیجتے ہیں جس سے علاقے کی معیشت سدھر گئی ہے۔

حضرو سے ہم دریا کے ساتھ ساتھ تربیلہ کی طرف چلے تو چھوٹا سا قصبہ غورغشتی آگیا۔ کسی نے کہا کہ یہ چھوٹا انگلستان ہے۔ میں خود ٹھہرا انگلستان کا باشندہ۔ یہ بات سنتے ہی اپنی کار سے اُتر گیا اور اب غورغشتی میں داخل ہوا تو وہاں منظر ہی دوسرا تھا۔ باہر سے تو وہ ویسا ہی قصبہ تھا جیسے پنجاب اور ہزارہ کے قصبے ہوتے ہیں۔ اینٹوں کے مکان، گندی نالیاں اور کھلی زمینوں پر گرے ہوئے پرانے مکانوں کے ملبے کے ڈھیر۔

لیکن جو مکان سالم کھڑے تھے ان کے اندر جا کر دیکھا تو وہاں کی دنیا ہی مختلف تھی۔ آرام دہ کمرے۔ آراستہ نشست گاہیں، خوش نما خواب گاہیں، جدید طرز کے غسل خانے اور گھریلو استعمال کا بجلی کا سارا ساز و سامان موجود تھا۔ پختہ فرش، اچھے قالین، کھڑکیوں پر عمدہ پردے، نیا فرنیچر، جھلملاتے ریفریجریٹر اور ایئر کنڈیشنر دیکھ کر دل خوش ہوا۔

غورغشتی کی ان گلیوں میں جو چیز دیکھ کر حیرت ہوئی وہ قدم قدم پر کھلے ہوئے بینک تھے۔ اتنے چھوٹے سے قصبے میں اتنے بہت سے بینک مجھے عجوبہ لگے۔

میں نیشنل بینک کے دفتر میں جا پہنچا۔ وہاں بینک کے منیجر اشتیاق حیدر صاحب موجود تھے۔ ان سے باتیں ہونے لگیں۔ بتا رہے تھے کہ اس علاقے کے بہت سے لوگ انگلستان میں آباد ہیں۔ میں نے کہا کہ آپ تو بینک چلاتے ہیں، ان لوگوں کی اقتصادی حالت کا آپ کو اچھی طرح اندازہ ہو گا۔

کہنے لگے — " یہ لوگ بہت سمجھ دار ہیں، اگر یہ باہر سے پیسہ لائے تو اُس پیسے سے انہوں

نے سرمایہ کاری کی۔ انہوں نے بڑے شہروں میں، پراپرٹی میں، ٹرانسپورٹ میں، صنعت اور زراعت میں کافی رقم لگائی۔ اب تو بہت سارے لوگ اُس ملک کو خیرآباد کہہ کر آ گئے ہیں۔ یہاں ان کی اپنی پراپرٹی ہے، ان کے صنعتی اور کاروباری ادارے ہیں۔ وہ پلانٹ لگا رہے ہیں، تعمیراتی کام کر رہے ہیں، زمینوں سے بہت آمدنی ہے۔ ان کے پاس اتنے وسائل ہیں کہ یہ جب چاہیں کافی بڑے پراجیکٹ شروع کر سکتے ہیں۔"

اشتیاق حیدر صاحب سے میں نے پوچھا کہ یہ جو آپ کا چھوٹا انگلستان ہے یہاں بڑے سماجی مسئلے بھی ہوں گے۔ یہاں کے نوجوان جو انگلستان میں رہتے ہیں ان کی ذہنیت بدلی ہوگی، رسم و رواج بدلے ہوں گے، وہ سفید فام بیویاں بیاہ کر لاتے ہوں گے۔

جواب ملا — "جی نہیں۔ یہ لوگ اپنے مذہب اور اپنی روایات پر سختی سے قائم ہیں۔ خالص پاکستانی ذہن ہے ان کا۔ شاید ہی یہاں کے کسی نوجوان نے غیر ملکی عورت سے شادی کی ہو۔ یہاں کا رواج تو یہ ہے کہ یہ اپنے بیٹے لے جاتے ہیں، بیٹیاں لے آتے ہیں۔ اکثر شادیاں طے شدہ ہوتی ہیں اور کامیاب ہوتی ہیں۔ یہاں کا سارا نظام قدیم روایت اور ثقافت پر ہے۔"

اب میں نے بینک کے منیجر صاحب سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ باہر کے ملکوں سے لوگ پہلے جتنا پیسہ بھیجا کرتے تھے کیا اب بھی بھیجتے ہیں؟۔ میں نے تو سنا ہے کہ بینکوں کے ذریعے آنے والے زرمبادلہ میں کمی آ گئی ہے۔

وہ فوراً ہی بولے۔" آپ کی بات سے میں اتفاق کرتا ہوں۔ پہلے جائز ذرائع سے جتنی رقم آیا کرتی تھی وہ اب نہیں آ رہی ہے۔ اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے کے لیے بہت وقت درکار ہوگا لیکن یہ ضرور ہے کہ بعض لوگ دوسرے ذریعوں سے رقم بھیجنے لگے ہیں اور کچھ لوگوں کے مفادات اور ترجیحات مختلف ہیں۔ اس لحاظ سے رقم کی ترسیل اطمینان بخش نہیں ہے۔"

میں نے اشتیاق حیدر صاحب سے پوچھا کہ پورے علاقہ چھچھ کی کیا صورتِ حال ہے۔ یہاں کتنے بینک ہیں اور چھوٹے قصبوں کے لوگ بھی خوشحال ہیں یا نہیں؟

انہوں نے کہا۔" جی، یہاں سارے ہی کمرشل بینکوں کی شاخیں موجود ہیں۔ اس علاقے کے بارے میں مشہور ہے کہ یہاں ہر آدھے کیلو میٹر پر ایک کمرشل بینک ہے۔ یہاں غورغشتی سب سے

بڑا قصبہ ہے لیکن چھوٹے چھوٹے قصبوں میں بھی لوگ خوش حال ہیں اور وہاں بھی بینکوں میں اسی طرح زرمبادلہ آتا ہے جیسے غورغشتی میں۔"

اشتیاق حیدر صاحب کے بعد میری ملاقات غورغشتی کے سرکردہ شہری شوکت زمان خاں صاحب سے ہوئی۔ پڑھے لکھے ہونہار نوجوان ہیں۔ کبھی انگلستان میں رہتے ہیں، کبھی پاکستان میں۔ اپنے علاقے اور اس کے باشندوں کے مسئلوں سے خوب واقف ہیں۔ میں نے شوکت زمان خاں صاحب سے پوچھا کہ اس علاقے کے تقریباً سارے ہی باشندے برطانوی پاسپورٹ کے مالک ہیں، اس کا علاقے کے باشندوں پر، ان کے ذہنوں پر اور رسم ورواج پر کیا اثر پڑا ہے؟

انہوں نے کہا "اثر تو بہت زیادہ پڑا ہے۔ ہماری پرانی رسوم میں کافی تبدیلی آئی ہے۔ لوگ کشادہ ذہن ہوگئے ہیں۔ اس کے علاوہ خوش حال ہیں چنانچہ ان کے حالات بہت حد تک سنور گئے ہیں۔ رسم ورواج اور عادتیں بھی تبدیل ہوئی ہیں۔"

میں نے شوکت زمان خاں صاحب سے پوچھا کہ یہاں آپ لوگوں کے پاس کافی پیسہ ہے، پھر آپ اپنی بستیوں کی حالت بہتر کیوں نہیں بنواتے۔ حکومت کا ہاتھ بٹایئے۔ وہ آپ کی مدد ضرور کرے گی۔ وہ کہنے لگے کہ ہم نے تو حکومت کا ہاتھ بٹانے کی بہت کوشش کی ہے۔ میں نے پوچھا: پھر حکومت سے آپ کو کچھ نہیں ملا۔

وہ بولے ـــــ "جی، میرے خیال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ ہم بہت چاہتے ہیں کہ یہاں ایک اسپتال بن جائے مگر صرف چھوٹی سی ایک ڈسپنسری ہے جس کے قیام کے لیے ہم نے بھی رقم دی، انگلستان سے بھی عطیے آئے۔ ہم نے حکومت سے کہا کہ وہ ایک اسپتال بنوا دے تو ہم اور عطیے دیں گے۔ لیکن آج تک تو وہ بنا نہیں۔ اللہ کرے یہ مسئلہ جلد حل ہو جائے۔ اب رہی علاقے کی صفائی، اس پر بھی کسی کی کوئی خاص توجہ نہیں ہے۔ بس اتنا ضرور ہے کہ لوگوں نے اپنی کوشش اور اپنی محنت سے معیار زندگی بلند کیا ہے۔"

آخر میں اس علاقے کے جذباتی مسائل کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے شوکت زمان خاں صاحب سے پوچھا کہ اس علاقے کے اتنے بہت سارے لوگ برطانیہ چلے گئے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہوا کہ کنبے تقسیم ہوگئے زیادہ تر لوگ چلے گئے اور باقی یہیں رہ گئے۔

کہنے لگے — "جی ہاں۔ ایسی بھی کئی مثالیں ہیں لیکن میں ایک لڑکی کی مثال دیتا ہوں۔ اس کے والد باہر ہیں، والدہ باہر ہیں، دو بہنیں اور بھائی بھی باہر ہیں۔ لڑکی یہیں ہے جس کو یہ لوگ ویزا نہیں دے رہے ہیں۔ اس نے دو مرتبہ اپیل کی، ٹریبونل کے سامنے بھی گئی لیکن ویزا نہیں ملتا۔ یہاں وہ اکیلی رہتی ہے، دیکھ بھال کرنے والا بھی کوئی نہیں ہے۔ آج کل وہ سخت بیمار ہے اور اس کی ماں اپنے دوسرے بچوں کو چھوڑ کر آئی ہے اور اس کی نگہداشت کر رہی ہے۔ انگلستان میں اس کے والد کا اپنا مکان ہے، دوسرے رشتے داروں کے اپنے مکان ہیں۔ انہوں نے اپنی بچی کو اسپانسر بھی کیا لیکن اسے ویزا نہیں مل رہا ہے۔"

آخر میں شوکت زمان خاں صاحب نے بڑی دکھ دینے والی بات بتائی۔ یہ جو خاندان بٹ گئے ہیں۔ یہ جو کنبوں کا بٹوارا ہو گیا، اس نے غور غشتی اور چھچھ کے لوگوں کو بڑے کرب میں ڈال دیا ہے اور جن گھروں میں آسودگی آئی ہے ان کے گھر والوں کی آنکھوں میں آنسو بھی آئے ہیں۔

وہ اپنے مخصوص لب و لہجے میں بتانے لگے: "دیکھیں جی۔ ہمارے لوگ انگلستان گئے مزدوری کی غرض سے تو بہت اچھے اثرات مرتّب ہوئے اُس سے۔ لوگوں میں خوش حالی آئی۔ کچھ شعور بھی پیدا ہوا، لیکن کچھ مسائل بھی پیدا ہوئے۔ وہ مسائل اب یہ ہیں کہ ہمارے کنبوں کے مسئلے پیدا ہو گئے ہیں کہ ہم لوگوں کی شادیاں عموماً بڑے بوڑھے طے کرتے ہیں۔ اب اگر انگلستان میں رہنے والا ہمارا کوئی لڑکا یہاں وطن آ کر شادی کرتا ہے تو وہ تو بآسانی اپنی بیوی کو لے جا سکتا ہے لیکن زیادہ واقعات اب یہ ہو رہے ہیں کہ انگلستان میں رہنے والی ہماری کسی لڑکی کی شادی پاکستان میں رہنے والے مرد سے ہوتی ہے تو اس کے لیے ویزے کا مسئلہ ہوتا ہے جس کے لیے اسے دو دو تین تین سال انتظار کرنا پڑتا ہے۔ جو ثبوت اب وہ ویزا کے لیے مانگ رہے ہیں، وہ بھی کافی سارے لوگ مہیا کر دیتے ہیں اس کے باوجود انہیں اپیلوں پر اپیل کرنا پڑتی ہے اور طویل انتظار کرنا پڑتا ہے۔ اب بہت سی مثالیں میں آپ کو دے سکتا ہوں کہ شادیاں ہو گئیں، ان کے بچے بھی وہاں انگلستان میں پیدا ہوئے اور دو دو تین تین سال کے ہو گئے ہیں لیکن والد اپنے بچوں کو دیکھنے کے لیے ترس رہا ہے اور اسے انگلینڈ جانے کی اجازت نہیں مل رہی ہے۔"

تو یہ حضرو تھا اور یہ ہنڈ ہے۔ پاکستان کا بہت چھوٹا سا گاؤں لیکن تاریخ کا بہت بڑا شہر!
دھوپ چمک رہی ہے۔ ذرا نیچے دریائے سندھ خاموشی سے بہہ رہا ہے اور بہت پرانے درخت کے سائے میں کنوئیں پر رہٹ چل رہا ہے اور بیل کے گھنگھروؤں کی آواز گونج رہی ہے۔ اس گاؤں کے دروازوں، قلعے کے کھنڈروں کی دیواروں، محمود کے سپاہیوں کی قبروں، دریا کی لہروں اور سندھ کے ان کناروں نے پچھلے ہزاروں برسوں میں ایسی ایسی نہ جانے کتنی آوازیں سنی ہوں گی۔ کبھی آریاؤں کے قافلوں کے قدموں کی چاپ، کبھی اشوک کے جلوسِ شاہانہ کے باجے، کبھی سکندر اعظم کے رتھوں کی گڑگڑاہٹ، کبھی حاکم غزنیں کی فوجوں کے نقارے اور طبل، کبھی چنگیز خان کے لشکرِ جرّار کے نعرے اور کبھی بابر کی توپوں کو کھینچنے والے گھوڑوں کی ٹاپیں —— اس چھوٹے سے گاؤں ہنڈ کی چھاتی کو خدا جانے کس کس نے روندا اور پامال کیا ہوگا۔
میں جن دنوں ہنڈ گیا، ماہ رمضان کے آخری دن تھے۔ دریا کے اِدھر اٹک میں روزہ تھا، دریا پار کرتے ہی جہانگیرہ میں عید تھی اور دریائے کابل کے پار تربیلہ کی جانب روزہ تھا۔ میری کار بڑی سڑک سے اتر کر دریائے سندھ کی طرف مڑی اور کھیتوں کے درمیان ایک چھوٹی سی سڑک پر دوڑنے لگی۔ کچھ دور جا کر نہریں نظر آئیں، سرسبز کھیت نظر آئے۔ ان کے درمیان ایک بینک نظر آیا اور پھر سپاٹ دیواروں والے مکانوں اور بے رونق گلیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہی ہنڈ تھا۔
دریا کے اونچے کنارے پر پتھروں اور اینٹوں کے بنے ہوئے پُرانے مکان تھے۔ کچی گلیاں تھیں جن میں لگے بجلی کے کھمبے تھے۔ کہیں کہیں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں۔ بے حد پرانے قلعوں اور عمارتوں کے کھنڈر تھے اور بس!
آج کی دنیا نہیں جانتی کہ کبھی عظیم الشان مملکت گندھارا کا یہ شاندار پایۂ تخت تھا اور یہ ہند میں داخل ہونے کا راستہ تھا اور اس کا پرانا نام اُدہند تھا۔
ہنڈ، اس کے پُرانے نام اور اس کی تاریخ کے بارے میں برصغیر کے نامور تاریخ داں ڈاکٹر احمد حسن دانی نے بہت دلچسپ باتیں بتائی تھیں:
" یہ ہنڈ، جس کا پرانا نام اُدبھانڈپور تھا، اودے کے معنی ہوتے ہیں پانی کے اور بھانڈ کے

معنی ہوتے ہیں برتن کے، یعنی وہاں پر برتنوں کو باندھ کے کشتی بناتے تھے اور اس سے وہ دریا پار کرتے تھے، اس لیے وہ شہر جہاں سے کہ انڈس کو پار کیا جاتا ہے اُس کشتی پر جسے ہم برتنوں کو اکٹھا کر کے بناتے ہیں، اس لیے اس کا نام اُدبھانڈ پور ہوا۔ اور یہ قدیم ترین جگہ ہے جہاں سے انڈس کو پار کیا جاتا تھا۔ سکندر، بابر، چنگیز خان ان سب کی گزرگاہ یہی تھی۔ وہاں پر آپ نے ایک قلعہ دیکھا ہوگا۔ وہ مغلوں کا قلعہ ہے۔ اس سے پہلے کا ہندو شاہی کا قلعہ بھی وہاں موجود ہے۔ محمود غزنوی کے زمانے کے قبرستان بھی وہاں ہیں، کتبے بھی وہاں موجود ہیں، مسجدیں بھی ہیں، دروازے بھی وہاں موجود ہیں —— تو وہ ہنڈ قدیم ترین کرانگ رہا ہے۔ لیکن جب مغل یہاں پر آئے تو ان کی یوسف زئی قبائل کے ساتھ بڑی لڑائی تھی اور یوسف زئی اُس زمانے میں اور آج بھی مردان میں اور سوات میں آباد ہیں، وہ ہمیشہ ان کو آتے جاتے ستاتے تھے۔ اور گزرنے نہیں دیتے تھے تو اکبر نے پہلی دفعہ ۱۵۸۶ء میں اٹک کے مقام پر کرانگ بنائی، بنارس سے ملاح لا کر اس نے کشتیوں کا پُل بنایا اور دریائے کابل کے شمال میں جو سڑک جاتی تھی اسے چھوڑ کر دریائے کابل کے جنوب میں آج جو سڑک پشاور جاتی ہے، اس سڑک کو بنایا۔ اس طرح ۱۵۸۶ء کے بعد سے ہنڈ کی کرانگ قریب قریب ختم ہوگئی اور وہ راستہ کھلا جس پر ہم آج پشاور جاتے ہیں۔"

یہ تھے ڈاکٹر احمد حسن دانی۔ اور یہ ہیں ہنڈ کے باشندے جو مجھے گاؤں کی گلیوں میں ملے اور ذرا دیر میں دوست بن گئے اور پھر دیر تک گلے ملے۔ ان ہی میں فضل رحمان صاحب تھے۔ دریا کے کنارے پیدا ہوئے اور سمندری فوج میں ملازم رہے۔ مجھے اپنی سرزمین کے بارے میں بتا رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ یہاں بہت پرانی قبریں موجود ہیں اور بعض قبریں مکانوں کے اندر بھی ہیں؟

کہنے لگے "اس کے متعلق عام طور پر کہتے ہیں کہ یہاں جہاد ہو چکے ہیں، مثلاً سید احمد شہید یہاں آئے تھے۔ ہم نے کتابوں میں پڑھا ہے کہ سلطان محمود غزنوی بھی اسی راستے سے آئے تھے اور یہاں پر لڑائیاں ہوئی تھیں۔ اُس وقت شہید ہونے والوں کے مزارات گاؤں میں ہیں۔"

مَیں نے پوچھا "بعض تاریخی قبریں گھروں کے اندر ہیں؟"

"جی ہاں۔"

"مگر کیوں؟ ــــ"

جواب ملا ــــ "ہوا یہ کہ لوگوں نے گھر بنائے۔ انہیں پتہ نہیں تھا کہ نیچے کوئی قبر ہے۔ عام طور پر یہ ہوا کہ بعد میں ان لوگوں کو کسی طرح معلوم ہوا یا خواب میں اشارہ ملا کہ یہاں کوئی دفن ہے، چنانچہ ان کی قبریں بنادی گئیں اس کے علاوہ ہم لوگ غریب ہیں۔ اپنے مویشی بھی گھروں کے اندر باندھتے ہیں۔ ان کی گندگی ہوتی ہے جس سے قبر کی بے حرمتی ہوتی ہے، لوگوں نے خواب میں شہیدوں کو دیکھا جنہوں نے بتایا کہ ہم یہاں دفن ہیں۔"

میں نے فضل رحمان صاحب سے پوچھا کہ آپ تو اس علاقے کو خوب جانتے ہیں، تاریخ اور روایت کیا کہتی ہے، پرانے زمانے میں شہر ہنڈ کیسا تھا؟

خالص کتابی انداز میں جواب ملا ــــ "اُس وقت یہ گندھارا کا پایۂ تخت تھا۔ چار مربع کیلومیٹر پر پھیلا ہوا تھا۔ باغات تھے۔ لوگ خوش حال تھے۔ آبادی معمولی تھی اور اس جگہ کی بہت شہرت تھی کیونکہ جتنے بزرگانِ دین آئے یا مسلمان بادشاہ اور فاتحین آئے اور دریائے سندھ عبور کرکے ہندوستان یا پنجاب گئے وہ سب یہیں سے گزرے اس لیے یہ بہت اہم جگہ تھی۔"

میں نے پوچھا ــــ "اور اب بتایئے۔ نیا ہنڈ کیسا ہے۔ اس کے لوگ کیسے ہیں۔ اس کی حالت کیسی ہے؟ ــــ"

جواب ملا ــــ "اب تو لوگ اچھے ہیں، ان کی حالت اچھی ہے۔ ان کے پاس پیسے ہیں، اچھی زندگی ہے۔ ماڈرن زمانہ آگیا ہے۔ تعلیم آگئی ہے۔ لوگ غیر ممالک کو چلے گئے ہیں یا گھوم پھر کر دنیا دیکھ چکے ہیں البتہ بعض دوسری چیزیں ہیں جن کی وجہ سے پریشانی ہے۔"

میں نے کہا ــــ "جی ہاں۔ وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں۔ آپ کے بائیں ہاتھ پر اور پشت پر دو نوجوان ہتھیار بند کھڑے ہیں، کیوں؟ ــــ"

انہوں نے کہا ــــ "یہاں کا ماحول کچھ اچھا نہیں۔ ہر آدمی کو اپنی عزت اور زندگی کی فکر ہے۔ اسی لیے آپ یہ ہتھیار دیکھ رہے ہیں۔"

میں نے ایک ہتھیار بند نوجوان سے بات کی۔ اس کا نام امان اللہ تھا۔ میں نے کہا کہ اتنے خاموش اور پرسکون علاقے میں آپ ہتھیار سنبھالے کیوں کھڑے ہیں؟۔

نوجوان نے، جو بار بار اپنی خود کار رائفل کو پھسلنے سے روک رہا تھا، تمام سادہ لوح نوجوانوں کی طرح صاف بات کہہ دی "یہاں کچھ لوگوں سے ہماری دشمنی ہے۔ وہ زور زبردستی کرتے تھے۔ ڈرا دھمکا کر لوگوں سے پیسے مانگتے تھے۔ زبردستی ان کے مویشی ہانک لے جاتے تھے۔ اس پر ہمارے بزرگ سید حکومت شاہ بادشاہ نے سب لوگوں کا اجلاس بلایا کہ عزت دار لوگ کیا کریں۔ چنانچہ ہم نے ہتھیار اُٹھائے اور حملہ کر کے دشمن کو گاؤں سے بھگا دیا۔"

"پھر آپ ہتھیار سنبھالے کیوں کھڑے ہیں؟—"

"اندیشہ پہلے بھی تھا۔ اب بھی ہے۔"

"کیا اس علاقے میں پہلے بھی جھگڑے ہوتے تھے؟—"

امان اللہ نے جواب دیا— "چھوٹے موٹے جھگڑے ہوتے تھے۔ بس تو تو میں میں ہوتی تھی اور بات وہیں ختم ہو جاتی تھی۔ ہتھیار نہیں ہوتے تھے۔ مگر اس زمانے کا دشمن بہت خراب ہے۔ اس نے لوگوں کو بڑا تنگ کیا تھا۔ اب وہ مفرور ہے اور ہم گاؤں پر پہرہ دے رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا— "امان اللہ— ہنڈ میں کتنا اسلحہ ہوگا؟"

ذرا سے توقف سے وہ بولا— "ہمارے گاؤں میں تو بہت اسلحہ ہے—"

دیکھا آپ نے؟ وقت نے ہمیں اور ہم نے وقت کو بدل ڈالا ہے۔ میں یہاں قدیم بستی دیکھنے آیا تھا، جدید کلاشنکوف دیکھنے کو ملی۔

وہ جو تاریخ کے ہر دور میں ایک شہر کے کھنڈر کے اوپر دوسرا اور دوسرے کے کھنڈر کے اوپر تیسرا شہر آباد ہوتا رہا ہوگا وہ سب خاک تلے دبے ہوئے تھے۔ تاریخ کی بے شمار داستانیں مٹی میں ملی ہوئی تھیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ نے نہ انہیں کھودا، نہ ان کی تحقیق کی۔ انہیں کھودا تو خود ہنڈ کے باشندوں نے، لیکن تاریخ کو چھاننے کی خاطر نہیں، اپنے نئے مکانوں کی تعمیر کے لیے پتھر نکالنے کی خاطر۔

میں نے اُس چوڑی سڑک کے نشان دیکھے جو بلندی سے دریا میں اترتی جاتی تھی۔ میں نے دریا کے پانی سے کٹے ہوئے کنارے دیکھے اور ان کٹے ہوئے کناروں کے اندر تہ بہ تہ جمے

ہوئے پرانے شہروں کی دیواریں، منڈیریں اور فصیلیں دیکھیں۔
کسی نے اگر تحقیق نہ کی تو اور کچھ برس کی بات ہے، اس تاریخ شہر کے سارے نشان مٹ جائیں گے۔
خیر! وہیں میری ملاقات سید عنبر شاہ سے ہوئی۔ کبھی اسلام آباد میں اور کبھی ہنڈ میں رہتے ہیں۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ اس گاؤں کے باشندوں کو روزی کیسے ملتی ہے؟ وہ کیا کام کرتے ہیں؟
ان کا جواب سنیے ——" یہ دریا بہت سے لوگوں کے روزگار کا ذریعہ ہے۔ کچھ لوگ تو دریا کے پانی اور ریت سے سونا نکالتے ہیں۔ انہیں سونا نکالنے کا طریقہ آتا ہے۔ کچھ لوگوں کا روزگار دریا پار کے جنگل میں ہے۔ وہاں وہ مویشی پالتے ہیں اور اس کی نسل بڑھاتے ہیں اور فروخت کرتے ہیں۔ یہاں کے جانور لے جاکر وہاں پالتے ہیں اور خشک لکڑی لاکر فروخت کرتے ہیں"
آپ نے سنا؟ لوگ دریائے سندھ سے سونا بھی نکالتے ہیں۔ مجھے بعد میں پتہ چلا کہ ہزاروں لوگوں کی روزی اسی سے ہے۔ ہفتوں تپتی دھوپ میں بیٹھ کر دریا کی خاک چھانتے ہیں تو چند ذرّے سونے کے ہاتھ آتے ہیں۔
مگر اس دریا کی خاک اور اس کے پانی کی تاثیر کی جو تفصیل اس روز مجھے فضل رحمان صاحب اور دوسرے احباب نے بتائی وہ کسی دلچسپ داستان سے کم نہیں۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ دریا کا اور آپ کا کتنا پرانا ساتھ ہے؟ اس کے ہمراہ آپ کا بچپن کیسا گزرا تھا؟
وہ بولے —" ہمارے بچپن میں تو حساب یہ تھا کہ ہم دوپہر کو ڈٹ کر کھانا کھاتے تھے۔ اُس کے بعد ماں باپ کہتے تھے کہ سو جاؤ، گرمی بہت زیادہ ہے، دریا پر نہ جانا، ڈوب جاؤ گے۔ ہمیں یہ ہدایت کرکے وہ خود سو جاتے۔ جیسے ہی ان کی آنکھ لگتی ہم چوروں کی طرح دریا پر پہنچ جاتے۔ مگر یقین کیجئے۔ جون جولائی اور اگست کے مہینوں میں آگ برستی تھی، دریا کا پانی برف سے بھی زیادہ ٹھنڈا ہوتا تھا۔ ہم جوں ہی پانی میں غوطہ لگاتے ہم پر کپکپی طاری ہوجاتی اور ہمیں فوراً ہی نکل کر گرم ریت میں لوٹنا پڑتا، تب کہیں بدن میں گرمی آتی۔ کچھ دیر نہانے کے بعد ہم واپس گھر آتے۔ والدہ کوئی کام بتاتیں یا بازار سے کچھ لانے کو کہتی تھیں اور ہم چنگیر ٹٹول رہے

ہوتے کہ صبح کا یا کل کا کوئی روٹی کا ٹکڑا بچا ہو تو پہلے اسے کھائیں پھر کام پر جائیں۔

کئی بیماریوں کا قدرتی علاج اسی پانی سے ہوتا تھا۔ بچوں کو پھوڑے پھنسیاں ہو جاتیں تو ان کے لیے نہ ڈاکٹر تھے اور نہ دوا کے لیے پیسے۔ بس ان کو یہاں لے آتے تھے۔ اینٹ کا ٹکڑا پتھر پر رگڑا اور اُس کی سرخی پھوڑوں پر لگا دی، اگلے ہی روز بالکل ٹھیک ہو جاتے تھے۔

بچوں کی ختنہ کے وقت بھی یہاں کا رواج یہ تھا کہ دوسرے دن بچے کو دریا پر لاتے تھے اور صبح شام پانی میں بٹھاتے تھے۔ دو تین دن میں وہ بالکل ٹھیک ہو جاتا تھا۔

اس وقت ڈاکٹر تو تھے نہیں۔ حکیم علاج کرتے تھے اور اکثر مریضوں کو مشورہ دیتے تھے کہ دریا کے کنارے مہینہ دو مہینہ گزارو ٹھیک ہو جاؤ گے۔ دنیا بھر سے مریض یہاں آتے تھے۔ یہاں اچھا خاصہ میلہ لگا رہتا تھا۔ وہاں نیچے بڑے بڑے چھپر تھے جن میں مریض قیام کرتے تھے اور ایک میلے کا سماں ہوتا تھا۔ اب نہ پانی ویسا ہے نہ مریض ویسے۔"

مَیں نے پوچھا — "اب پانی کا ذائقہ کیسا ہے۔ اس کے پینے سے تکلیف تو نہیں ہوتی؟"۔

وہ بولے — "اب تو یہ پانی پینے کے کام کم ہی آتا ہے۔ اب اس کا وہ ذائقہ بھی نہیں رہا۔ تربیلہ ڈیم بننے سے پہلے یہ پانی بہت گدلا ہوتا تھا۔ آپ چلّو میں لیں تو ہتھیلی میں باریک ریت بیٹھ جاتی تھی مگر ہم غٹاغٹ پی جاتے تھے۔ نہ معدے میں کچھ ہوتا تھا نہ گردے میں۔ اب تو یہ پانی ڈیم کے ذخیرے میں کئی روز رُکا رہتا ہے۔ اب اس میں وہ تازگی اور وہ مٹھاس نہیں ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ گاؤں کے بڑے بوڑھے اصرار کر کے اب بھی یہی پانی پیتے ہیں۔ ہمارے گھروں میں ریفریجریٹر ہیں، برف ہے، سب کچھ ہے لیکن شام کو جب روزہ کھلے گا تو میرا لڑکا دریا سے پانی لائے گا کیونکہ میری ضعیف والدہ نے صاف کہہ دیا ہے کہ چاہے کچھ ہو جائے وہ آخر دم تک دریا کا پانی پئیں گی، دریائے سندھ کا پانی!"

درگاہوں کی دیواریں

باغ نیلاب سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔

یہ اٹک اور خوش حال گڑھ کے درمیان، دریائے سندھ کے کنارے ذرا اونچائی پر اب تو ایک چھوٹا سا گاؤں ہے مگر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں دریا سے لگی لگی یہ بہت بڑی آبادی تھی۔ لوگ یہاں سے دریا پار کیا کرتے تھے اور کہنے والے تو یہ بھی کہتے ہیں کہ شیر شاہ سوری کی عظیم شاہراہ یہیں سے شروع ہو کر مشرقی بنگال تک جاتی تھی۔ لیکن اسے جانے دیجئے اور پہلے میرے جانے کا قصہ سنئے۔

دریائے سندھ کے کنارے سفر پر نکلا تو یہ طے کر کے چلا کہ باغ نیلاب ضرور جاؤں گا اور وہ جگہ ضرور دیکھوں گا جہاں کہتے ہیں کہ شور مچاتا دریا اچانک چپ ہو جاتا ہے۔

باغ نیلاب تک ایک پکی سڑک بھی جاتی ہے چنانچہ میں نے ایک ٹیکسی لی اور اپنے ایک میزبان کے ساتھ اٹک سے روانہ ہوا جسے پہلے کیمبل پور کہا کرتے تھے۔ جب تک ٹیکسی بڑی سڑک پر چلتی رہی، خیریت رہی مگر جوں ہی باغ نیلاب کی جانب چھوٹی سڑک پر مڑی، یوں لگا کر ویرانے دیر سے ہماری راہ دیکھ رہے تھے۔ ٹیکسی پہاڑیوں میں دوڑ رہی تھی۔ نالوں کے اوپر بنے ہوئے ٹوٹے پھوٹے پلوں کو پار کر رہی تھی۔ کہیں بلا کی بلندی تھی۔ کہیں غضب کے نشیب تھے۔ یہ سب کچھ تھا مگر انسان کہیں نہیں تھا۔ کیا مجال کہ کوئی راہ گیر نظر آجائے۔ اور تو اور کہیں کوئی بھیڑ بکری بھی دکھائی نہ دی۔ اگر کہیں ایک دو جھونپڑیاں نظر آئیں تو وہ بھی خالی پڑی تھیں۔

اتنے میں ہمارے میزبان بول اُٹھے "یہ محمد خان ڈاکو کا علاقہ ہے۔ کم بخت راہ گیروں کو نہ صرف لوٹتا ہے بلکہ مار ڈالتا ہے ــــ"

اُن کا یہ کہنا تھا کہ ہمارے ڈرائیور نے ٹیکسی روک لی اور کہنے لگا کہ اُسے ڈاکوؤں کے ہاتھوں مرنا منظور نہیں۔ میزبان نے بہت کہا کہ ڈاکو ہمیں کچھ نہیں کہیں گے مگر ڈرائیور صاحب خفا تھے کہ انہیں پہلے کیوں نہیں بتایا گیا۔ اب وہ آگے نہیں جائیں گے ——

آخر میرا کتابی علم کام آیا۔ میں نے کہا کہ باغ نیلاب تو بزرگانِ دین کی بستی ہے۔ وہاں بابا نوری سلطان کی درگاہ ہے اور کئی دوسرے اولیأ آرام فرما رہے ہیں۔ ہم ان کی قدم بوسی کے لیے جا رہے ہیں۔ محمد خان ڈاکو ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

میرا یہ کہنا تھا کہ کار کو فرسٹ گیئر میں ڈالنے کی آواز آئی، اُس نے حرکت کی اور باغ نیلاب کی طرف دوڑنے لگی۔

پہاڑوں سے اتر کر میدانوں کی طرف بڑھتے ہوئے دریائے سندھ کے کنارے یہ شاید پہلا مقام ہے جہاں صوفیائے کرام اور بزرگانِ دین مدفون ہیں۔

ذرا ہی دیر بعد باغ نیلاب کا گاؤں اور دریائے سندھ کا پانی نظر آنے لگا۔ اٹک میں تو دریا کی گزرگاہ اتنی تنگ ہے کہ دریا اٹکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ باغ نیلاب سے ذرا اُوپر ایک گھاٹی نظر آئی جو اٹک سے بھی زیادہ تنگ ہے۔ وہاں ایک بڑی سی کشتی پھیرے لگا کر پنجاب کے مسافروں کو صوبہ سرحد میں اور سرحد کے مسافروں کو پنجاب میں اتار رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ باغ نیلاب سے ذرا نیچے دریا دوبارہ اتنا تنگ ہو جاتا ہے کہ ایک مقام پر سنا ہے کسی مغل بادشاہ یا جرنیل کے گھوڑے نے ایک جست لگا کر دریائے سندھ پار کر لیا تھا۔

خود باغ نیلاب میں آکر دریا نیلی چادر کی طرح پھیل گیا تھا۔ یہاں نہ چٹانیں تھیں نہ پتھر۔ بس ریت کا دامن پھیلا تھا جس پر دریا یوں خاموشی سے گزر رہا تھا جیسے دیر سے گھر آنے والا بچہ ماں کے خوف سے اپنے پنجوں پر چلا کرتا ہے۔

ہم باغ نیلاب کے گاؤں تک پہنچ گئے۔ اونچی پہاڑی کی چوٹی پر بابا نوری سلطان کا روضہ نظر آ رہا تھا اور وہاں تک پہنچنے کے لیے سینکڑوں سیڑھیاں تھیں۔ ہم دیر تک چڑھتے رہے تو وہاں پہنچے۔

بابا نیلے آسمان تلے آرام فرما رہے تھے۔ کھلے ہوئے احاطے کے درمیان ان کی قبر تھی۔ برابر

میں محرابیں بنی تھیں جن پر کبھی سفیدی کی گئی ہوگی مگر بعد میں درگاہ پر آنے والے نوجوانوں نے انڈے جیسی سفید دیواروں پر اپنے نام لکھ دیئے ؛ شکور۔ ابرار شاہ۔ افتخار۔ ریاض۔ باغ علی حبیب اقبال۔ عاجز۔ حامد شاہ۔ رئیس خان۔ امداد وغیرہ۔

ان دل والوں نے نہ صرف اپنے نام لکھے بلکہ جن کو دل دے آئے تھے ان کے اسمائے گرامی بھی لکھ دیئے ؛ نوشی۔ شائستہ وغیرہ۔

یہاں پہاڑی کے نیچے کوئی دو سو گھروں کا باغ نیلاب صاف نظر آرہا تھا۔ چوکور چھتیں یوں دکھائی دیتی تھیں جیسے بہت سے ڈبے اُس پر رکھ دیئے گئے ہوں۔ صاف ستھرے لپے پُتے مکان اور ان کے دالانوں میں دھوپ تاپتے ہوئے بکریوں کے جھبرے بچے۔

نیلاب کی درگاہوں پر فاتحہ پڑھتے ہوئے ہم گاؤں کی دوسری جانب ایک اور ٹیلے پر چڑھے۔ یہ بھی بڑی مقدس، بہت متبرک جگہ تھی۔ یہاں بھی فیوض و برکات کی روشنی پھوٹ رہی تھی۔ یہاں بہت سے چھوٹے چھوٹے بچے علم حاصل کر رہے تھے۔ پرائمری اسکول کی ایک معمولی سی عمارت کے باہر گرم دھوپ میں بیٹھے ہوئے تیس پینتیس بچے جھوم جھوم کر کتابیں پڑھ رہے تھے اور پس منظر میں دریا پنجوں کے بل خاموشی سے چل رہا تھا کہ کہیں بچوں کی تعلیم میں مخل نہ ہو۔

یہاں میری ملاقات اسکول کے استاد سجاد احمد صاحب سے ہوئی۔ ان کی بات ذرا دیر بعد۔ ان سے پہلے ایک بزرگ فدا حسین صاحب ملے۔ انھوں نے باغ نیلاب کے پُرانے دن دیکھے ہوں گے اور اپنے بزرگوں سے بہت کچھ سنا ہوگا۔ مَیں نے فدا حسین صاحب سے پوچھا کہ یہ بستی کتنی پُرانی ہے ؛

کہنے لگے ——" یہ بہت پرانی آبادی ہے۔ یہ دریا کے ساتھ ساتھ پوری آبادی ہے جو پٹھانوں کے ساتھ بھی ملتی ہے، اور ادھر جاکر کوٹ نواب خان سے مل جاتی ہے۔ لیکن ہمارے باپ دادا سے پہلے یہ آبادی ختم ہوگئی، یہ تھوڑا سا ٹکڑا ہے جو ہم نے آباد دیکھا ہے۔ ورنہ یہ بہت بڑی آبادی تھی ——"

اب مَیں نے فدا حسین صاحب سے پوچھا کہ آپ کے باغ نیلاب میں اتنے بہت سے بزرگوں کے مزار ہیں۔ اس علاقے میں ان بزرگوں کا آنا کب، کیسے اور کیوں ہوا ؛ انھوں نے اپنے

مخصوص انداز میں ساری بات کہہ سنائی ــ "یہ ہمارے باغ نیلاب میں جو بزرگ ہیں، ان کا کرنٹ بہت دور تک ہے۔ آپ پورے پاکستان میں پھر کر دیکھ لیں کہ ایسا نقشہ کسی اور جگہ نہیں ملے گا جو یہاں ملتا ہے۔"

فدا حسین کے بعد پرائمری اسکول کے استاد سجاد احمد صاحب سے باتیں ہونے لگیں۔ مَیں نے ان سے پوچھا کہ کچھ آپ نے کتابوں میں پڑھا ہے، کچھ اپنے بزرگوں سے سُنا ہے اس علاقے کے بارے میں؟

انہوں نے کہا: "ہمارے آباؤ اجداد بتاتے ہیں کہ تقریباً ساڑھے پانچ سو سال سے یہاں یہ زیارت اسی آن بان سے بنی ہوئی ہے۔ یہاں دو قومیں پہلے سے آباد تھیں، ان میں ایک ملہار قوم ہے اور دوسری قوم کو منہار کہتے ہیں۔

یہ لوگ چوڑیاں وغیرہ بناتے ہیں۔ یہاں کے لوگ ایک جوگی کو بہت مانتے تھے۔ اس دوران بابا نوری سلطان کو حکم ملا جس کے بعد یہ یہاں تشریف لائے اور لوگوں کو راہ راست پر لانے کی کوشش کی۔

اس کے بعد یہاں کھٹڑ قوم کابل سے آئی۔ اس کے بارے میں آباؤ اجداد سے یوں سنا جاتا ہے کہ شہاب الدین غوری کا زمانہ تھا، اس وقت کچھ لوگ تبلیغ کے لیے ہندوستان آئے۔ وہ لوگ جب کابل سے روانہ ہوئے تو وہاں کے بزرگ سے اپنے حق میں دعا کرائی کہ ہم ہندوستان جارہے ہیں، اللہ کریم اسلام کو سربلند کرے۔ کابل کے بزرگ نے ان سے کہا کہ اللہ تمہیں ضرور کامیاب کرے گا۔ تم پشاور شہر جاؤ۔ وہاں ایک ماشکی پانی بھر رہا ہوگا، اس سے رابطہ قائم کرنا۔

یہ لوگ پشاور پہنچ گئے اور قصہ خوانی بازار میں ایک ماشکی کو پانی بھرتے دیکھا ــ تاڑنے والے قیامت کی نظر رکھتے ہیں۔ ان لوگوں کو یقین ہوگیا کہ یہی وہ ماشکی ہے۔ انہوں نے اس سے پانی مانگا۔ وہ ہاڑ جیٹھ کا مہینہ تھا۔ اس نے مشک سے جو پانی دیا وہ بہت گرم تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ بابا یہ تو بہت گرم پانی ہے، ہمیں پینے کے لیے ٹھنڈا پانی دو۔ ماشکی نے وہ پانی دوسرے پیالے میں انڈیل دیا۔ اب جو ان لوگوں نے وہ پانی پیا تو وہ بہت ٹھنڈا تھا، برف جیسا۔ اس پر یہ لوگ خوش ہوگئے اور بولے کہ ہمیں آپ ہی کی تلاش تھی۔ ہم اسلام کی تبلیغ کے لیے پنجاب جارہے ہیں، ہماری

رہنمائی فرمائیں۔ اس پر ماشکی نے کہا کہ صوابی کے علاقے میں گاؤں ڈھیر ہے، وہاں ایک بابا ہے۔ ذات کا ملہار ہے۔ وہ مولیاں بیچ رہا ہوگا۔ اس سے رہنمائی حاصل کرنا۔

ان لوگوں نے ڈھیر میں ایک بابا ڈھونڈ نکالا لیکن اب اس کی پہچان ضروری تھی ــــ وہ مولیاں بیچ رہا تھا۔ ان لوگوں نے کہا کہ ہمیں میٹھی مولی دے دیجیے۔ بابا نے کہا کہ میں مولی کا ذائقہ بدل نہیں سکتا یہ پشاور کے ماشکی کا پانی نہیں کہ جب چاہیں گرم ہو جائے اور جب چاہیں سرد ہو جائے۔

یہ لوگ خوش ہو گئے اور بولے کہ بس ہمیں آپ ہی کی تلاش تھی آپ ہماری رہنمائی کیجیے اور ہمارے لیے دُعا کیجیے ــــ تو انہوں نے بتایا کہ آپ باغ نیلاب جائیے۔ وہاں پر پنجاب کا روحانی گورنر نوری سلطان بیٹھا ہے۔ آپ اُس سے رابطہ قائم کریں۔ اس کے بعد یہ لوگ باغ نیلاب آئے اور بابا کی محفل سے اتنے متاثر ہوئے کہ انہوں نے شہاب الدین غوری کو جواب دے دیا کہ میں اس سے آگے جا کر آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتا ہے۔ کابل سے آنے والے یہ لوگ کھٹڑ تھے۔ ان کے آنے سے یہاں کھٹڑ قوم آباد ہوئی۔ اب تو پورے اٹک میں جگہ جگہ ان کی املاک ہیں۔"

مَیں نے پوچھا کہ سُنا ہے اس جگہ دریائے سندھ بالکل خاموش ہے اور یہ بھی بزرگوں کی وجہ سے ہے۔

سجاد احمد بولے ــ"جی، ہم نے بھی سنا ہے۔ پشت در پشت لوگ کہتے آرہے ہیں کہ یہاں قرآن مجید پڑھا جا رہا تھا اور دریا کا بہت شور تھا، بابا نے دریا کو حکم دیا کہ تم خاموش ہو کر یہاں سے گزرو کیونکہ تمہارے شور سے قرآن پڑھنے میں خلل ہوتا ہے۔ اس پر دریا خاموش ہو گیا۔"

خلق خدا کی گفتگو جاری تھی۔ میں نے کہا کہ اس کے علاوہ یہ بھی سنا ہے کہ یہاں طغیانی نہیں آتی اور پانی اوپر تک نہیں آتا۔

کہنے لگے ــــ "جی ہاں۔ ایسی بات بھی سننے میں آئی ہے کہ گزشتہ میں ایک طغیانی آئی تھی اور دریا میں بہت بڑی لہر اُٹھی تھی اور پانی اوپر کو آرہا تھا اس وقت جو یہاں بزرگ تھے، جو نوری سلطان کی اولاد میں سے تھے، لوگوں نے ان سے درخواست کی کہ پیر صاحب آپ دُعا کریں کہ یہ پانی ہمیں بہا کر نہ لے جائے۔ سنتے ہیں کہ بزرگ نے ایک کھونٹا زمین میں گاڑا اور دریا

سے کہا کہ تم یہاں رُک جاؤ۔ لوگ کہتے ہیں کہ دریا کا پانی پھر کبھی اس کھونٹے سے اوپر نہیں آیا۔ اس زمانے کے کچھ لوگ موجود ہیں وہ بتاتے ہیں کہ بڑی زبردست لہر تھی لیکن پانی اوپر نہیں آیا۔"

اب میں نے سجاد احمد صاحب سے پوچھا کہ یہاں کچھ پُرانے زمانے کے آثار ہیں؟ کچھ پتہ چلتا ہے کہ فوجیں یہاں سے دریا پار کیا کرتی تھیں؟

انہوں نے کہا۔ "یہاں ایک قلعہ ہے جہاں سے مغلیہ دور میں فوجیں دریا پار کیا کرتی تھیں۔ اس قلعے کے چاروں کونوں پر چوکیاں تھیں، اب بھی ان کے نشانات موجود ہیں۔ وہ سامنے جو بڑے بڑے پتھر نظر آرہے ہیں، وہیں قلعہ بھی ہے۔"

میں نے سجاد احمد صاحب سے پوچھا کہ اور کیسے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت قدیم علاقہ ہے؟

کہنے لگے۔" یہ جو قبرستان ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت پرانا علاقہ ہے۔ اب آپ کو جتنے بھی کھنڈر نظر آرہے ہیں یہ سب کے سب قبرستان ہیں۔ اور سڑک کے ساتھ آپ جہاں بھی جائیں گے چھوٹے چھوٹے چبوترے دیکھیں گے۔ یہ سب قبرستان ہیں۔ گھوڑا مار تک یہ سب قبرستان ہے۔"

میں نے پوچھا کہ گھوڑا مار کیا جگہ ہے؟

"گھوڑا مار دریا سے تو تھوڑا دور ہے مگر کہتے ہیں کہ کسی زمانے میں فوج نے وہاں سے گھوڑے دریا پار اتارے تھے۔"

"ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ کسی بادشاہ نے گھوڑے کو ایک جست لگا کر دریا پار کر لیا تھا؟"

"جی۔ لوگ پشت در پشت کہتے آئے ہیں کہ یہاں ایک جست لگا کر دریا پار کیا گیا تھا۔"

سجاد احمد کی باتیں تمام ہوئیں۔ میں سوچنے لگا کہ کیسا تاریخی علاقہ تھا، اب کھنڈر ہو گیا ہے۔ جہاں محل کھڑے ہوں گے وہاں اب قبریں رہ گئی ہیں۔ جو نشانیاں وقت گزرنے کے ساتھ مٹ جایا کرتی ہیں، وہ آج تک موجود ہیں اور عظمت رفتہ کی داستانیں سنا رہی ہیں۔

باغ نیلاب سے اب مجھے کالا باغ جانا تھا ــــ خوب نام ہیں ان علاقوں کے۔ میری ٹیکسی جن پہاڑوں کی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی ان کا نام کالا پہاڑ تھا ــــ دور چٹے پہاڑ بھی نظر آرہے تھے۔ لیجیے۔ یہاں بھی گورے کالے کا بٹوارا ہو گیا۔

جھاڑیوں سے ڈھکے پہاڑی راستے پر بار بار مسافروں سے بھری ہوئی بسیں نظر آرہی تھیں۔

پھر بستیاں نظر آنے لگیں۔ ان کے اندر جدید قسم کے عمدہ، آرام دہ مکان، کوٹھیاں اور بنگلے نظر آنے لگے۔ ترقی یہاں تک پہنچ گئی تھی۔

بالآخر میری ٹیکسی ریلوے اسٹیشن پہنچی۔ پلیٹ فارم پر دودھ اور پتی کی چائے پیتے پیتے انتظار کے لمحے ختم ہوئے اور دور سے بھاری بھرکم ریل کار آتی نظر آئی۔ مجھے ماڑی انڈس جانا تھا۔ رات سر پر تھی اور مجھے معلوم نہ تھا کہ کہاں کس کے پاس جاؤں گا اور رات کہاں اور کیسے گزاروں گا۔

ریل کار رُکی۔ مَیں اندر داخل ہوا۔ ایک بزرگ بلند آواز میں کربلا کے شہیدوں کا مرثیہ پڑھ رہے تھے۔ میں خاموشی سے ایک طرف بیٹھ گیا اور سوچنے لگا کہ کالا باغ پہنچ کر رات بسر کرنے کا ٹھکانہ کیسے تلاش کروں گا۔

ذرا دیر بعد دوسرے مسافروں نے مجھ سے باتیں شروع کر دیں۔ تعارف شروع ہوا اور تکلف ختم ہوا۔۔۔ تھوڑی ہی دیر بعد میرے برابر بیٹھے ہوئے نوجوان نے مجھ سے کہا۔۔۔ "عابدی صاحب میرا گھر کمر مشانی میں ہے۔ وہاں آپ کو ہر طرح کا آرام ملے گا۔ کیا آج کی رات آپ میرے مہمان ہونا پسند کریں گے؟"

میرا ہاں کہنا تھا کہ نوجوان نے لپک کر میرا تھیلا میرے ہاتھ سے لے لیا گویا میرے سارے اختیارات اب اس کے ہاتھ میں چلے گئے۔ اب وہ میرا محافظ، رہبر اور رہنما تھا۔

کربلا کا ذکر اپنے خاتمے کو پہنچ رہا تھا اور ریل کار کے شور میں درویش کی دُعا کی صدا بلند ہو رہی تھی۔

ہاں تو میں داؤد خیل، کالا باغ اور کمر مشانی کے علاقے دیکھنے جا رہا تھا۔ میری ٹرین نے ماڑی انڈس پہنچ کر دم توڑ دیا کیونکہ وہ اس کا آخری اسٹیشن تھا۔ مَیں ٹرین سے اُترا۔ آگے آگے میرا تھیلا اٹھائے ہوئے میرا نوجوان میزبان تھا۔

دریائے سندھ کے کنارے ماڑی انڈس کے لوگوں کی آمدنی کا شاید سب سے بڑا ذریعہ یہی آتی جاتی ریل گاڑیاں تھیں۔ گاڑی سے اترنے والے مسافر قلیوں سے مال اسباب اٹھواتے ہیں، سامنے کے ہوٹلوں میں کھانا کھاتے ہیں اور ریلوے لائن کے کنارے کنارے کھڑی سوزوکی

ویگنوں میں سوار ہو کر اپنے اپنے ٹھکانوں کو جاتے ہیں۔

ویگن والے ایک ایک مسافر کا دامن اور آستینیں پکڑ کر اپنی اپنی گاڑی کی طرف کھینچ رہے تھے۔ ہم بھی اس گاڑی میں بیٹھ گئے جو ہمیں اگلے شہر لے جاتی جہاں سے ہمیں کمرشانی کی بس ملتی۔ ہماری ویگن روانہ ہوئی اور دریائے سندھ پر انگریزوں کے زمانے کے آہنی پل پر چلنے لگی۔ پل پر سڑک نہیں تھی، تختے بچھے تھے۔ ویگن کے پہیوں کے نیچے آنے والے ایک ایک تختے نے شور مچا مچا کر اپنے ہونے کی گواہی دی۔

اچانک نگاہ دریا کے پار گئی تو دریا کے کنارے چراغاں نظر آیا۔ نیچے دریا تھا۔ اس کے ساحل پر شاید پہاڑیاں تھیں اور ان پہاڑیوں پر غالباً قندیلیں روشن تھیں۔ اوپر تلے، آگے پیچھے، جیسے دیئے چن دیئے گئے ہوں۔ اور پھر ایک ایک روشنی نیچے دریا میں سایہ بن کر لہرا رہی تھی۔ دریائے سندھ کے ساحل کی رات کہیں بھی اتنی دلکش نہ تھی۔ میں نے اپنے میزبان سے پوچھا: اس اُجلی بستی کا کیا نام ہے؟ — جواب ملا — "کالا باغ"۔

میں سہم کر رہ گیا۔ جس سرزمین کے مقدر میں جاگیرداری اپنے سارے لوازمات کے ساتھ لکھ دی گئی ہو، وہ رات کے اندھیرے میں آنکھوں کو اتنا دھوکا دے سکتی ہے۔ میں یہ سوچ کر حیران تھا۔

ہماری ویگن دریا پار اتر گئی اور اونچی نیچی سڑکوں پر دوڑتی ہوئی ایک قصبے میں رُک گئی۔ اچانک ویگن کا کنڈیکٹر کسی جاگیردار کی طرح چنگھاڑا: "گاڑی اس سے آگے نہیں جائے گی"۔ اس کے تحکمانہ لہجے کی شان تھی یا شاید صدیوں کی روایت، ویگن کے سارے مسافر سر جھکا کر اتر گئے۔ نہ کسی نے شکایت کی، نہ کسی نے احتجاج کیا۔ حکم مانتے مانتے ان کا جو حال ہوا سو ہوا، خود میں نے بھی محسوس کیا کہ میرے اندر کا انسان مجھے چپ چاپ تعمیل کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔

اب ہم سڑک کے کنارے کھڑے ہو کر کسی دوسری سواری کا انتظار کرنے لگے۔ میرا میزبان ہر ویگن کو ہاتھ دکھا کر رکنے کی درخواست کرنے لگا۔ کچھ دیر بعد ایک ویگن رُکی۔ ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھولا اور تمام مسافروں سے کہا، بیٹھ جائیے۔

میں بھی سب کی طرح سر جُھکا کر ویگن میں داخل ہو گیا لیکن اس بار ڈرائیور کے حکم کی تعمیل نہ

کر سکا اور بیٹھ نہیں سکا۔ وہ مسافروں کو نہیں، مویشیوں کو لانے لے جانے والی ویگن تھی۔ اس کے اندر بیٹھنے کی نہیں، صرف کھڑے ہونے کی گنجائش تھی۔ جی چاہا کہ چاروں ہاتھ پیروں پر کھڑے ہو جائیں اور گوبر کی بو کی طرف سے اگر ناک نہیں پھیر سکتے تو کم سے کم آنکھیں تو پھیر ہی لیں۔

ذرا دیر بعد وہ قصبہ آگیا جہاں سے کرمشانی کی بس ملتی ہے۔ ویگن کے ڈرائیور صاحب نے ہمیں اتار دیا۔ ہم نے کرائے کی رقم دینا چاہی، انہوں نے لینے سے انکار کر دیا۔ بے شک گاڑی مویشیوں کی تھی مگر اتفاق سے ڈرائیور انسان نکلا۔

اب ہم جس بستی میں اترے وہ بارونق تھی۔ روشنی بھی تھی، چائے خانے بھی تھے، ان میں گراموفون ریکارڈ بھی بج رہے تھے۔ ہم خوش تھے کہ ذرا دیر بعد کرمشانی پہنچیں گے، وہ اس سے بھی بڑا قصبہ ہوگا۔ وہاں اس سے بھی زیادہ رونق اور اس سے بھی زیادہ روشنی ہوگی۔

اور ہمارا انتظار ابھی طول کھینچنے ہی والا تھا کہ بس آگئی۔ اچھی خاصی چمک دار، طاقتور اور مضبوط بس۔ ہم اس میں بیٹھے اور ابھی میزبان سے میری یہ بحث چل رہی تھی کہ کرائے کی رقم کون دے گا کہ اچانک بس نے غوطہ کھایا اور ایک سوکھے دریا کی تہ میں اُتر گئی۔

غضب ہوگیا۔ دریا کی تہ میں بچھی ساری کی ساری ریت اڑی اور کھڑکیوں کے راستے بس کے اندر اور ناک کے راستے پھیپھڑوں کے اندر سما گئی۔ یوں لگا کہ ہم مر جائیں گے۔ اور اس جاں کنی کے عالم میں باہر کی ہلکی ہلکی روشنی میں ہم صرف اتنا دیکھ پائے کہ سوکھے دریا میں آدھا اور ادھورا پل بنا ہوا ہے جس کے چند ستون کھڑے ہیں اور سیمنٹ کی شہتیریں پل کے اوپر نہیں، دریا کی تہ میں بچھی اپنے ادھورے پن کا نوحہ پڑھ رہی ہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہماری بینائی نے ہمارا ساتھ چھوڑ دیا۔ نظر آنا بند ہوگیا۔ ہم اپنے میزبان سے کہنے ہی والے تھے کہ ہمارے بعد ہمارے بال بچوں کا خیال رکھے کہ وہ ہم سے پہلے ہی بول اُٹھا "سر آپ کے چشمے پر گرد بیٹھ گئی ہے، اسے صاف کر لیجیے ـــ"

سوکھے دریا کے پار اتر کر ہم نے ادھورے پل کے ٹھیکے دار کے حق میں دعائے خیر کی، اپنے چشمے کے شیشے صاف کیے اور دوبارہ دیکھنا چاہا مگر آنکھوں کے آگے اندھیرا ناچ رہا تھا۔ ہم نے میزبان سے کہا "ہمیں کچھ نظر نہیں آرہا ہے" اس نے کہا "گھبرائیے نہیں، باہر اندھیرا بہت ہے"۔

یہ بات سن کر ہم نے صبر کیا ہی تھا کہ کمرمشانی کا محلہ تانی خیل آگیا۔ بس رُک گئی اور ہم دونوں اُتر گئے۔ پھر بس روانہ ہوگئی — کچھ دیر تک اس کی پچھلی سرخ روشنیاں نظر آتی رہیں۔ پھر وہ بھی اوجھل ہوگئیں اور گھٹا گوپ اندھیرے میں مجھے خود اپنی آواز صاف سنائی دی "میں کہاں ہوں"

جواب ملا — "کمرمشانی میں"

میں نے پوچھا — "تمہارا گھر کہاں ہے؟"

اس نے کہا — "وہ سامنے"

اور جب تک میں نے اس کی انگشت شہادت ٹٹول نہیں لی، وہ سامنے کا مطلب سمجھ میں نہیں آیا —

اب میں نوجوان میزبان کا ہاتھ پکڑ کر چلا تو اماں بہت یاد آئیں۔ وہ بچپن میں اسی طرح ہاتھ پکڑ کر چلاتی جاتی تھیں اور کہتی جاتی تھیں: میتوں میتوں، صندل کی پیتوں"

آخر گھر آگیا — دروازے پر دستک دی گئی، سارے گھر والے دروازہ کھولنے آئے۔ میرے میزبان نے فخریہ اعلان کیا "ذرا سوچو میرے ساتھ کون صاحب آئے ہیں"

پھر ہمارا تعارف کرایا گیا۔ اس کے بعد منہ دھلایا گیا۔ کاش یہ اس کے برعکس ہوتا۔

اب اگلی صبح کا احوال سنیے۔ دن کے اجالے میں باہر جھانک کر دیکھا تو کمرمشانی واقعی اچھا خاصا بڑا شہر نکلا۔ بینائی لوٹ آئی تھی چنانچہ اب تو میں شہری بن کر نکلا اور ذرا ہی دیر میں شہریوں میں گھل مل گیا۔

میں اہل شہر سے تاریکی کی شکایت کر رہا تھا۔ وہ کہنے لگے کہ اس سے زیادہ بھیانک تاریکی جہالت اور کم علمی کی ہے۔ ساری دنیا آگے نکلی جا رہی ہے مگر میانوالی کی تحصیل عیسیٰ خیل کا یہ سارا علاقہ جہل کے اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیا جاگیرداروں نے دبا رکھا ہے لوگوں کو؟۔

جواب ملا: جی نہیں۔ یہاں پیروں فقیروں کا زور ہے۔ دو چار کو چھوڑ کر باقی سارے پیر اَن پڑھ لوگوں کی گردنوں پر سوار ہیں اور ان کا خون چوس رہے ہیں۔

کمرمشانی کے بڑے بااثر، تعلیم یافتہ اور روشن خیال بزرگ عبدالغفور خاں صاحب سے یہی پیروں فقیروں کی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے پوچھا "آپ فرمائیے، پیر اس علاقے میں کتنے

بااثرہیں؟"

کہنے لگے — "میں مختصراً یہ عرض کرسکتا ہوں کہ ہم پیر کو ہمیشہ روشن ضمیر کے لقب سے یاد کیا کرتے تھے۔ اور ان کا نہایت ادب اور احترام کرتے تھے۔ لیکن اس زمانے کے پیر روشن ضمیر کی جگہ اب پیر تاریک ضمیر پیدا ہو گئے ہیں۔"

عبدالغفور خاں صاحب یہ باتیں کر رہے تھے کہ ان کے نوجوان اور ہونہار بیٹے عبدالرحمان خاں نے، جو اپنے علاقے میں ببلی خاں کے نام سے مشہور ہیں، کچھ اور داستانیں سنائیں۔ ایک پیر کے کہنے پر اس کے مریدوں نے کسی کے حق میں دُعائے خیر کی تھی۔ بعد میں پیر کی نیت بدل گئی اور وہ دوبارہ اپنے مریدوں کے پاس پہنچا۔ باقی داستان ببلی خان نے سنائی:

"ایک مرید نے تو اس حد تک کہا کہ پیر صاحب، اب ہم کیا کرسکتے ہیں، ہم تو دعائے خیر کر چکے ہیں، کہیں دعائے خیر بھی ٹوٹ سکتی ہے؟ تو پیر نے جواب دیا کہ پاگل، اگر مرشد کہے تو نکاح ٹوٹ جاتا ہے، دُعائے خیر تو کچھ بھی نہیں۔ یعنی اس حد تک یہ لوگ غریبوں کو بے وقوف بناتے ہیں۔"

پھر انہوں نے ایک اَور قصّہ سنایا: "اسی طرح ایک دن میں خود بیٹھا تھا۔ میرے سامنے ایک بالکل غریب عورت آئی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ اس نے پیر صاحب کو دس روپے نکال کر دیئے اور پیر نے قبول کر کے اپنی جیب میں ڈال لیے۔ میرا خیال تھا کہ عورت اتنی غریب ہے کہ اس کا دل رکھنے کے لیے دس روپے لے لیے ہوں گے لیکن چلتے وقت اسے سو پچاس دے کر جائے گا۔ لیکن نہیں۔ یہ دس اُس نے لے لیے اور عورت کے پاس دو روپے اَور تھے جو نیچے گرے تو عورت نے پیر صاحب کی طرف دیکھا۔ پیر نے اشارہ کیا اور عورت نے وہ دو روپے بھی اُٹھا کر اُسے دے دیئے۔"

ببلی خان کہنے لگے کہ یہاں پیروں میں بنے شِکنی کا رواج عام ہے۔ یہ اصطلاح میں نے پہلے کبھی نہیں سُنی تھی۔ مَیں نے پوچھا:

"یہ بنے شِکنی کیا ہوتا ہے؟"

"بنے شکنی ہمارے مذہب میں حرام ہے۔ وہ رقبہ جائیداد کسی اَور کی ہوتی ہے لیکن آپ

زور زبردستی سے اس پر قابو کر لیتے ہیں۔ اس کو کھاتے ہیں اور اس کا کرایہ وغیرہ، آدھا حصہ یا بٹائی نہیں دیتے اور زبردستی کھاتے ہیں۔ تو یہ پیر ایسے ہیں جو بنے شکنیاں بھی کھا رہے ہیں۔"

میں نے عبدالغفور صاحب سے پوچھا کہ کیا کبھی یہ بھی ہوا کہ کوئی بڑا مسئلہ کھڑا ہو گیا اور اُسے حل کرنے کے لیے علاقے کے سادہ لوح لوگوں کو کوئی پیر دستیاب نہ ہوا اور آپ کو کوئی فرضی پیر بنانا پڑا ہو؟

کہنے لگے — "جی ہاں۔ میرے اپنے وقت میں ہوا تھا ۱۹۴۶ء میں جب مسلم لیگ کے پہلے الیکشن تھے۔ عبدالستار خاں نیازی اُمیدوار تھے۔ ہم نے بڑی کوشش کی کہ ہمارے علاقے میں کوئی پیر اگر ہماری مدد کرے اور اپنی بزرگی کی کرامات دکھائے لیکن ہمیں کوئی پیر دستیاب نہ ہو سکا کیونکہ تمام پیروں کو دوسرے امیدوار پہلے ہی لے جا چکے تھے۔ لوگ مجبور کر رہے تھے کہ کہیں سے کوئی پیر لاؤ۔ ہم نے اپنے دوست انور بابری کو، جو موچی دروازے کے رہنے والے تھے، اچھا عمدہ کوٹ کابلی پیروں والا پہنا کر، سر پر سفید پگڑی باندھ کر، ہاتھ میں تسبیح دے کر آگے چلانا شروع کر دیا اور خود مرید بن کر پیچھے پیچھے چلنے لگے۔ اس کے بعد ہم جہاں بھی جاتے تھے، اس کو اعلیٰ درجے کی مسند پر بٹھا کر ہم دست بستہ اس کے سامنے بیٹھ جاتے تھے۔

لوگ پوچھتے تھے کہ یہ کون صاحب ہیں۔ ہم کہتے یہ کہ پیر گلبرگہ شریف ہیں، حیدر آباد دکن سے آئے ہیں۔ یہ پیروں کے پیر ہیں۔ لوگ ان کے گرد حلقہ ڈال کر بیٹھ گئے۔ انہیں صرف لبادے سے غرض تھی۔ انہیں یہ فکر نہیں تھی کہ اس لبادے کے اندر کون ہے۔"

میں نے پوچھا، "اچھا یہ بتائیے کہ پھر پیر صاحب کی کرامات نظر آئیں بعد میں؟"

جواب ملا — "جی ہاں۔ ہم کامیاب ہوئے۔ نیچے عبدالستار خاں نیازی کو کامیاب کیا، اُوپر فیروز خان نون کو کامیاب کرایا۔ بڑے شوق سے مسلم لیگ کو ووٹ ڈالے گئے حالانکہ اس علاقے میں اُس وقت مسلم لیگ کا نام بھی نہیں تھا۔"

عبدالغفور خاں صاحب کے بعد ہماری ملاقات علاقے کی ضلع کونسل کے وائس چیئرمین عطاء اللہ خاں صاحب سے ہوئی جنہیں علاقے والوں نے ووٹ دیئے اور وہ بھی کسی پیر فقیر کے حکم کے بغیر۔ عطاء اللہ خاں صاحب ضلع کونسل کے اعلیٰ عہدیدار تھے چنانچہ میں نے اُنکے

سامنے دفترِ شکایات کھول دیا۔ کیسے نمائندے ہیں آپ اس علاقے کے، دریا پر پُل ادھورا پڑا ہے۔ کرمشانی کی سڑکیں تاریکی میں ڈوبی ہوئی ہیں، یہ کیوں ہے آخر؟

انہوں نے دھیرے دھیرے ساری بات سمجھا دی۔ اس بات کی تہ میں بھی وہی جہالت تھی۔ لوگ دھڑے بندیوں کا شکار ہیں۔ ایک کوئی اچھا کام کرنا چاہتا ہے، دوسرا جا کر سارا کام بگاڑ دیتا ہے۔ میں نے عطاء اللہ خاں صاحب سے پوچھا کہ راستے کا پُل مکمل کیوں نہیں ہوتا؟

کہنے لگے ــــ "پھر وہی سیاست کی مصیبت ہے۔ یہ پل بھی اسی سیاست کا شکار ہے۔ اس کے ٹھیکے دار نے اس پُل پر کام کیا مگر کام بڑا تھا اور اس کمپنی سے نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ نیچے پتھر ہیں بڑے بڑے اور وہ کمپنی اتنی بڑی نہیں ہے کہ وہ ان کو توڑ سکے اور پُل کے ستون نیچے اتار سکے۔ تو انہوں نے یہ کیا کہ ستون گاڑنے کی بجائے اوپر کے شہتیر بنوانے شروع کر دیئے اور بل وغیرہ منظور کرا کے وصول کر لیا۔ باقی جب محکمہ ہائی وے نے ان کا ٹھیکہ منسوخ کیا تو انہوں نے پہلے ہائی کورٹ میں رِٹ کرائی، اس کے بعد وہ معاملہ سپریم کورٹ کے سامنے گیا۔ اب دیکھنا ہے یہ مقدمہ آٹھ سال چلتا ہے یا دس سال چلتا ہے۔ جب کبھی عدالت فیصلہ دے گی اس کے بعد یہ پُل بنے گا۔"

عطاء اللہ خاں صاحب سے میری دوسری شکایت بہت سخت تھی۔ سڑکوں پر شدید اندھیرے کی شکایت۔ میں نے گزشتہ رات کی ساری داستان سُنائی اور کہا کہ حیرت ہے کہ ترقی کے اس دور میں آپ کے اس شہر پر بلا کی تاریکی چھائی ہوئی ہے، آپ سڑکوں پر روشنیاں کیوں نہیں لگواتے؟

جواب ملا ــــ "میں نے پچھلے دنوں اسی تانی خیل کے لیے بجلی منظور کرائی تھی۔ چیف انجینئر جو فیصل آباد میں بیٹھتا ہے، ایریا الیکٹرسٹی بورڈ کا چیئرمین ہوتا ہے۔ تو جب میری درخواست منظور ہو گئی ہمارے بعض سیاست دانوں نے خوش ہونے کی بجائے کوشش شروع کر دی کہ یہ کام نہ ہونے پائے۔ وہ درخواست ۸۵ء میں منظور ہوئی تھی اور یہ ۸۸ء ہے اور آپ نے خود دیکھ لیا کہ کرمشانی اندر اندھیرے میں ڈوبا ہوا ہے۔ بجلی کے کھمبے آئے پڑے ہیں۔ جب انہیں لگانے کا وقت آتا ہے تو بعض لوگ دوڑ دھوپ کر کے اس میں تاخیر کراتے ہیں۔

یہاں تک کہ ٹھیکیدار کام چھوڑ کر چلا جاتا ہے۔ گروہ بندیاں ہو گئی ہیں۔ کوئی گروہ نہیں چاہتا کہ دوسرے کو کامیابی ہو اور اُس کا نام اونچا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا ہے کہ تاریکی ـــــ ہر طرح کی تاریکی اس علاقے کا مقدر بن گئی ہے۔ لوہے کے کھمبے پڑے زنگ کھا رہے ہیں اور انسان اندھیرے میں ٹھوکریں کھا رہے ہیں۔ یہ ہے ہمارے ذہنوں کی حالت ـــــ یہ

عبدالعزیز کی ہنسی

یہ بیسویں صدی کا ایک شہر ہے جو اکیسویں صدی میں داخل ہو رہا ہے۔ یہاں لوگ اپنے گھروں میں بجلی نہیں لگواتے کہ کہیں مر نہ جائیں، ٹیلی ویژن کی اسکرین پر کوئی مرد آجائے تو یہاں کی عورتیں پردہ کرتی ہیں، یہاں ٹیلی فون لگے ہیں مگر دس سال سے لاہور کی لائین نہیں مل رہی ہے۔ یہاں چھوٹے موٹے جرم بند ہو گئے ہیں کیونکہ جرائم پیشہ لوگوں نے ہیروئن، چرس اور افیون کا کاروبار شروع کر دیا ہے۔ صوبہ سرحد والے اسے سرحد میں نہیں مانتے، پنجاب والے اسے پنجاب میں نہیں مانتے۔ دنیا کی نگاہوں سے گرا ہوا، یہ ہے تحصیل عیسیٰ خیل کا شہر کمر مشانی!

میں پہنچا تو سادات کے گھرانے میں رہنے کا شرف ملا۔ ان کا نام گلزار علی شاہ ہے۔ شہر میں ان کا پرانا گھرانا ہے، خود گرد آور تھے۔ اب ریٹائر ہو گئے ہیں۔ میں اُن کے ہاں پہنچا تو رات ہو چکی تھی اور ان لوگوں کو میرے آنے کی پہلے سے خبر نہیں تھی۔

میں پہنچا — تعارف ہوا اور گھر کے دروازے میرے لیے کھول دیئے گئے۔ نومبر کا مہینہ تھا۔ سخت سردی تھی۔ جلدی جلدی جھاڑیوں کی ٹہنیاں جلا کر میرے لیے پانی گرم کیا گیا اور جب تک میں منہ ہاتھ دھو کر فارغ ہوا، روٹیاں ڈال دی گئیں اور کھانا پکا دیا گیا۔

دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ گھر کی لڑکیاں اور لڑکے سب تعلیم پا گئے تھے مگر یہ عمل یہیں ختم نہیں ہوا تھا۔ اس گھرانے میں آنے والا علم اور ہنر اب روشنی بن کر باہر کے اندھیروں میں پھیل رہے تھے۔

اس گھر کا نقشہ پنجاب کے اکثر ساٹھ ستر سال پرانے گھروں جیسا تھا: بیچ میں بہت بڑا دالان، سامنے بڑے بڑے برآمدے، ان کے اندر خوب اونچی اونچی چھتوں والے کمرے، اینٹوں کے فرش،

چوبی کھڑکیاں اور دروازے جن میں رنگین شیشے لگے ہوئے۔ بعد میں ضرورتیں بڑھیں تو گھر بھی بڑھا اور دالان کی دوسری جانب نئے کمرے بنا لیے گئے۔ پھر نئی طرز کا غسل خانہ تعمیر کر لیا گیا۔ پانی کی ٹونٹیاں لگ گئیں اور چھت پر ٹیلی ویژن کا انٹینا نمودار ہو گیا۔ اور آخر آنگن میں بڑے بیٹے کا اسکوٹر بھی آ کر کھڑا ہو گیا۔

ہاں تو رات کافی ہو گئی تھی۔ میرے سلانے کا بندوبست شروع ہوا۔ گلزار علی شاہ صاحب نے بچوں کو ہدایت کی کہ ایک نئے کمرے کو خالی کر کے مجھے وہاں سلا دیا جائے۔ میں لاکھ کہتا رہا کہ کمرہ خالی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ مگر کسی نے میری ایک نہ سُنی۔ جا کر دیکھا کہ سب بھائی بہن مل کر کپڑے سینے اور سوئٹر بُننے کی مشینیں، اور کشیدہ کاری کا سامان ہٹا کر میرے بستر کے لیے جگہ بنا رہے ہیں۔ یہ کمرہ ان مشینوں سے کیوں بھرا ہوا تھا، اس کا ذکر ذرا دیر بعد۔

ہاں تو مجھے وہیں سلا دیا گیا۔ زندگی میں پہلی بار سلائی، کڑھائی اور بُنائی کی مشینوں کے ہجوم کے درمیان سویا اور اگر وہ رات بھر باہر سڑک پر کتے نہ بھونکتے تو بے حد غافل سوتا۔

صبح ہوئی تو میں نے اصرار کیا کہ باہر چل کر شہر کرمشانی کی سیر کی جائے۔ لڑکے مجھے لے جانے کے لیے جھٹ تیار ہو گئے۔ مگر میں پتلون قمیض پہننے لگا تو عجب بات سنی۔ کسی نے کہا کہ سر باہر نکلنے کے لیے یہ لباس مناسب نہیں رہے گا۔ لوگ انگریزی لباس پر اعتراض کریں گے۔

تو اب سوال یہ تھا کہ پھر کیا پہنوں۔ پتلون قمیض کے علاوہ میرے پاس سفید ململ کا کُرتا اور سفید لٹھے کا پاجامہ تھا۔

"یہ پہن لوں؟ —" میں نے پوچھا۔

"یہ تو اور مشکل میں ڈال دے گا، سر! —" جواب ملا۔

مسئلہ شاید یہ تھا کہ جیسا سب کا لباس ہے ویسا ہی میرا لباس ہونا چاہیے۔ میں اگر اجنبی نظر آیا تو کہیں لوگ انگلیاں نہ اٹھائیں، سوال نہ پوچھیں، پریشان نہ کریں۔ مجھے بتایا گیا کہ ابھی تک یہ لوگ اجنبیوں کو ستاتے ہیں۔

اس کے بعد یہ ہوا کہ بہت سے لوگ مجھ سے ملنے آ گئے۔ میں اپنی لندن کی قمیض اور ڈھیلا ڈھالا خاکی پتلون پہنے ہوئے تھا۔ باتیں کرتے کرتے ہم سب باہر نکل گئے۔ اور شہر کی سڑکوں پر گھومنے لگے۔ کسی

نے میری طرف انگلی تو کیا، آنکھ بھی نہیں اٹھائی۔ نہ کسی نے اعتراض کیا نہ شکایت۔ البتہ میں نے ایک فرمائش کی جسے سُن کر سب کے سب ٹھٹھک کر رہ گئے۔

میں نے کہا کہ کمرشانی کی بہت سی طالبات بی بی سی کو خط لکھتی رہتی ہیں۔ میں لڑکیوں کے اسکول جانا چاہتا ہوں ورنہ وہ شکایت کریں گی کہ میں آیا اور مل کے بھی نہیں گیا۔

سارے مجمع نے نفی میں گردنیں ہلا دیں: "نہیں سر۔ لڑکیوں کے اسکول میں کسی غیر مرد کا جانا مشکل ہے۔ ناممکن ہے۔ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وغیرہ وغیرہ ——"

یہی بحث کرتے کرتے ہم لوگ لڑکیوں کے اسکول پر پہنچ گئے۔ سارا اسکول اونچی فصیل کے اندر چھپا ہوا تھا۔ باہر صرف اس کا دفتر تھا جس میں ایک منشی نما بزرگ تشریف فرما تھے۔ پتلون قمیص میں ملبوس ایک اجنبی کو دیکھ کر وہ چونکے۔

میں نے کہا کہ اندر جا کر خبر کر دیجیے کہ بی بی سی لندن سے فلاں صاحب آئے ہیں۔ وہ خاموشی سے اندر چلے گئے۔ میرے ساتھ کا سارا مجمع دم سادھ کر کھڑا ہو گیا کہ دیکھیں اندر سے کیا جواب آتا ہے —— اور اندر سے جواب نہیں آیا، خود استانیاں اور طالبات آگئیں اور مجھے اندر لے گئیں۔

جب تک میں چائے پیتا رہا۔ آٹوگراف دیتا رہا، باہر میرے میزبانوں کا مجمع چپ کھڑا رہا۔ اسی دوران استانیوں نے کسی کو دوڑا کر میرے لیے بازار سے سوغات منگائی۔ نہایت عمدہ اور بیش قیمت آفٹر شیو لوشن جو لندن، نیویارک اور پیرس کے بازاروں میں ملا کرتا ہے۔

میں نے حیران کر پوچھا: "صدیوں پیچھے رہ جانے والے شہر کمرشانی میں یہ کہاں سے آگیا؟" پتہ چلا کہ اسمگلروں کے قافلے ادھر ہی سے گزرا کرتے ہیں۔ شام کو کہلوا دیا جائے تو صبح تک ریفریجریٹر، اور ائر کنڈیشنر سے لے کر بجلی کی کیتلی اور استری تک سب کچھ گھر بیٹھے مل جاتا ہے اور وہ بھی سستے داموں۔

میں لڑکیوں کے اسکول سے باہر آیا تو میزبانوں کا بس نہیں چل رہا تھا کہ مجھے کندھوں پر اُٹھا لیں اور گلے میں ہار ڈالیں۔ کمرشانی کی سخت روایات کو انہوں نے یوں ٹوٹتے دیکھا تو انہیں اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا۔ بات صرف اتنی سی تھی کہ وقت کے ساتھ دنیا کے سارے شہروں اور ساری بستیوں کی طرح کمرشانی بھی آگے نکل چکا تھا مگر خود شہر والے، خود بستی والے یہ بات ماننے

کے لیے تیار نہیں تھے اور طے کیے بیٹھے تھے کہ ان کا شہر اب بھی پسماندہ اور ان کی بستی ابھی تک تاریکی میں ہے۔

اچھا تو آیئے اب آپ کو کرمشانی میں اپنے میزبان گلزار علی شاہ صاحب سے ملواؤں —— یہ وہ لوگ ہیں، وہ تھوڑے گنے چنے لوگ جن کے دلوں میں علم کی شمع روشن ہوئی ہے اور اِس سے یہ غریب لوگ، یہ کم وسیلہ لوگ چاہتے ہیں کہ ساری زمینیں جگمگا اٹھیں۔ انہیں اختیار نہیں ملتا، ان کا بس نہیں چلتا لیکن اگر چلے تو بھی وہ لوگ ہیں جو خلقِ خدا کے دل و دماغ میں علم کا نور بھر دیں۔

میں نے گلزار علی شاہ صاحب سے پوچھا کہ بتائیے آپ کے علاقے میں تبدیلیاں آ رہی ہیں یا نہیں، اور بتائیے کہ غریبوں کے لیے، محرومی کے ستائے ہوئے لوگوں کے لیے، ناداروں کے لیے آپ نے کیا کیا ہے؟

اُن کا جواب سنیے —— "سب سے پہلے میں نے اپنے گھر میں یہ جگہ بغیر کسی معاوضے اور بغیر کسی اُجرت کے دے دی اور اپنی بچیوں کو تربیت دلا کر یہاں دستکاری اسکول کھولا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آس پاس غریب لوگ آباد ہیں، یہ کاشتکاروں کی بچیاں ہیں، یہ بچارے علم کی اہمیت نہیں سمجھتے۔ اب ہم ان کے لیے کم سے کم یہ تو کر سکتے ہیں کہ انہیں ہُنر دے دیں۔ اسی لیے میں نے اپنے گھر میں یہ اسکول کھولا ہے۔ ہم ان سے کوئی فیس کوئی چیز نہیں لیتے اور بچیوں کو یہ ساری تربیت بالکل مفت دیتے ہیں۔ کڑھائی سلائی، سوئی کا کام تمام کام ہم ان کو سکھاتے ہیں۔"

گلزار علی شاہ صاحب کہے جا رہے تھے —— "اس کے علاوہ میں نے اپنے اسی گھر میں بغیر کسی معاوضے اور کرائے کے پرائمری گرلز اسکول کھول دیا ہے۔ لڑکیوں کے لیے یہ اسکول پانچویں جماعت تک ہے۔ ان کے لیے ہر طرح کی استانیاں حکومت سے منظور کرا کے فراہم کی ہیں۔ میری خواہش ہے کہ میرے محلے کے کمسن بچے تعلیم پا جائیں۔ شہر کا پرائمری اسکول بہت دور ہے، یہ بچے وہاں تک نہیں جا سکتے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ کم سے کم پانچ جماعتیں پڑھ جائیں ——"

میں نے شاہ صاحب سے کہا —— "علاقے میں علم کی کمی کا احساس آپ کو یوں بھی ستاتا ہوگا۔ سنا ہے کہ جب اس علاقے میں بجلی آئی تو لوگوں نے اپنے گھروں میں بجلی لگوانے سے انکار

کیا۔ یہ صحیح ہے کیا؟ —"

وہ بولے —" بالکل صحیح ہے۔ یہاں تک کہ میں نے لوگوں سے کہا کہ باقی شہر میں بجلی ہے اس محلے میں نہیں ہے، ادھر بجلی کے کھمبے ہونے چاہئیں۔ تار ڈالنے چاہئیں۔ لوگ کہنے لگے کہ ہر گز نہیں۔ ہم یہ بجلی وجلی نہیں لگوائیں گے۔ ہمارے بزرگوں نے کبھی بجلی نہیں لگوائی تو ہم کیسے لگوا لیں۔ ہم جان دے دیں گے لیکن یہ بلا یہاں نہیں آنے دیں گے — تو جناب، سب سے پہلے میں نے یہاں بجلی لگوائی اور مجھے دیکھ کر میرے پڑوسیوں نے بجلی کے کنکشن لیے۔ باقی کسی کے گھر میں نہ بجلی ہے نہ پانی ہے نہ پانی کی ٹونٹی ہے —"

میں نے پوچھا —" کیا لوگ پانی کی ٹونٹی لگوانے سے بھی انکار کرتے تھے؟ —"

کہنے لگے —" بالکل، پانی کے کنکشن لینے سے انکار کیا اور کہا کہ ہمارے بزرگ بھی ان ٹونٹیوں کا پانی نہیں پیتے تھے، نہ ہم پئیں گے، نہ ہم یہ چار روپے ماہانہ دینے کے لیے تیار ہیں۔ تو جناب، میں نے اپنے گھر میں نلکا لگوایا۔ ٹونٹی میں پانی افراط سے آنے لگا۔ اب یہ لوگ میرے گھر آتے ہیں۔ یہاں سے پانی لے جاتے ہیں، بلکہ گرمیوں میں تو یہاں تک ہوتا ہے کہ غسل بھی یہیں کرتے ہیں اور صابن بھی ہم سے لیتے ہیں۔ کپڑے بھی یہاں دھوتے ہیں۔ ایک سید ہونے کے باعث میں نے ان لوگوں کو ساری سہولتیں دے رکھی ہیں۔"

میں نے کہا —" آپ کے گھر میں ماشاءاللہ بہت اچھا غسل خانہ ہے، اس میں فلش سسٹم بھی لگا ہوا ہے۔ یہاں اور گھروں میں بھی فلش ہے؟"

وہ بولے —" نہیں یہ صرف میرے گھر میں ہے اور سارے محلے میں کسی جگہ بھی نہیں ہے۔"

میں نے کہا —" ہم نے یہ بھی سنا ہے کہ جب ٹیلی ویژن اس علاقے میں آیا تو لوگوں نے اپنے گھروں میں ٹیلیویژن رکھنے سے بھی انکار کیا؟"

کہنے لگے —" ہاں جناب۔ میں نے ٹیلی ویژن لیا۔ میرے سارے بچے تعلیم یافتہ ہیں اس لیے میں نے ٹیلی ویژن لگوایا۔ تو یہ لوگ میرے محلے والے حیران ہو گئے کہ یہ کیا چیز ہے۔ چونکہ ان لوگوں کے گھروں میں لیٹرین کا بندوبست نہیں ہے تو شام کو پردے دار عورتیں، جو کہیں باہر جاتی تھیں، وہ آنکھ بچا کر ادھر آجاتی تھیں اور دیکھنا چاہتی تھیں کہ شاہ صاحب کے گھر میں یہ کیا چیز آئی ہے۔

تو جُوں ہی کوئی مرد ٹی وی پر آتا تو یہ عورتیں فوراً پردہ کر لیتیں کہ یہ غیر مرد ہمیں دیکھ نہ لے۔"

گلزار علی شاہ صاحب تو خیر کرمشانی کے ایک محلّے کا ذکر کر رہے تھے لیکن ضلع کونسل کے وائس چیئرمین عطاء اللہ خان نے دور دور کے علاقوں کی بات کہہ سنائی، جو کچھ روز پہلے ہی کرمشانی اور عیسیٰ خیل کے پسماندہ علاقے کا دورہ کر کے لوٹے تھے۔ میں ان سے پوچھ رہا تھا کہ غریبوں کا کیا حال ہے؟ کیسے جیتے ہیں، کیسے مرتے ہیں اور زندگی کتنی مشکل ہے؟

عطاء اللہ خاں کہنے لگے، کانوں سنی نہیں، آنکھوں دیکھی۔" ہم ایک جگہ گئے۔ ٹبی خیل کی طرف اس مقام کا نام ہے تخت اچھوڑا۔ وہاں چار گھنٹے کا راستہ ہے، پہاڑوں پر جانا پڑتا ہے، وہ بھی پیدل۔ ان لوگوں کے حالاتِ زندگی ہم نے دیکھے ہیں۔ وہ جس طرح زندگی بسر کر رہے ہیں ہمارے جانور بھی اس طرح نہیں رہتے۔ اس کے علاوہ ہمارے اپنے پہاڑی علاقے ہیں مثلاً چاتری چشمہ، ٹولہ منگلی، سلطان خیل، غرض یہ کہ یہ بڑا علاقہ ہے، وہاں لوگ پینے کے لیے بارش کا پانی اکٹھا کرتے ہیں۔ اس کے لیے جوہڑ بناتے ہیں۔ جہاں سے گدھوں پر لاد کر پانی لاتے ہیں، گدھے وہیں غلاظت پھیلاتے ہیں، یہ لوگ خود دیکھ رہے ہیں پھر بھی وہی پانی پیتے ہیں، یہ ان کی مجبوری ہے۔ انہیں کہیں بھی صاف پانی نہیں ملتا، چنانچہ وہ ایسا پانی پیتے ہیں جس سے ہم ہاتھ دھونا بھی پسند نہ کریں۔"

میں نے عطاء اللہ خاں سے پوچھا کہ یہاں کرمشانی میں مار پیٹ، چوری چکاری اور لوٹ مار جیسے جرائم کا کیا حال ہے؟

کہنے لگے ــــ "جرائم بہت زیادہ تھے مگر میں تو کہوں گا کہ جب سے ہیروئین بکنی شروع ہوئی ہے تو جرائم کچھ کم ہو گئے ہیں کیونکہ یہ جرائم پیشہ لوگ اب منشیات کی طرف لگ گئے ہیں اور اسی دوڑ میں مصروف ہیں کیونکہ ان میں سے ہر آدمی اب یہ سوچتا ہے کہ کسی طرح ایک کیلو کی بجائے پانچ کیلو بیچ لوں پھر وہ سوچتا ہے کہ اگر اس کاروبار میں کسی سے لڑ پڑا یا مار پیٹ شروع کر دی تو پھر باقی ہیروئین نہیں بیچ سکوں گا۔ لہٰذا یہ لوگ اب اسی طرف متوجہ ہیں۔ میں آپ کو بتاؤں کہ ہمارے شہر کرمشانی میں اب تو ہیروئین، چرس اور افیون بالکل اس طرح بکتے ہیں جیسے لاہور کی دکانوں پر سودا سلف فروخت ہوتا ہے۔ یہاں پر کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔ البتہ اگر کوئی رکاوٹ

ہے تو صرف اخلاقی رکاوٹ ہے۔ اگر مجھے اس کاروبار سے نفرت ہے تو میں اس سے دور رہوں گا۔ اگر نفرت نہیں ہے تو مجھے کوئی روک نہیں سکتا۔ یہ پوزیشن ہے یہاں پر۔"

میں نے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ یہ پسماندگی خود لوگوں نے اپنے ہاتھوں پیدا کی ہے یا جو کچھ بھی ہے آپ کو ماضی سے ورثے میں ملا ہے؟

کہنے لگے — "یہ ہمیں اپنے ماضی سے ملا ہے۔ نواب صاحب کالا باغ جب گورنر تھے، اس وقت کی ان کی ایک بات مجھے یاد آرہی ہے۔ ان کا ایک ملازم تھا، وہ حقّہ بھر رہا تھا اور اس نے نواب صاحب سے کہا کہ نواب صاحب ادھر اسٹیل مل لگ رہی ہے؟۔ تو نواب صاحب نے کہا کہ تو بیوقوف ہے، ادھر اسٹیل مل لگوا کر لوگوں کو سیانا بنا دوں؟۔ سیانے ہو جائیں گے تو میرا حقّہ کون بھرے گا؟"۔

عطاء اللہ خاں کی یہ بات مصدقہ ہو یا نہ ہو، غور طلب بات یہ ہے کہ لوگوں میں ایسی روایات چلی آرہی ہیں۔

ان کے بعد میری ملاقات کمر مشانی کے ایک اخباری نامہ نگار غلام قاسم خاں سے ہوئی۔ بڑے سے بازار کے قریب اپنا چھوٹا سا دفتر کھولے بیٹھے تھے۔ کچھ کرسیاں، ایک میز اور اس پر رکھا ہوا ایک ٹیلی فون۔ میں نے غلام قاسم خان سے پوچھا کہ آپ لاہور میں اپنے اخبار کو اپنی ساری خبریں کیا اسی ٹیلی فون کے ذریعے بھیجتے ہیں؟۔ کہنے لگے کہ یہ ٹیلی فون دس سال سے لگا ہوا ہے اور دس سال سے لاہور کا نمبر ایک بار بھی نہیں ملا۔ یہ علاقہ ساری دنیا سے کٹا پڑا ہے اور کوئی دھیان نہیں دیتا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کوئی دھیان کیوں نہیں دیتا، اور کمر مشانی میں یہ میرا آخری سوال تھا اور میرے دل و دماغ پر یہ پہلی ضرب تھی۔

میں نے پوچھا — "آپ کا یہ علاقہ بے توجہی کا شکار کیوں ہے؟—"

جواب ملا — "مسئلہ یہ ہے کہ پنجاب والے ہمیں پنجاب میں نہیں سمجھتے اور سرحد والے سرحد میں نہیں سمجھتے۔ ہمارا یہ ایسا علاقہ ہے۔"

میں نے پوچھا — "کیا آپ دونوں صوبوں کی سرحد پر آباد ہیں؟"

بولے — "جی ہاں ہم تحصیل عیسیٰ خیل اور تحصیل لکی کی سرحد پر آباد ہیں، اسی لیے ہماری

کوئی ترقی بھی نہیں ہوئی۔"

میں نے کہا۔"آپ کا کیا خیال ہے کہ پنجاب میں کرمشانی کتنا پسماندہ ہے؟"

کہنے لگے۔"میرے خیال میں اس سے زیادہ پسماندہ جگہ نہیں ملے گی آپ کو۔"

پھر دوبارہ بولے۔"کرمشانی سے زیادہ پسماندہ کوئی اور جگہ نہیں ہے۔"

میں آگے چلا تو میرے سامنے کالا باغ کا علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ وہ جو پتھروں کا رنگ ہوتا ہے وہی اس کا رنگ تھا۔ بس اس پتھریلی اوڑھنی پر کہیں کہیں قدرت کے ٹھپے سے ہرے بوٹے چھاپے گئے تھے ورنہ وہی چٹیل میدان جو دور جا کر آسمان کی طرف اٹھنے لگتے تھے اور اٹھتے اٹھتے پہاڑ بن جاتے تھے۔

ہماری کار چھوٹی چھوٹی سڑکوں پر دوڑ رہی تھی۔ کسی نے کہا کہ یہ سامنے جو میدان اور پہاڑ ہیں، آپ کو پتہ ہے ان کے سینے میں کیا ہے؟

میں نے پوچھا۔"کیا؟ دھڑکتا ہوا دل؟"

اس نے کہا۔"جی نہیں۔ پگھلتا ہوا لوہا۔ اس زمین کے اندر معدنیات کے ذخیرے دبے ہوئے ہیں اور یہ کوئی آج کی بات نہیں۔ ایک دنیا جانتی ہے کہ کالا باغ کے ان پہاڑوں میں سو طرح کی دھاتیں اور نمک بھرے پڑے ہیں۔"

"پھر لوگ انہیں نکالتے کیوں نہیں؟" میں نے پوچھا۔

"وہ نہیں چاہتے کہ لوگ سیانے ہو جائیں۔"

ہماری کار چلی جا رہی تھی۔ سڑک کی دونوں طرف درخت لگے تھے۔ نشیب میں کھیت تھے، کنوئیں تھے۔ رہٹ اور ٹیوب ویل چل رہے تھے اور قریب ہی بہنے والے دریائے سندھ کا پانی ان کنوؤں کے راستے پھوٹ کر زمین کے فولادی سینے پر نئی فصل کی نازک کونپلیں اگا رہا تھا۔

ہم کالا باغ کے راستے میں افغان پناہ گزینوں کی ایک بہت بڑی آبادی کی طرف بڑھ رہے تھے۔ کرمشانی پیچھے رہا جا رہا تھا، میرے سفر میں بھی اور وقت کی دوڑ میں بھی۔ لوگ بتا رہے تھے کہ اس پہاڑ کی چٹانوں میں گندھک کے ذخیرے ہیں۔ اس جانب نمک کے پہاڑ ہیں۔ اُس طرف

سیمنٹ بنانے کا پتھر ہے۔ اس جانب خام لوہے کے خزانے دفن ہیں۔ حکومت چاہے تو سامنے کے سارے ویران اور چٹیل میدانوں کو کارخانوں سے بھر سکتی ہے۔

اس بات پر مجھے اس علاقے کا کارخانہ یاد آگیا جو میں نے ذرا دیر پہلے دیکھا تھا اور جو شاید کرشانی کے علاقے میں واحد کارخانہ تھا۔ نسوار کا کارخانہ!

جو پڑھنے والے نہیں جانتے انہیں بتاتا چلوں کہ نسوار کا تعلق اس سرزمین کے سینے میں مدفون معدنیات سے نہیں۔ نسوار تمباکو سے بنائی جاتی ہے اور اس علاقے کے لوگ اسے منہ میں نچلے ہونٹ کے پیچھے دبائے رکھتے ہیں اور اس طرح لعاب دہن کے ساتھ ساتھ یہ تمباکو ہر وقت جزو بدن بنتا رہتا ہے۔ اس میں نشہ ہوتا ہے یا سرور، مجھے تو پتہ نہیں مگر یہ بات جاننے کے لیے میں نسوار کے کارخانے میں پہنچا اور پہلے کارخانے کے مالک اور پھر ان کے کمسن بیٹے سے باتیں کیں۔

میں نے کارخانے کے مالک سے پوچھا کہ نسوار میں کون کون سی چیزیں شامل ہوتی ہیں۔ انہوں نے پورا نسخہ سنا دیا ــــ "نمبر ایک تمباکو ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ الائچی پڑتی ہے۔ راکھ ہوتی ہے اور اس کے بعد جناب، رنگ ہوتا ہے اور نمک۔ یہ سب چیزیں ملا کر ہم نسوار بناتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ بڑی پرانی چیز آپ بجلی کی مشین سے بنا رہے ہیں، یہ مشین کیسے کام کرتی ہے۔ جواب ملا ــــ "ایک موٹر چلتا ہے اور یہاں زمین میں گڑے ہوئے یہ چھ کڑھاؤ ہیں۔ ہر کڑھاؤ میں یہ دستے چل رہے ہیں جو نسوار کو کوٹتے ہیں اور سب چیزوں کو ملاتے ہیں۔ اس کے بعد انہیں ڈبوں میں پیک کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ دن بھر میں آپ کتنی نسوار بنا لیتے ہیں؟ انہوں نے وضاحت سے سمجھا دیا ــــ "تین شفٹیں چلتی ہیں یہاں پر۔ اور ہر شفٹ میں تقریباً تین من نسوار بنتی ہے۔ دن بھر میں نو من۔"

میں نے پوچھا کہ یہ نسوار کیا اسی علاقے میں فروخت ہوتی ہے؟ انہوں نے کہا۔ "نئیں جی۔ تقریباً پورے پنجاب میں بکتی ہے۔"

میں نے کہا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ جسے نسوار کی عادت ہو جائے وہ پھر اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔

جھٹ جواب ملا — "بالکل صحیح بات ہے جناب"۔

میں نے پوچھا کہ اس میں نشہ ہوتا ہے یا صرف سرور ہوتا ہے؟۔ کہنے لگے — "آپ جو بھی کہیں لیکن میرا خیال ہے کہ سرور زیادہ ہوتا ہے"۔

میں نے کہا کہ آپ کا کیا خیال ہے، آج کے نوجوان بھی نسوار کھا رہے ہیں یا زیادہ تر پرانے لوگ کھاتے ہیں؟ — وہ بولے — "ہمارے علاقے میں تو نئی نسل بھی زیادہ کھا رہی ہے"۔

میرا اگلا سوال براہ راست تھا — "آپ خود کھاتے ہیں؟"

جواب صاف تھا — "نہیں میں تو نہیں کھاتا"۔

"کیوں؟ —"

"بس شروع سے عادت ہی نہیں ہے —"

نئی نسل کی گواہی لینے کے لیے مجھے دور جانا نہیں پڑا۔ کارخانے کے مالک کا بیٹا قریب کھڑا تھا، گیارہ بارہ برس کی عمر تھی اس کی۔ میں نے پوچھا — "تم نسوار کھاتے ہو؟"

"نہیں —"

"کیوں؟"

"ابھی پڑھتا ہوں"۔

"جب پڑھائی پوری کر لوگے تو اس کے بعد کھاؤ گے؟ —"

"ہاں —"

بیٹے کا جواب سن کر باپ تالی بجا کر اور سر پیچھے پھینک کر ہنسے۔ میں سوچنے لگا کہ اتنے چھوٹے سے شہر کے اکلوتے کارخانے میں روزانہ نو من نسوار بنتی ہے۔ کاش کچھ ہو جائے کہ یہ عادتیں اب ختم ہوں۔ نہ نو من نسوار ہو، نہ سرور کی رادھا ناچے۔

ہماری کار ذرا بلندی پر چڑھی تو اچانک دوسری طرف کی وادی کھلی۔ پہاڑوں کے دامن میں پتھریلے نشیب و فراز میں ایک بہت بڑی آبادی نظر آئی۔ یہاں سے وہاں تک جھونپڑیاں ہی جھونپڑیاں، تلے اوپر کچے مکان۔ آگے پیچھے نیم پختہ دیواریں۔ اِدھر اُدھر دھرے چھپر۔ بے شمار

دریچے، روشن دان اور دُھوانزے۔

یہ افغان پناہ گزینوں کا کیمپ تھا، کیمپ نمبر چھ۔ کوٹ چاندنا والا۔ ذرا ہی دیر بعد ہم کیمپ میں داخل ہو گئے۔ سڑک کے راستے کیمپ میں پہنچے تو یوں لگا کہ خواب کے راستے افغانستان میں پہنچ گئے ہیں۔

ہر طرف وہی افغان صورتیں، افغان بولیاں، افغان رسم و رواج، افغان سلوک اور افغان طرزِ عمل۔

ہم بڑے بازار میں چلنے لگے۔ اتنا مجمع کہ کھوے سے کھوا چھلنے لگا۔ ہر طرف آسمان کے نیچے کھلی دکانوں میں گوشت فروخت ہو رہا تھا۔ مہنگی رانوں سے لے کر سستے سری پائے تک۔ لوگ پھل بیچ رہے تھے، ٹماٹر بیچ رہے تھے، چپلیں اور کوٹ بیچ رہے تھے اور جنرل ضیاالحق کی تصویریں بیچ رہے تھے جن پر لکھا تھا: غازی۔ مردِ مومن۔ فاتح افغانستان۔

تنگ بازار میں چلنا دوبھر تھا کیونکہ سودے والے دکانوں کے آگے دکانیں لگائے بیٹھے تھے اور فٹ پاتھ پر دانتوں کا منجن یا آنکھوں کا سُرمہ نہیں بلکہ جدید ولایتی دوائیں بک رہی تھیں۔ اسپرین سے لے کر اینٹی بایوٹک دواؤں تک ہر قسم کی ٹکیوں کے لمبے لمبے ہرے پیلے فیتے الگنی پر ٹنگے تھے اور راہ چلتے لوگ انہیں یوں خرید رہے تھے جیسے کوئی نوجوان پٹھان ذرا ٹھہر کر نسوار کی چمک دار ڈبیا خریدے اور اس ڈبیا کے اوپر لگے آئینے میں اپنی صورت دیکھے، اپنے سر کی ٹوپی کو ذرا سا اور ترچھا کرے اور بانک پن سے آگے بڑھ جائے۔

اس افغان بازار کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ جگہ جگہ بازار کے اوپر چٹائی کی چھتیں پڑی تھیں جو بازاروں، دکان داروں اور خریداروں کے اوپر سایہ کیے ہوئے تھیں۔ اور اس سائے میں کہیں کہیں چائے خانے تھے جن میں سامنے چولہوں پر چائے اور دودھ کی پتیلیاں چڑھی تھیں۔ نئے دَور کے افغانوں کے لیے باہر کی طرف میزیں کرسیاں اور بنچیں پڑی تھیں اور پرانی روایت کے ستائے ہوئے بڑے بوڑھوں کے لیے اندر بڑے بڑے کمرے بنے تھے جن میں دریاں اور قالین بچھے تھے، گاؤ تکیے رکھے تھے، دیواروں پر تصویریں سجی تھیں، غازی، مردِ مومن اور فاتح افغانستان کی تصویریں۔

ہم بھی ایک چائے خانے کے ویسے ہی اندرونی کمرے میں جا کر قالینوں پر دراز ہو گئے اور چائے کا آرڈر لینے والے بیرے سے پوچھا کہ یہاں کوئی ہے جو اُردو بول سکے۔

ہمارا یہ کہنا تھا کہ بیرے نے چائے بنانے والے سے، چائے بنانے والے نے چائے خانے کے مالک سے، مالک نے سامنے والے دکان دار سے اور دکان دار نے اندر کہیں بیٹھے ہوئے کسی شخص سے پشتو میں کہا کہ کوئی اردو بولنے والا ہے؛ سارے بازار میں بیک وقت کتنی ہی آوازیں بلند ہوئیں "کوئی اُردو بولنے والا ہے؟؟؟" — اور چند لمحے گزرے تھے کہ کہیں سے ایک اُردو بولنے والا برآمد کر لیا گیا۔ وہ تنومند جوان آیا اور مہمان نوازی کے سارے تقاضے پورے کرتے ہوئے پہلے ہر ایک کو سلام کیا۔ ہر ایک سے ہاتھ ملایا۔ ہر ایک سے مزاج پوچھا۔ ہر ایک کے لیے چائے کا از سر نو آرڈر دیا — اور پھر کہا:

"اب فرمایئے؟"

میں نے پوچھا— "آپ کا کیا نام ہے؟"

وہ بولا— "میرا نام صیب (صاحب) نوراللہ ہے۔ خروٹی قبیلے سے ہم تعلق رکھتا ہے، اور تقریباً ساڑھے تین چار سال سے ہم اس کیمپ میں مہاجر ہیں۔"

سوال و جواب کا سلسلہ چل نکلا — "کتنی آبادی ہے یہاں افغان مہاجرین کی؟"

جواب ملا— "یہ افغانوں کی آبادی ۴۴ ہزار کے لگ بھگ ہوگی۔ اس میں اٹھارہ کیمپ ہیں اور ہر کیمپ میں تقریباً ۲۴ سو ۲۵ سو پرچے، یعنی راشن پاس ہیں۔"

میں نے پوچھا— "یہ بتایئے کہ ان کیمپوں کی جو آبادی ہے وہ ان کیمپوں ہی میں رہتی ہے یا باہر دوسرے شہروں میں جا کر بھی لوگ کام کرتے ہیں؟"

جواب ملا— "ادھر ایسا ہے کہ جس کا راشن سے کام چلتا ہے وہ ادھر کیمپ میں رہتا ہے اور جس کا راشن سے کام نہیں چلتا تو دس روپے بیس روپے کی مزدوری کے لیے باہر چلا جاتا ہے۔"

"اس کی اجازت ہے آپ کو؟—"

"جی جی، اجازت ہے"

"یہ بتایئے کہ جو پاکستان کی حکومت اور دوسری حکومتیں آپ لوگوں کو امداد دے رہی ہیں وہ کافی

ہے یا یہاں لوگوں کو کچھ شکایتیں بھی ہیں ؟"

"شکایت یہ ہے کہ پہلے ہم لوگوں کو مکمل طور پر راشن مل جاتا تھا ہم لوگوں کو باہر مزدوری کرنے کی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ اور اب ہمیں بہت سی چیزوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ پہلے گھی بھی ملتا تھا تیل بھی ملتا تھا، دودھ بھی ملتا تھا اور گندم بھی ملتا تھا۔ اب ہر چیز میں کمی ہوگئی ہے اور صرف گندم رہ گیا ہے ہم لوگوں کو اب خالی گندم ملتا ہے۔"

"تو باقی چیزیں آپ کیسے حاصل کرتے ہیں ؟—"

"بس مزدوری کرکے کام چلاتے ہیں۔"

اب میں نے موضوع بدلا اور کہا "آپ تو ماشاءاللہ نوجوان ہیں اور جنگ کر سکتے ہیں، کیا آپ اور دوسرے نوجوان محاذ پر جاتے ہیں ؟—"

"جی جی، بالکل جاتے ہیں۔ ہر کوئی اپنے اپنے نمبر پر جاتا ہے، ہر چھ مہینے پر، ہر چار مہینے پر جاتے ہیں۔ ادھر ہمیں صرف تین مہینے جانے کی اجازت ملتی ہے۔"

"تو آپ کیا زیادہ عرصے کے لیے جانا چاہتے ہیں ؟"

"جی جی، ہم چاہتے ہیں کہ ہم صرف محاذ پر رہیں اور ادھر ہمارے گھر والوں کو راشن ملتا رہے۔"

میں نے پوچھا "تو یہ تین مہینے بعد آپ کو محاذ سے کیوں بلاتے ہیں ؟—"

وہ بولا— "بس یہ ان کی مرضی کی بات ہے— ہم لوگوں کی کوئی زبردستی نہیں ہے۔ ہم لوگ مہمان آیا ہوا ہے ادھر، ہمیں ادھر کوئی سیاست نہیں کرنا ہے۔"

اب میں نے پوچھا "اچھا یہ بتایئے کہ یہاں جو آبادی ہے افغان مہاجرین کی، جو نو دس برسوں سے وطن سے دور ہے، کیا یہیں رہنا پسند کرتی ہے یا ان لوگوں کا واپس جانے کو جی چاہتا ہے ؟"

جواب ملا— "بالکل، جی چاہتا ہے لیکن صرف اس طور پر کہ ہمارے ملک میں ایک آزاد، خودمختار صحیح اسلامی نظام ہو۔ لیکن اگر افغانستان میں اَور کوئی نظام ہوگا، جیسا کہ ابھی چل رہا ہے، تو ہم لوگ کسی بھی صورت میں جانے کے لیے تیار نہیں۔ جب تک ہمارے ایک چھوٹے بچے میں بھی دم رہے گا ہم لوگ لڑے گا۔ ہر محاذ پر ہر جگہ پر لڑے گا، مقابلہ کرے گا۔ اگر شہید ہوجائے گا تو ہم لوگوں کو قبول ہے، اگر غازی ہوجائے گا تو ہم لوگوں کو قبول ہے۔ لیکن موجودہ طریقے سے ہم افغانستان

جانا نہیں چاہتا —"

گفتگو ختم ہوئی۔ دوبارہ مصافحہ ہوئے۔ دوبارہ گلے ملے گئے بار بار خدا حافظ کہا گیا اور اتنے پیار سے رخصت کیا گیا کہ ایک بار تو نہ جانے کو جی چاہا۔

ہماری کار ذرا آگے چلی اور دریا کے نیلے پانی کے ساتھ ساتھ دوڑنے لگی۔ راہ میں شاندار سجی دھجی، درختوں میں گھری عمارتیں ملیں۔ نواب صاحب کی عمارتیں!

اس کے بعد خستہ حال، بوسیدہ اور کھنڈر جیسی عمارتیں ملیں، عام لوگوں کی عمارتیں۔ یہ شہر کالا باغ تھا اور کالا باغ میں داخل ہوتے ہی جو پہلی چیز نظر آئی وہ سائیکل رکشہ تھی۔ وہی رکشہ جسے کھینچتے کھینچتے یہ دُبلے پتلے، لاغر اور کمزور لوگ پسینہ پسینہ ہوئے جاتے ہیں۔

میں نے کالا باغ کے ایک رکشہ والے کا حال جاننا چاہا۔ وہ اپنے رکشہ کی بائیسکل کی گدی پر بیٹھا تھا۔ کالا باغ کے عام باشندوں کو بس اسی قسم کی گدیاں نصیب ہیں۔ وہ اپنی گود میں اپنے دونوں ہاتھ دھرے دیر سے کسی گاہک کا انتظار کر رہا تھا۔

میں اس کے قریب گیا اور باتیں شروع ہوگئیں۔ عجیب شکل وصورت تھی اس کی۔ وہ نوجوان تھا، یا جوان تھا، یا ادھیڑ عمر تھا یا بوڑھا تھا، کچھ کہنا مشکل تھا۔ مشقت نے اس کے چہرے بشرے سے اُس کی عمر کی ساری علامتیں چھین لی تھیں۔

اس کا نام عبدالعزیز تھا۔ میں نے پوچھا: عبدالعزیز آپ کے شہر کالا باغ میں ایسے کتنے سائیکل رکشہ ہیں؟

"ابھی — چالیس پچاس ہیں۔"

"آپ صبح کتنے بجے سے کتنے بجے تک رکشہ چلاتے ہیں؟"

"صبح آتے ہیں چھ بجے اور شام اذان تک رکشہ چلاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "یہ بتایئے کہ صبح سے شام تک آپ اتنی دیر جو رکشہ چلاتے ہیں۔ آپ کو روزانہ اندازاً کتنی آمدنی ہو جاتی ہو گی؟"

"بس جی، تیس چالیس روپے۔"

"جو میرا خیال ہے کہ کافی تو نہیں ہے۔"

"نہیں، کافی نہیں ہے۔ بس گزارا کرنا ہے ۔"

"یہ پیڈل رکشہ چلانے میں تو بڑی محنت لگتی ہے، آپ کی صحت پر اس کا بُرا اثر تو نہیں پڑتا ہے۔"

"بس جی کیا کریں، ابھی مزدوری جو کرنی ہے ۔ ابھی کوئی کام بھی نہیں ہے۔ کوئی ہل شل بھی نہیں ہے، جدھر کام ملے ۔"

میں نے پوچھا "اتنی مشقت کے لیے آپ اپنی غذا اور کھانے کا خیال رکھتے ہیں؟"

عبدالعزیز بولے "خیال کیا رکھنا ہے۔ ابھی بیس پچیس تیس کماتے ہیں، گھر کا بھی دھندا چلانا ہے اور اپنا بھی۔"

"آپ کے بال بچے ہیں؟"

"نہیں ہیں۔"

"آپ گھر میں کتنے لوگوں کی کفالت کرتے ہیں؟ ۔"

"پانچ چھ آدمی ہیں۔"

میں نے پوچھا "آپ نے کبھی تعلیم پائی ہے کسی اسکول میں؟ ۔"

"نہیں پائی ۔"

"آپ کا کیا خیال ہے، آپ کب تک رکشہ چلائیں گے؟ ۔"

"ابھی کیا کریں۔ جب تک کام نہیں ملتا رکشہ ہی چلانا ہے۔"

میں نے پوچھا ۔ "ہفتے میں آپ ایک آدھ دن رکشہ بند بھی رکھتے ہیں؟"

جواب ملا ۔ "نہیں جی، ہم چھٹی نہیں کرتے۔"

"آپ کا شادی کرنے کا ارادہ ہے؟"

"ابھی کچھ بھی نہیں ہے ۔"

"کوئی ارادہ ہے؟ ۔"

"ابھی ارادہ کدھر ہوگا۔ یہ مزدوری کروں یا شادی کروں، دونوں کام ایک ساتھ نہیں ہو سکتے۔ ابھی اپنا دھندا نہیں چلتا، ابھی آگے کیا کریں۔"

یہ کہتے کہتے عبدالعزیز ہنسا۔

مجھے پتہ نہیں وہ ہنسی تھی یا کیا تھا۔

وی سی آر کی سنچری

دریائے سندھ اوپر ہمالیہ کے پچھواڑے کیلاش کے پہاڑوں سے نکلتا ہے تو تنگ گھاٹیوں کی گھٹن برداشت کرتا کرتا نیچے پنجاب تک آجاتا ہے اور پھر جس جگہ وہ زمین کی تنگی سے نجات پاکر اچانک میدانوں میں نکلتا ہے اور آزادوں کی چال چلنے لگتا ہے، اس جگہ کا نام ہے کالا باغ ــــ کیسی عجیب جگہ ہے جہاں لوگوں کو دریا جیسی آزادی نصیب نہیں۔

وہ جو سارا پنجاب کبھی جاگیردارانہ نظام تلے کچلا ہوا تھا، وہ سارا پنجاب تو کبھی کا آزاد ہوکر ترقی کی کھلی فضاؤں میں جست لگاتا چلا جا رہا ہے مگر اس کا یہ گوشہ کہ جسے کالا باغ کہتے ہیں، آج تک پہلی جیسی گھٹن کا شکار ہے۔

یہ بڑا قدیم، بڑا تاریخی شہر ہے۔ دور سے دیکھیں تو دریا کے کنارے بلند ہونے والے نمک کے پہاڑوں پر یوں آباد ہے جیسے اس کے گھروندے آگے پیچھے نہیں، اوپر تلے بنائے گئے ہوں۔

میں کالا باغ میں داخل ہوا۔ ایک سڑک شہر کے بیچوں بیچ چلی جاتی ہے۔ دونوں طرف دکانیں اور مکان ہیں۔ داہنی طرف نیچے دریا ہے اور بائیں طرف اوپر تک مکان بنے ہیں۔ داہنی طرف کی گلیاں نیچے اترتی جاتی ہیں۔ بائیں ہاتھ کی تنگ گلیاں اوپر کو چلی جاتی ہیں۔ مگر گندی نالیاں جتنی بھی ہیں، سب کا رُخ نیچے کی طرف ہے ــــ دریا کی طرف!

ساری عمارتیں پرانی ہیں۔ وہ سب انگریزوں، ہندوؤں اور سکھوں کے زمانے کی ہیں۔ کچھ پر بڑی اچھی کھدائی ہے۔ لکڑی کے دروازوں پر خوبصورت نقش و نگار بنے ہیں۔ دریا کی سمت کھلی ہوئی کھڑکیوں سے نظارہ بھی آنکھوں کے راستے روح میں ٹھنڈک اتارتا ہوگا۔ میں سوچ رہا تھا کہ یہ عمارتیں کن لوگوں کی ہیں؟ ان مکانوں اور دکانوں کے مالک کون لوگ ہیں؟

اور میں وہ منظر کبھی نہیں بھول سکتا جب سڑک پر میرے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے راہ گیر موٹے موٹے آنسوؤں سے رو رہے تھے اور کہتے جا رہے تھے، سر، یہ عمارت میری تھی، جاگیرداروں نے چھین لی۔ سر، یہ جنرل اسٹور میرا تھا، انہوں نے ضبط کر لیا۔ اور یہ نوحہ اس بول پر ختم ہوا کہ سر، اُس مکان میں میرا اکلوتا بیٹا رہتا تھا، انہوں نے اسے قتل کرا دیا ـــــ

زمینیں شاداب ہوتی ہیں، بستیاں آباد ہوتی ہیں لیکن آبادیاں مظلوم بھی ہو سکتی ہیں، یہ بھید مجھ پر کالا باغ میں کھلا۔

میں دریا کے کشادہ سینے پر تیرتی کشتی میں بیٹھا کالا باغ کے ایک ملاّح سے باتیں کر رہا تھا اور اس کی باتوں کی آڑ سے بھی ایک مایوس اور اداس ذہن جھانک رہا تھا۔ کشتی لہروں پر ڈول رہی تھی۔ پانی پر پتوار کے تھپیڑے پڑ رہے تھے۔ میرے ملاّح کی زندگی اسی کشتی سے وابستہ تھی۔ اس کا نام حیات محمد تھا۔ میں نے اس سے پوچھا کہ حیات محمد آپ یہ کشتی کب سے چلا رہے ہیں؟

"عمر بھر سے کشتی چلا رہے ہیں، اَور کوئی کام نہیں۔"

"کیا آپ کے بڑے بھی یہی کام کرتے تھے؟ ـــ"

"یہی کام کرتے تھے۔"

"صبح کتنے بجے کشتی چلانا شروع کرتے ہیں؟"

"آٹھ بجے ـــ"

"اور شام کتنے بجے تک چلاتے ہیں؟ ـــ"

"چھ بجے تک۔"

"کتنے لوگ بیٹھتے ہیں آپ کی کشتی پر؟ ـــ"

"نصیب نال گل ہے، مقدر نال گل ہے۔"

"صبح سے شام تک کتنے پیسے کما لیتے ہوں گے اس کام میں؟ ـــ"

"کسی وقت بیس بن جاتے ہیں، کسی وقت سو بن جاتے ہیں اور کبھی پچاس بن جاتے ہیں۔"

"آپ کے بچّے بھی ہیں؟ ـــ"

"بچّے بھی ہیں!"

"کیا کام کرتے ہیں؟ کیا وہ بھی کشتی چلاتے ہیں؟"

"نہیں جناب وہ مزدوری کا کام کرتے ہیں۔"

"کوئی بچّہ اسکول بھی جاتا ہے؟—"

"ایک جاتا ہے۔"

"وہ بڑا ہو کر کیا کرے گا؟"

"خدا جانے—اُس کا نصیب۔ اس کا مقدر"

"اور مزدوری کرنے والے بچّے آپ کو کچھ دیتے ہیں؟"

"جناب وہ بال بچّے دار ہیں، ہمیں کچھ نہیں دیتے۔"

"اچھا یہ بتائیے کہ یہ دریائے سندھ آپ کو کیسا لگتا ہے؟—"

"جناب بہت عجب چیز ہے۔ ساڈی روزی اتھیں ہے۔"

"اس دریا سے آپ کو محبت ہے؟—"

"بس محبت کیسی ہے۔ لاچاری ہے، مجبوری ہے۔ روٹی تو کمانی ہے۔ اے چیز ہے۔"

ملاح سے میری باتیں ختم ہوئیں۔ جس دریا سے اس کی روزی بندھی ہے، اُس دریا سے اپنے تعلق کو وہ محبت کا نام دینے کے لیے تیار نہیں۔ حالات نے ان لوگوں کے ذہن کا یہ حال کیا ہے کہ اس روزگار کے تعلق کو بھی وہ لاچاری اور مجبوری کا نام دے رہا تھا اُس روز!

کشتی سے اتر کر، سیڑھیاں چڑھ کر، پرانے زمانے کی شاندار عمارتوں کے کھنڈروں کو پھلانگ کر، اوپر پہاڑی چٹانوں کے درمیان نمک کی تہیں دیکھتا ہوا میں کالا باغ کے بازار میں پہنچا اور ایک شخص سے گفتگو کرتا چلا تو ذرا دیر میں ایک قافلہ بن گیا۔ ہر شخص اپنے دکھ بتانا چاہتا تھا، ہر ایک اپنا دامن اٹھا کر اپنا گھاؤ دکھانا چاہتا تھا۔

سب سے پہلے صدیق ملے۔ وہ کالا باغ کی بلدیہ کے چیئرمین ہیں۔ مجھے بتا رہے تھے کہ پاکستان تو سنہ سینتالیس میں آزاد ہوا تھا لیکن کالا باغ ۵ جولائی ۱۹۷۹ء کو آزاد ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ کاغذات میں تو جاگیرداری کا خاتمہ ہوا مگر حقیقت میں کچھ بھی ختم نہ ہوا۔ میں نے صدیق سے پوچھا کہ یہاں کیا ہوتا تھا؟

وہ بولے "یہاں یہ ہوتا تھا کہ مختلف لوگوں سے بیگار لیا کرتے تھے۔ یہاں ان کی ایک نجی جیل تھی۔ جو آدمی ان کا حکم نہیں مانتا تھا وہ اس کو وہاں بھیج دیتے تھے۔ کچھ لوگ چھوٹ کر آجاتے تھے لیکن ہمارے تین آدمی آج تک نہیں آئے۔ سنا ہے کہ مر گئے ہیں لیکن ان کی لاشیں بھی نہیں مل رہی ہیں۔"

میں نے پوچھا "کالا باغ میں اب کیسے حالات ہیں۔ تعلیم، دوا علاج اور تعمیرات کا کیا حال ہے؟"

صدیق نے جواب دیا "پہلے تو ہمیں جاہل رکھا گیا۔ یقین کیجیے کہ ہمارا کوئی بھی آدمی میٹرک پاس نہیں تھا۔ یہ جو اسکول آپ دیکھ رہے ہیں، یہ انگریزوں کے وقت سے آ رہا ہے۔ پھر جب انتخابات ہوئے تو ہم نے ایک امیدوار سے وعدہ لیا کہ وہ ہمارے تین آدمیوں کو تلاش کرے گا اور دوسرے یہ کہ ہمارے علاقے میں کالج بنوائے گا تاکہ ہمارے لوگ سماجی اور تعلیمی طور پر آگے آئیں۔ امیدوار نے وعدہ کر لیا اور ہم نے بھاری اکثریت سے اُسے جتوایا۔ لیکن منتخب ہونے کے بعد اُس نے بھی اس مسئلے پر کوئی توجہ نہیں دی۔ اب جب وہ دوبارہ ووٹ مانگنے آیا تو ہم نے کہا کہ آپ نے ہمارے لیے کچھ نہیں کیا تھا لہذا ہم آپ کو ووٹ نہیں دیں گے۔ اس کے بعد ہم نے دوسرے اُمیدوار کو جتوایا اور ان کے سامنے صرف ایک ہی مطالبہ رکھا کہ ہمارے علاقے کو تعلیمی میدان میں آگے لائیں۔ کالا باغ ضلع کا دوسرا بڑا شہر ہے، تاریخی شہر ہے۔ آبادی اور کاروبار کے لحاظ سے بھی یہ دوسرا بڑا شہر ہے۔"

میں نے حیرت کا اظہار کیا "مگر تعلیم کے لحاظ سے؟"

انہوں نے جملہ پورا کر دیا "بہت زیادہ پسماندہ۔"

جو مجمع مجھے گھیرے کھڑا تھا اب میں اس سے مخاطب ہوا اور ایک ایک سے پوچھنا شروع کیا کہ کس کس نے تعلیم پائی ہے۔ زیادہ تر بچوں کی آوازیں آئیں "میں نے۔ میں نے۔" لیکن بڑوں نے نفی میں گردنیں ہلا دیں۔ صرف ایک شخص نے کہا "میں نے میٹرک تک تعلیم پائی ہے۔ اس کے بعد یہاں کالج ہی نہیں تھے۔ میں پڑھ ہی نہیں سکا۔"

میں نے لوگوں سے پوچھا "اب آپ کا کیا خیال ہے کہ انتخابات میں جو امیدوار چنا گیا

ہے اس کے ہاتھوں شہر کے مسئلے حل ہوجائیں گے؟۔"
جواب ملا —" امید ہے تو ہے جی۔ حل ہوجائیں گے —"
میں نے پوچھا —" اگر اس امیدوار نے بھی آپ کو مایوس کیا تو اگلے انتخابات میں آپ کیا کریں گے؟"
لوگ بولے، بلکہ حقیقت یہ ہے کہ جمہوریت بولی:
" دوسرا چُنیں گے —"
" ہم ان کو تو ووٹ نہیں دیں گے —"
" بالکل۔ دوسرا پھر چُنیں گے۔"

فی الحال تو کالا باغ کے نوجوانوں نے بیکاری میں اپنے لیے ایک مشغلہ چن لیا ہے۔
میں شہر کے بڑے بازار میں چلا جا رہا تھا۔ اسی بازار میں مرغ کی یخنی کی ایک دکان تھی۔ باہر چھلے ہوئے اُبلے ہوئے مرغ ٹنگے تھے اور پتیلیوں میں یخنی پک رہی تھی۔ اس بات کی کوئی ضمانت نہیں کہ یہ یخنی اُن ہی ٹنگے ہوئے مرغوں کی ہوگی۔
دکان کے اندرونی حصے میں ذرا اندھیرا تھا اور ٹیلی ویژن پر ہندوستانی فلم چل رہی تھی اور شہر کے کوئی دو درجن بے مصرف، بے کار جوان بیٹھے فلم دیکھ رہے تھے۔ کوئی دل دہلا دینے والا منظر تھا۔ کوئی مظلوم لڑکی تھی۔ کچھ ظالم اس کی آبرو پر حملہ کر رہے تھے۔ دیکھنے والے نوجوانوں نے اپنے شانے اونچے کر رکھے تھے، سانسیں روک رکھی تھیں اور ہاتھ اپنی ٹانگوں میں دبا کر آنکھیں یوں پھاڑ رکھی تھیں کہ اس منظر کی کوئی تفصیل کہیں دیکھنے سے نہ رہ جائے۔
میں نے دکان کے مالک سے پوچھا: "یخنی بیچنے کے ساتھ ساتھ کیا آپ وی سی آر بھی دکھاتے ہیں؟"
"جی جناب۔"
" کیا اس کا کوئی ٹکٹ بھی ہے؟ —"
"ٹکٹ کے بغیر ہے جناب۔"
" جو بھی چاہے آ کر دیکھ لے؟ —"

"جو چاہے آکر دیکھ لے۔ کوئی ٹکٹ نہیں ہے —"

"لاٹری بھی نہیں ہے؟"

"سودا بیچنے کے لیے ہے۔ بس گاہک راضی خوشی رہے —"

"روز کتنی فلمیں چلاتے ہیں آپ؟ —"

"سارے دن میں تین فلمیں چلاتے ہیں۔"

"اور کتنے لوگ دیکھ جاتے ہیں دن بھر میں؟ —"

"کافی —"

"ستر اسّی؟"

"جی نہیں۔ سنچری ہو جاتی ہے۔"

اس جواب پر سب ہنسے۔ کالا باغ میں لمحہ بھر کو بہار آگئی۔

حیرت کا شہر

داؤد خیل جہاں ہے وہاں اسے دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ صوبہ پنجاب کے ضلع میانوالی میں دریائے سندھ کے قریب یہ دور دراز، ویران سا پسماندہ علاقہ تھا جسے جاگیرداروں نے ہمیشہ کچل کر رکھا۔

آپ ان علاقوں میں چلتے ہوئے اچانک داود خیل پہنچیں تو حیرت زدہ رہ جائیں گے۔ جیسے صحراؤں میں سراب ہوتا ہے ویسے ہی ویرانوں میں یہ بہت بڑا صنعتی علاقہ ہے اور سراب کی طرح نظر کا فریب نہیں — ٹھوس حقیقت ہے۔

داؤد خیل میں ۱۹۵۴ء سے بڑے بڑے کارخانوں کے قیام کا کام شروع ہوا۔ اب یہاں چار بڑی صنعتیں اور ان سے متعلقہ چھوٹی صنعتیں ہیں۔ ہزاروں لوگ برسرِ روزگار ہیں۔ بڑی بڑی کالونیاں ہیں۔ لمبی چوڑی آبادیاں ہیں۔

یہاں جہاں جہالت کا دور دورہ تھا، لوگ ہر وقت انتقام لیا کرتے تھے، ہر روز قتل کیا کرتے

تھے، یہاں وقت نے ایسی کروٹ لی ہے کہ اس سرزمین کا سارا حلیہ بدل گیا ہے۔

اب آپ داؤدخیل جائیں تو جی شاد ہوتا ہے۔ کہیں کوٹھیاں اور بنگلے ہیں، کہیں اسکول اور اسپتال ہیں۔ بازار ہیں، پٹرول پمپ ہیں۔ راتوں کو روشنیاں ہیں اور دنوں میں ایسی چہل پہل کہ اس کے ریلے میں بہہ جانے کو جی چاہے۔

جو چیز دل میں اتری چلی جاتی ہے وہ داؤدخیل کے باشندوں کا سبھاؤ ہے۔ ایسے مہمان نواز، ایسی خاطر مدارات کرنے والے اور سینے سے یوں بھینچ بھینچ کر لگانے والے کہ ان کی جیسی گرم جوشی قصے کہانیوں میں ملے تو ملے، کہیں اور نہیں مل سکتی۔

میں سب سے پہلے شہر کے ایک ڈاکٹر سے ملا: ڈاکٹر منظور حسین! ایک بازار میں ان کا مطب تھا۔ میں ملنے پہنچا تو مطب خالی پڑا تھا۔ نہ کوئی مریض، نہ کمپاؤنڈر، نہ خود ڈاکٹر صاحب — میں دیر تک اس اسٹول پر بیٹھا رہا جس پر بیٹھ کر مریض اپنا حال کہتے ہوں گے۔ وہاں بیٹھے بیٹھے یہ ہوا کہ میں ڈاکٹر صاحب کا حال جان گیا۔ ان کی میز پر رکھے ہوئے کاغذات سے اندازہ ہوا کہ شعروادب کا ذوق ہے، شہر کی سماجی سرگرمیوں میں شامل ہیں، داودخیل کے پرانے باشندے ہیں اور بہت مقبول ہیں۔

ان کے مطب میں بیٹھے بیٹھے جب بہت وقت گزر گیا اور راہ گیروں نے آتے جاتے میری بے چینی کو بھانپنا شروع کر دیا تو اُن سے رہا نہ گیا اور مجھے اجنبی جان کر وہ میری مدد کو آ گئے — کسی نے مجھے اپنے اسکوٹر پر بٹھایا اور ڈاکٹر منظور حسین کے گھر پہنچا دیا۔ وہ اتنے تپاک سے ملے کہ مجھے ان سے یہ بھی پوچھنا یاد نہ رہا کہ آپ کا مطب تنہا کیوں پڑا ہے اور کوئی وہاں سے کچھ چرا کر تو نہیں لے جائے گا۔

البتہ گفتگو شروع ہوتے ہی میرے سوالوں کے جواب شروع ہو گئے۔ گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ میں نے پوچھا کہ ڈاکٹر صاحب۔ آپ داودخیل کے باشندوں کو کیونکر بیان کریں گے؟

جواب ملا — " عابدی صاحب۔ یہاں کے لوگ سچے اور کھرے ہیں۔ دشمن کے دشمن ہیں اور دوست کے دوست ہیں۔ ملنسار ہیں، مہمان نواز ہیں اور خلیق ہیں۔ آپ انہیں جب بھی دیکھیں گے اور ان سے جب بھی ملیں گے، انہیں زندہ دل، ہنس مکھ اور خوش اطوار پائیں گے۔ بہرحال،

ان کے بھی کچھ مسائل ہیں۔ کبھی کبھی وقت، یہ طیش میں آجاتے ہیں لیکن بہرصورت، بحیثیتِ مجموعی یہ لوگ زندہ دل اور خوش خلق ہیں۔"

میں نے پوچھا۔" اور وہ جو ہم سنتے چلے آرہے ہیں کہ یہ لوگ بے دھڑک گولی مار دیتے ہیں، اُس کا کیا قصّہ ہے؟ ___"

ڈاکٹر صاحب بولے "وہ تو خیر ہر جگہ ہے مگر اس کا سبب خاندانی دشمنیاں ہیں جو ان کی اپنی ہیں۔ دوسروں سے ان کا کوئی جھگڑا نہیں۔ اور وہ جو ان کی دیرینہ عداوتیں چلی آرہی تھیں، وہ بھی تعلیم کے نہ ہونے کی وجہ سے تھیں اور جاہلیت کی وجہ سے تھیں۔ اب کچھ عرصہ ہوگیا ہے کہ نئی نسل پڑھ لکھ گئی ہے اور اب وہ دشمنی بھی ختم ہو رہی ہیں اور لڑائی جھگڑے بھی ختم ہو رہے ہیں۔ امید ہے کہ کچھ عرصے بعد آپ ان لوگوں کو سلجھا ہوا پائیں گے، یہاں کچھ بھی نہیں ہوگا۔"

اب میں نے ڈاکٹر منظور حسین قریشی سے پوچھا کہ آپ تو داؤد خیل کے پرانے شہری ہیں۔ بتائیے اس شہر اور اس کے معاشرے میں کیا تبدیلی آئی ہے؟

وہ بہت پُرامید تھے۔ کہنے لگے ___" آج کے داؤد خیل میں اور پچیس سال پہلے کے داؤد خیل میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ یہاں پہلے تعلیم نہیں تھی، اب لوگ بہت زیادہ تعلیم یافتہ ہو رہے ہیں۔ یہاں صنعتیں لگی ہیں لہٰذا لوگ نہ صرف برسرِ روزگار ہیں بلکہ ہُنر مند بھی ہوگئے ہیں۔ ان تمام باتوں کی وجہ سے لوگوں میں کچھ شعور آرہا ہے جس کی ایک دلیل یہ ہے کہ اب بچے بڑے اشتیاق سے پڑھتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ جس طرح اب معاملہ چل نکلا ہے اس سے ہم ترقی یافتہ شہریوں جیسے ہو جائیں گے۔"

داؤد خیل کے بدلتے ہوئے معاشرے کا ذکر چل رہا تھا ___ ڈاکٹر صاحب نے کچھ پتے کی باتیں بتائیں۔ کہنے لگے "یہاں بیس پچیس سال سے صنعتیں قائم ہیں۔ بہت سی فیکٹریاں ہیں جن میں ہمارے شہر کے لوگ بھی کام کرتے ہیں، ضلع کے لوگ بھی ہیں لیکن دلچسپ بات یہ ہے کہ اس روزگار کی وجہ سے پورے پاکستان کے ہر علاقے کا آدمی آپ کو یہاں مل جائے گا۔ اُس کا گہرا اثر پڑا ہے۔ مثال کے طور پر یہاں ٹریڈ یونین کے انتخابات ہوتے ہیں۔ ان میں ہر ایک کے دوست احباب اور عزیز و اقارب شریک ہوتے ہیں اور ان کی وجہ سے پوری آبادی ان

میں حصہ لیتی ہے اور میرا خیال ہے کہ اُس موقع پر داؤد خیل والوں کا سیاسی شعور کراچی والوں سے کسی بھی طرح کم نہیں ہوتا۔"

اب میں نے موضوع بدلا" یہ بتایئے ڈاکٹر صاحب کہ علم کے ساتھ شعر و ادب کا ذوق بھی یہاں پہنچا ہے یا نہیں۔ عام لوگ شعر کہتے ہیں؟ ــــ"

وہ بولے ــــ" ہاں کہتے ہیں۔ لیکن یہاں عام لوگوں کی زبان سرائیکی ہے۔ تو یہ لوگ اپنی حد تک اور اپنی سطح تک سرائیکی میں شعر کہتے ہیں۔ میرا مطلب ہے کہ وہ شعر نہ کہیں شائع ہوتے ہیں اور نہ مشاعروں میں پڑھے جاتے ہیں۔ مثلاً یہ لوگ دوہڑے کہتے ہیں اور ماہیے بھی کہتے ہیں۔ بس اسی قسم کی شاعری یہاں پسند کی جاتی ہے ــــ"

میں نے پوچھا" کیا لوگ راتوں کو گاتے ہیں؟"

وہ بولے ــــ" ہاں، کبھی کبھار دوہڑے کی تان یا ماہیے کی کلی گونجتی ہے راتوں کو ورنہ اب وہ پہلی سی بات نہیں۔ اب ان لوگوں کو فرصت بھی نہیں اوپر سے معاشی فکریں ہیں۔ ہر آدمی ایک مستقل چکر میں ہے چنانچہ یہ گانا بجانا آہستہ آہستہ ختم ہو رہا ہے۔"

داؤد خیل کا سب سے بڑا واقعہ صنعتوں کا قیام ہے لیکن لوگ تعلیم کی باتیں زیادہ کرتے ہیں اور تعلیم کے پھیلنے پر بجا طور پر ناز کرتے ہیں۔ اُس روز میری ملاقات تعلیم پھیلانے والی ایک شخصیت سے ہوئی۔ حبیب اللہ خاں کی باتیں دل کے ورق پر آج تک نقش ہیں۔

خوب ہیں وہ بھی۔ ۱۹۵۰ء میں کسی کارخانے میں ملازم ہوئے تو ان کی آنکھیں مسلسل دیکھتی رہیں کہ علم سے محروم لوگ کتنے خسارے میں رہتے ہیں۔ ایک جہالت کی وجہ سے انہیں سو اندھیرے دکھائی دیئے۔ ہر گھر میں اور گھر کے ہر گوشے میں تاریکی تھی۔ حبیب اللہ خاں نے بیس سال کی لگی لگائی ملازمت چھوڑی، داؤد خیل کے لوگوں کو پڑھانے کا فیصلہ کیا اور ۱۹۷۰ء میں تعلیم کے میدان میں اتر آئے اور آج تک جہالت کے اندھیروں میں اپنا چھوٹا سا چراغ جلائے ہوئے ہیں۔ اُس روز چھوٹے سے چراغ جیسے ایک کمسن بچے کا قصہ سُنا رہے تھے۔ اور یہ قصہ اس علاقے کے لوگوں کی، پرانی ذہنیت کی سچی تصویر تھا۔

کہنے لگے ــ" مجھے ایک واقعہ یاد آرہا ہے۔ میں اسکول میں پڑھا رہا تھا۔ میرے پاس ایک بچہ پڑھتا تھا وہ بہت پیارا تھا۔ مجھے اُس پر ترس آتا تھا۔ اس کا نام بھی حبیب اللہ تھا۔ ایک دن اس نے اسکول کا کام نہیں کیا۔ مجھے غصہ آیا اور میں نے اُسے سزا دی۔ اس پر وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس پر مجھے ترس آیا اور اس کی حالت دیکھ کر میں خود بھی آب دیدہ سا ہوگیا۔ اُس سے پوچھا کہ بھئی کیا بات ہے؟ کیوں رونے لگ گئے ہو؟ تو وہ کہنے لگا کہ جی مجھے اپنے دادا کے قتل کا بدلہ لینا ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ماں مجھے کیوں پڑھا رہی ہے۔ یہ ذہنیت تھی ہماری آج سے بیس سال پہلے۔"

میں نے حبیب اللہ صاحب سے پوچھا ــ" اب کیا حال ہے۔ کیا اب بڑے بوڑھے اپنے بچوں کو اسکول لاتے ہیں کہ لیجیے انہیں پڑھا دیجیے؟"

وہ بولے ــ" نہیں۔ یہ بات ابھی نہیں ہے۔ آج سے پچیس سال پہلے کی بات ہے، میں دسویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ یہ جو سڑک ہمارے داؤدخیل شہر سے گزرتی ہے، جسے ہم شیرشاہ سوری روڈ کہتے ہیں، اس پر جی ٹی ایس والے اپنی بس چلانا چاہتے تھے۔ ان کا ایک افسر سڑک کا معائنہ کرنے آیا۔ ہم سب کھڑے تھے۔ ہمارے ایک بزرگ نے اپنی پگڑی اتار کر افسر کے قدموں میں رکھ دی اور کہنے لگے کہ خدارا ہمارے علاقے میں بس نہ چلائیں۔ ہمارے بچے بس کے نیچے آجائیں گے ــــ بعد میں جب ہم جوان ہوئے اور معاملات سمجھ میں آنے لگے تو احساس ہوا کہ بس کی مخالفت صرف اس لیے کی جارہی تھی کہ زمانے کی جدید چیزوں کا ادھر سے گزر نہ ہو اور ہم سب ہمیشہ کی طرح جاہل اور محروم رہیں۔"

اب میں نے حبیب اللہ خاں صاحب سے پوچھا کہ داؤدخیل میں جب لڑکوں کی تعلیم کا یہ حال رہا تو لڑکیوں کو تو بالکل ہی جاہل رکھا جاتا ہوگا؟

وہ کہنے لگے ــــ" جی ہاں۔ لڑکیوں کو پڑھانے کی ہمارے ہاں کوئی روایت نہیں ہے۔ تقریباً تین چار سال کے دوران میں نے دو لڑکیوں کو تعلیم دی اور وہ اب باقاعدہ سند یافتہ نرسیں بن گئی ہیں۔ میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ انہوں نے ایم بی بی ایس پاس کرلیا البتہ اس دیہاتی معاشرے میں ان کا تھوڑا سا مقام بن گیا ہے۔ ان کے بعد کچھ اور لڑکیوں نے میٹرک پاس کیا ہے۔ میری اپنی

بہن بھی میٹرک پاس ہے۔ مجھے محسوس ہوتا ہے کہ ادھر چار پانچ سال کے دوران بچیوں کو تعلیم دلانے کا شعور پیدا ہو رہا ہے۔"

میں نے پوچھا — "حبیب اللہ خان صاحب۔ کیا سارے بڑے بوڑھے تعلیم سے بیزار ہیں یا کچھ ایسے بھی ہیں کہ جن کے بال سفید ہو گئے ہوں، کمر جھک گئی ہو، آنکھیں کمزور ہو گئی ہوں اور وہ آپ کے پاس آئے ہوں کہ ماسٹر صاحب، مجھے پڑھا دیجئے؟۔

خان صاحب نے جھٹ ایک واقعہ سنا دیا — "جی ہاں۔ میرے پاس ایک آدمی آیا تھا جس کی عمر مجھ سے زیادہ ہے۔ بوڑھا ہے۔ وہ کچے میں رہتا تھا اور کہیں سے بنیادی تعلیم حاصل کر چکا تھا۔ مجھے پتہ نہیں کہ وہ کبھی اسکول گیا تھا یا نہیں بہرحال جب وہ میرے پاس آیا تو اس کے ہاتھ میں قاعدہ تھا۔ میں اس کو پڑھانے لگا۔ اس پر بچوں نے حیرت اور خفگی کا اظہار بھی کیا کہ آپ بوڑھوں کو ہمارے ساتھ کیوں بٹھاتے ہیں؟ مگر وہ پڑھتا رہا اور میٹرک پاس کر کے اب وہ فیکٹری میں کلرک ہے —"

میں نے اپنا آخری سوال کیا "یہ بتائیے حبیب اللہ خان صاحب کہ کیا وقت بدل رہا ہے اور کیا اچھا زمانہ آ رہا ہے؟ —"

جواب ملا — "یقیناً نئے زمانے اور اچھے زمانے کی نوید ہے اور انشاء اللہ زمانہ بدلے گا۔ اور اگر آپ کو کبھی اتفاق ہوا اور آپ دوبارہ داؤد خیل آئے تو پتہ نہیں ہم زندہ ہوں گے یا نہیں لیکن آپ داؤد خیل کو بدلا ہوا پائیں گے اور آپ داؤد خیل کو ترقی کی راہوں پر گامزن دیکھیں گے —"

ہیروئین آگئی ہے

میانوالی کے ڈگری کالج میں طالب علم مجھے گھیرے کھڑے تھے۔ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں ایک سوال پوچھتا تھا، مجھے سو جواب ملتے تھے مگر میں نے یہ جو پوچھا کہ ڈگری پا کر آپ کو روزگار ملتا ہے یا نہیں، جواب تو اس بار بھی سَو ملے مگر مطلب اُن سب کا ایک ہی تھا: نہیں!

ویسے تو یہ المیہ سارے ہی علاقوں، سارے ہی شہروں اور سارے ہی قصبوں کا ہے مگر دریائے سندھ کے کنارے کنارے جس تنگ سی پگڈنڈی پر میں چل رہا ہوں وہ عجیب راستہ ہے جو کبھی ویرانوں میں چلتا ہے اور کبھی بستیوں سے گزرتا ہے مگر نہ یہ پتہ چلتا ہے کہ ویرانے کہاں ختم ہوئے اور نہ یہ احساس ہوتا ہے کہ آبادیاں کب شروع ہوئیں۔

دریا کے ساتھ ساتھ یہ سارا علاقہ بڑے شہروں سے دور، بڑی شاہراہوں سے الگ تھلگ، بڑے مرکزوں سے پرے اور بڑی ریلوے لائنوں سے ہٹ کر واقع ہے۔ یہ علاقہ نظر بھی آتا ہے مگر اوجھل بھی ہے۔ یہ شہر یہ قصبے کنبے کے اُن لڑکوں جیسے ہیں جن کے لاڈ پیار نہیں ہوتے، جن کے بناؤ سنگھار نہیں کیے جاتے، جنہیں بس ان کے حال پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

میانوالی —— سچ پوچھیے تو بالکل یوں ہے کہ اگر پاکستان کے نقشے پر پشاور، راولپنڈی، گوجرانوالہ لاہور اور فیصل آباد کو ملا کر چاند بنا دیا جائے تو یہ عین اُس جگہ آتا ہے جہاں تارا ہونا چاہیے مگر اس شہر کو شاید وہ آنکھ نصیب نہ ہوئی کہ یہ جس آنکھ کا تارا ہوتا۔

یہ شہر ہے تو مگر سارے بڑے شہروں سے دور ہے۔ یہاں کارخانے لگ سکتے تھے مگر نہیں لگ سکے۔ یہاں معدنیات نکل سکتی تھیں، مگر نہیں نکل سکیں۔ یہاں زراعت کو فروغ ہو سکتا تھا مگر نہ ہو سکا۔ اس کے بعد یہاں منڈیاں قائم ہوتیں، دفتر کھلتے، کالونیاں آباد ہوتیں، کشادہ سڑکیں

بستیں۔ یہ کچھ نہ بن سکا۔

ترقی کے بڑے دھارے سے کٹ کر رہنے والے علاقے اکثر یوں ہی خسارے میں رہا کرتے ہیں۔ میں داؤدخیل سے میانوالی کی طرف چلا تو میرے ساتھ ساتھ ایک نہر چلی، تھل پروجیکٹ کینال۔ اکثر نہریں نشیب میں ہوا کرتی ہیں۔ یہ اونچے پشتے باندھ کر اٹھائی گئی تھی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ دونوں طرف کی زمینوں سے پانی پھوٹ پڑا۔ ہرے کھیت شورے کے تالاب بن گئے اور ان کے بیچ جزیرہ بن جانے والی بستیوں کی دیواروں کو نمک چاٹنے لگا۔

آگے چل کر یہ نہر میانوالی شہر سے پہلو بچا کر نکل گئی۔ اب اس شہر کی ایک جانب نہر تھی، دوسری طرف دریائے سندھ تھا۔ اصولاً تو میٹھے پانی کی گودی میں پلنے والی آبادیاں خوب پھلا پھولا کرتی ہیں، تو پھر میانوالی کے نوجوانوں نے مایوس ہو کر گردنیں کیوں ڈال دی ہیں؟

میں نے ڈگری کالج کے ایک استاد سے پوچھا کہ کالا باغ کے مقام پر جناح بیراج سے یہ جو عظیم الشان نہر نکالی گئی ہے اس سے میانوالی کو کوئی فائدہ پہنچا؟

جواب ملا ــــ "میانوالی کو مجموعی طور پر کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ چاہیے تو یہی تھا لیکن قصہ یہ ہے کہ یہ نہر انگریزوں نے اپنے خاص لوگوں کے لیے نکالی تھی اور یہ نہر ان ہی لوگوں اور خاندانوں کے علاقوں سے گزرتی ہے پھر ۱۹۶۲ء میں یہاں لفٹ اِرری گیشن اسکیم بنائی گئی۔ لیکن وہ بھی ایک مخصوص سیاسی طبقے کے لیے تھی۔ انہوں نے صرف اپنی زمینیں سیراب کیں۔ مجموعی طور پر ہمیں اس نہر سے کچھ فائدہ نہیں۔ احساس محرومی کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ نہر گزرتی ہے۔ مگر لوگوں کی زمینیں بے آب پڑی ہیں۔ وسائل ہیں لیکن وسائل سے فائدہ نہیں اٹھایا جا رہا ہے۔ حکومت کی کوئی توجہ اس طرف نہیں۔"

یہ ایک استاد کا بیان ہے لیکن اس علاقے میں ہر ایک کا بیان یہی ہے کہ یہاں جتنے ترقیاتی کام ہوئے بڑے بڑے لوگوں، گھرانوں اور جاگیرداروں کی خاطر ہوئے۔ مثلاً میں نے کسی سے پوچھا کہ دریائے سندھ کے اس پار کا سارا علاقہ صوبہ سرحد میں ہے، پھر کالا باغ اور عیسیٰ خیل کے گرد باہیں ڈال کر انہیں پنجاب میں کیوں سمیٹ لیا گیا۔ جواب ملا: یہ کارروائی ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی، وہی پنجاب کے جاگیرداروں کی خاطر!

Scanned by CamScanner

نہر کی بات ہو چکی۔ اب سوال یہ تھا کہ میانوالی کی دوسری جانب دریائے سندھ بہتا ہے، اس سے بھی اس شہر کو کوئی فائدہ ہے یا نہیں؟ پتہ چلا کہ میانوالی کے پہلو میں وہ سرسبز علاقہ ہوا کرتا تھا جو کچّا کہلاتا تھا، اُسے دریا نگل گیا اور وہاں سے جو خوراک شہر والوں کو ملا کرتی تھی، اُسے دریا کھا گیا۔ ہاں تو میرا سوال تھا کہ دریائے سندھ سے شہر میانوالی کو کوئی فائدہ ہے؟

انہوں نے کہا—"چشمہ بیراج بننا غضب ہو گیا۔ اس کی تعمیر سے پہلے دریائے سندھ ہمیں بہت فائدہ پہنچاتا تھا۔ کچّا کا علاقہ بہت آباد تھا بلکہ خود میانوالی کا پرانا نام کچّی ہے۔ کچّی سے مراد ہے دریا کے بغل میں! چشمہ بیراج بننے سے پہلے جب سیلاب آتے تھے تو بہت سی زمینیں سیراب ہو جایا کرتی تھیں۔ بیراج بنا تو یہ زمینیں خالی کرالی گئیں۔ ان ہی زمینوں سے مرغیاں، انڈے، گھی اور سبزیاں آتی تھیں، وہ سب ختم ہو گئیں اور شہر کو سخت نقصان ہوا—"

کیسی عجیب بات ہے۔ بیراج بنتے ہیں خلق خدا کے بھلے کی خاطر لیکن بیراجوں کے سینے میں دل نہیں دھڑکتے۔ وہ نہیں جانتے کہ ان کے بننے سے کتنی زمینیں بنیں گی اور کتنی مٹیں گی۔

یہی تو وہ زمینیں ہیں جہاں کالا ڈیم بنانے کا منصوبہ ہے۔ ایک خلقت ہے جو چلّا رہی ہے کہ کالا باغ ڈیم مت بناؤ، یہ ہمیں کھا جائے گا۔ دوسری خلقت ہے جس کا نعرہ ہے کہ کالا باغ ڈیم ضرور بناؤ۔ یہ ڈیم بنے گا تبھی ہمیں کچھ کھانے کو ملے گا۔

اُس روز میں نے میانوالی کے ڈگری کالج میں مستقبل سے مایوس لڑکوں سے پوچھا تھا کہ کالا باغ ڈیم بنا تو اس سے میانوالی کو کیا فائدہ ہوگا، تو ایک مجمع مل کر چلّایا تھا—"سر، میانوالی کو بہت فائدہ ہوئے گا۔ بہت زیادہ لوگ بے روزگار ہیں، انہیں روزی ملے گی۔ پہلے یہاں اسٹیل مِل منظور ہوئی تھی لیکن جاگیرداروں کی وجہ سے وہ منسوخ ہو گئی۔ اس کی وجہ سے بہت زیادہ بے روزگاری ہے۔ تو اگر ڈیم بن جائے تو بہت سے بے روزگار لوگ جو آوارہ اوباش ہو گئے ہیں، وہ ملازم ہو جائیں گے اور ہمارے مسئلے حل ہو جائیں گے—"

اس علاقے میں ایک پوری تنظیم قائم ہے جس کا نام ہے: کالا باغ ڈیم بناؤ تحریک! شہر کے بڑے بازار میں میری ملاقات اس تحریک کے نائب صدر محمود الحسن خان نیازی سے ہوئی۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ کالا باغ ڈیم بنانے کی تجویز کے بارے میں آپ کیا سمجھتے ہیں؟

انہوں نے کہا ــــ" میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ ملکی مفاد کا سب سے بڑا پروجیکٹ ہے اور عام لوگ شدت سے محسوس کرتے ہیں کہ یہ ڈیم بننا چاہیے۔ ہم یہ کہتے ہیں کہ یہ ڈیم پنجاب میں یا کسی مخصوص صوبے میں نہیں بن رہا ہے بلکہ پاکستان میں بن رہا ہے اور پاکستان کے لیے بن رہا ہے۔ مشکل یہ ہے کہ کچھ لوگوں نے سیاست چمکانے کے لیے مسئلے پیدا کر دیئے ہیں لیکن ہمیں امید ہے کہ حکومت اس پر پوری توجہ دے گی اور غیر جانبدارانہ طور پر عوام سے پوچھ کر اس کی تکمیل کرے گی۔"

میں نے پوچھا کہ پورے ملک کو تو فائدہ ہوگا، یہ بتایئے کہ کالا باغ ڈیم بننے سے میانوالی کے پسماندہ علاقے کو کیا فائدہ پہنچے گا؟

انہوں نے جواب دیا ــــ" بہت فائدہ پہنچے گا۔ ایک تو اس سے ہمیں بہت بڑی نہر ملے گی جو ہمارے تھل کے وسیع علاقے کو سیراب کرے گی۔ اس سے موسیٰ خیل اور قائد آباد وغیرہ خوشحال ہوں گے۔ اور دوسرے یہ کہ ہماری یہ پسماندگی بے روزگاری کی وجہ سے ہے۔ ڈیم بنے گا تو بیروزگاری کا مسئلہ حل ہوگا۔ لوگوں کے پاس پیسہ آئے گا تو تجارت بڑھے گی، کاروبار بڑھے گا۔ شاپنگ سنٹر کھلیں گے اور ہر سال لاکھوں کا بیوپار ہوگا ــــ"

بات گھوم پھر کر وہی بے روزگاری تک جا پہنچی ــــ میں کالج کے ایک اور استاد سے پوچھ رہا تھا کہ میانوالی کے نوجوانوں کا سب سے بڑا مسئلہ کیا ہے؟۔

وہ بولے ــــ" وہی بے روزگاری۔ میانوالی بنیادی طور پر معدنیات سے مالا مال ہے، ہمارے پہاڑ دھاتوں سے بھرے پڑے ہیں لیکن عملی طور پر ان سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ یہ علاقہ اور اس کے باشندے پسماندہ ہیں مثلاً یہاں کے لڑکے مقابلے کے امتحانوں میں بیٹھنے لاہور جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ ان کا ذہنی معیار اتنا بلند نہیں جتنا خود لاہور کے لڑکوں کا ہے۔ یہی حال اعلیٰ تعلیم اور ملازمتوں کا ہے۔ لہٰذا احساس محرومی ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ یہاں سرائیکی صوبے کی تحریک چلی ہے۔ لوگ اس میں بڑی دلچسپی لے رہے ہیں۔ ماضی میں ہماری مقامی قیادت نے کوئی توجہ نہیں دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ اب سوچتے ہیں کہ اگر الگ ایک صوبہ مل جائے تو شاید ہم بہتر طور پر ترقی کر سکیں۔"

سرائیکی صوبے کا مطالبہ کرنے والے یہی سمجھتے ہیں کہ یہ خطہ با اختیار ہو جائے گا تو اس کے بھی

دن پھریں گے۔ اس کے بھی نصیب جاگیں گے۔ اسے بھی سُکھ چین ملے گا۔ ٹھیک ہے۔ سرائیکی صوبہ علاقے کی تقدیر تو بدل دے گا مگر لوگوں کا ذہن بھی بدل سکے گا کیا؟ یہی تو وہ خطّہ ہے جہاں صدیوں پہلے کوئی ایک قتل ہوا ہوگا، آج صدیوں بعد تک اس کے انتقام لینے کا سلسلہ چلا آرہا ہے۔ میں نے میانوالی کے ایک اور استاد سے پوچھا کہ علاقے میں آئے دن کے قتل، انتقام اور خاندانی جھگڑوں کا پس منظر کیا ہے؟

انہوں نے کہا۔۔۔"یہ قبائلی علاقہ ہے۔ یہ قبیلے صدیوں سے یہاں آباد ہیں اور جس طرح پُرانے زمانۂ جاہلیت میں ہوتا تھا کہ اگر ایک آدمی قتل ہوجائے تو پھر خاندان کے ہر فرد کا یہ فرض ہوتا تھا کہ وہ انتقام لے۔ یہاں بھی قبائلی عصبیت کی وجہ سے وہی سلسلہ جاری ہے۔ اس کے علاوہ تعلیم بھی اتنی زیادہ نہیں۔ فراخ دلی کا جذبہ نہیں۔ معاف کرنے کا جذبہ نہیں لہٰذا صلح بہت کم ہوتی ہے۔ جس نے قتل کیا ہے اُسے تو زندہ رہنے کا حق نہیں لیکن جس کا قتل ہوا ہے اس کے ورثا کو کبھی شرم دلائی جاتی ہے کبھی جوش دلایا جاتا ہے اور انتقام پر مجبور کیا جاتا ہے۔ اس کا دل نہ چاہے تب بھی اُسے انتقام لینا پڑتا ہے۔۔۔"

یہ ایک استاد کا بیان تھا۔ وہ کہتے تھے کہ لوگ بندوقیں اُٹھائے قاتل کی تلاش میں گھومتے ہیں۔ لیکن استاد کے طالب علموں نے بالکل ہی مختلف بات بتائی اور ایک بات میں بھی بتادوں کہ محلّے کا اصل حال محلّے کے بڑے نہیں جانتے، بچّے بتاتے ہیں۔ میں نے کالج کے نوجوانوں سے پوچھا کہ شہر میں منشیات کا کیا حال ہے۔ کس قسم کے لوگ ہیروئین کے عادی ہیں اور کون سے لوگ اس کا دھندا کرتے ہیں۔ لڑکے بولے۔۔۔"یہی لوگ جو قتل و تل کے چکّر میں ہیں، وہ خود اس قسم کا پیشہ کرتے ہیں۔ یہ انتقام لینے والے خاندان اب ایک دوسرے سے لین دین کرنے لگے ہیں۔ یہ ایک دوسرے کو پُڑیاں سپلائی کرتے ہیں جس کی وجہ سے لوگوں کے ہاتھ سے بندوق چھوٹ گئی ہے اور ہیروئین کی پُڑی ہاتھ میں آگئی ہے۔"

میں نے ایک اَور طالب علم سے تصدیق چاہی۔"کیا یہ بات صحیح ہے؟۔۔۔"

جواب ملا۔۔۔"جی سر۔ صحیح ہے۔ ایک مثال داؤد خیل کی ہے جہاں بہت سے لوگوں کی آپس میں دشمنی تھی لیکن اب وہ اِس دھندے کی وجہ سے ایک دوسرے کے گھر جانے لگے ہیں۔ اس

سے یہ ہوا ہے سر کر بندوق ختم ہوگئی ہے اور ہیروئین آگئی ہے سر!—"

میں نے نوجوانوں سے پوچھا—"اور وہ جو وی سی آر ہے جو ذہنوں میں شورے کا پانی بھر دیتی ہے اور جس کا نمک عقل کی دیواروں کو چاٹتا ہے، اُس وبا کا میانوالی میں کیا حال ہے؟"

لڑکے بولے—"وی سی آر یہاں پر بہت چلتا ہے۔ لڑکے جو ہیں وہ کالج جانے کی بجائے وی سی آر دیکھتے ہیں۔ اس سے ہوٹل والوں کو فائدہ ہوتا ہے۔ وہ پانچ روپے لیتے ہیں اور فلم دکھاتے ہیں۔"

ایک تو علاقہ پسماندہ، دوسرے تعلیم کا معیار کم، تیسرے وی سی آر کے راستے انجانی ثقافتیں اور ان دیکھی قدریں ایک پوری نسل کے تن بدن میں اترتی جاتی ہیں۔

سوچنے والے ضرور سوچتے ہوں گے کہ اس کا انجام کیا ہے؟ احساس محرومی کب تک ان زمینوں کا مقدر بنا رہے گا۔ کب تک ترقی اور تہذیب کے اصل دھارے سے کٹ کر رہنے والے یہ لوگ زندگی کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ کب تک کاندھے پر ٹیپ ریکارڈر لٹکائے اور ہاتھ میں مائیکروفون اُٹھائے لوگ پردیسوں سے آتے رہیں گے اور کب تک ان کے ایک ہی سوال کا ایک ہی جواب ملتا رہے گا؟

"آپ مجھے بتائیے کہ آپ جو اتنے بہت سے نوجوان یہاں تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کیا آپ کو روزگار مل جائے گا؟"

پورا مجمع ایک ساتھ بولا—"نہیں—"

یہ بھی میانوالی کا قصہ ہے۔

مجھے وہاں سے ایک نوعمر طالب علم خط لکھا کرتا تھا۔ لکھتا تھا کہ مجھے ہوائی جہازوں کا دیوانگی کی حد تک شوق ہے، میں ہوائی جہازوں کا انجینئر بننا چاہتا ہوں۔

اس کا یہ اشتیاق دیکھ کر میں نے اُسے لندن سے ہوائی جہازوں کے بارے میں ایک اچھی سی کتاب بھیج دی، اور پھر میں بھول بھال گیا البتہ میانوالی پہنچتے ہی مجھے اُس نوجوان کا خیال آیا۔ مگر مجھے تو اب اس کا نام تک یاد نہیں تھا، صرف اس کے محلّے زادے خیل کا نام یاد رہ گیا تھا۔

میں نے اپنے میزبانوں کو یہ ساری بات سنائی اور کہا کہ جی چاہتا ہے کہ جاکر اس سے ملوں اور اس کی ہمت بڑھاؤں۔ وہ لوگ بولے کہ محلّہ زادے خیل یقیناً موجود ہے مگر لڑکے کا نام یاد نہیں تو وہ کیسے ملے گا۔ میں نے کہا کہ مجھے اُس محلے میں لے چلیے، میں اِس مخلوق کو جانتا ہوں جس سے زیادہ محلّے کا حال کوئی اور نہیں جانتا۔

اب جو ہم چلے تو میزبانوں کا قافلہ ساتھ ہولیا۔ ہم سیدھی لکیر جیسے مین بازار میں چلتے گئے۔ کھوے سے کھوا چھلتا گیا۔ جدید جنرل اسٹوروں میں قمقموں کی روشنی سے لے کر سبزی کی تاریک دکانوں میں لالٹینوں کی روشنی تک نور کے سورنگ دیکھتے ہوئے ہم محلہ زادے خیل کی طرف مڑے کہ اچانک میرے سارے میزبان وہ گائیڈ بن گئے جو سیاحوں کو سیر کرایا کرتے ہیں۔

"یہ دیکھیے۔ عمران خان نیازی کا مکان — اور یہ دیکھیے۔ ناہید نیازی کا مکان — اور یہ مولانا کوثر نیازی کا مکان۔ اور یہ مولانا عبدالستار نیازی کا مکان ہے۔"

میں سوچنے لگا کہ سارے ہی نیازی بڑے باکمال ہوتے ہیں، ایک دو کے سوا۔

اتنے میں محلّہ زادے خیل آگیا۔ میرے قافلے والے ہر آتے جاتے بزرگ سے پوچھنے لگے "یہاں کوئی نوجوان رہتا ہے جسے ہوائی جہازوں کا بہت شوق ہے؟ — اس محلّے میں کوئی لڑکا رہتا ہے جو ہوائی جہازوں کے پیچھے دیوانہ ہے —" سارے بزرگ نفی میں گردنیں ہلاتے رہے۔

اُس وقت میری نگاہیں اُن لوگوں کو ڈھونڈ رہی تھیں جن سے کسی گلی کسی محلّے کا حال چُھپا نہیں رہتا۔ نوعمر لڑکے!

اچانک بارہ بارہ تیرہ تیرہ سال کے تین لڑکے نظر آئے جو ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے جھومتے چلے جا رہے تھے۔ میں لپک کر ان کے پاس گیا اور بولا کہ بیٹے! اس محلے میں کوئی لڑکا رہتا ہے جسے ہوائی جہازوں کا بے حد شوق ہے؟

میرا یہ پوچھنا تھا کہ بچوں نے میری انگلی پکڑی اور لے جاکر ایک مکان کے سامنے کھڑا کر دیا اور بولے — "یہاں رہتا ہے وہ —"

ہم سب نے بڑے اشتیاق سے دستک دی۔ امید تھی کہ ایک شاہین صفت، ہونہار، سعادت مند لڑکا برآمد ہوگا اور مجھے اپنے سامنے کھڑا دیکھ کر بے حد خوش ہوگا۔

وہ تو نہیں آیا۔ دروازے پر اس کی والدہ آئیں۔

میں نے اپنے آنے کا مدعا بتایا ۔۔۔ وہ بولیں، "شہزاد؟ وہ تو سرگودھا چلا گیا ہے۔ میں نے پوچھا: کیوں؟۔۔۔ کہنے لگیں، اُسے ائرفورس کے اسکول میں داخلہ مل گیا ہے۔ ایک دو برس میں وہ ہوائی جہازوں کا انجینئر ہو جائے گا۔

ہے ۔۔۔ واقعی باکمال لوگوں کا شہر ہے۔

دوستوں کی ایک محفل میں یہی بات چل رہی تھی کہ میانوالی میں کن لوگوں نے نام پایا ہے۔ پہلے کھلاڑیوں کا ذکر آیا ۔۔۔ کوئی بولا ۔۔۔ "دیکھیں، عمران خاں میانوالی کے ہیں۔ نیازی فیملی سے اس کا تعلق ہے اور پوری کرکٹ کی دنیا میں مشہور ہیں ۔۔۔ اس کے علاوہ ہاکی میں طارق نیازی، قیوم نیازی اولپک کھلاڑی رہے ہیں۔"

اس کے بعد شعر و ادب کا ذکر چل نکلا۔ میں نے پوچھا کہ ادب کے بڑے دھارے سے کٹ کر رہنے والی اس سرزمین میں کچھ لوگ ادب تخلیق کر رہے ہیں؟ ۔۔۔ جواب میں پوری تو نہیں مگر مفصل فہرست ملی۔ "منوّر صاحب ہیں جن کے بہت سے گیت عطاء اللہ عیسیٰ خیلوی نے گائے ہیں۔ اسی طرح رئیس عرشی صاحب ہیں، اردو میں اچھے لکھنے والے ہیں ۔۔۔ انجم جعفری ہیں۔ منصور آفاق ہیں۔ فاروق روکھڑی ہیں۔ نصیر شاہ ہیں۔"

مگر دنیا ان میں سے زیادہ تر ادیبوں اور شاعروں کو کیوں نہیں جانتی۔ ان کے نام کا چلن کیوں نہیں ہے برصغیر میں۔ دو چار کے سوا یہ سارے شاعر اور ادیب گمنام سے ہیں ۔۔۔ کیوں؟

اور میرے سوال کا جواب یوں ملا ۔۔۔ "اس کی وجہ یہ ہے کہ ہمیں ذرائع ابلاغ میسّر نہیں ہیں۔ ہمارے پاس بہت اچھے شاعر ہیں مگر یہ ہے کہ مواقع میسّر نہ آنے کی وجہ سے یہ لوگ ابھی دبے ہوئے ہیں۔"

میں نے پوچھا ۔۔۔ "یہاں مشاعرے ہوتے ہیں؟ ادبی نشستوں کی یہاں کوئی روایت ہے؟ ۔۔۔"

جواب ملا ۔۔۔ "جی ہاں۔ یہاں ہر ہفتے ادبی نشستیں ہوتی ہیں۔ یہاں مشاعرے بہت ہوتے ہیں۔ ہم اس لحاظ سے غریب نہیں ہیں۔"

اس کے بعد میانوالی کی موسیقی کا ذکر چلا۔

کیسی عجیب بات ہے کہ پاکستان میں اسکردو سے کالا باغ تک دریائے سندھ تنگ گھاٹیوں میں

سمٹا سمٹا جاتا ہے۔ اس کے کنارے کوئی گاتا نہیں، کوئی ساز نہیں بجاتا لیکن جوں ہی یہ دریا کالاباغ سے آگے بڑھ کر کشادہ میدانوں میں پھیلتا ہے، ہر طرف موسیقی کے رنگ بکھرنے لگتے ہیں۔ دریا کے شور کے ساتھ تانیں گونجنے لگتی ہیں اور لہروں کی انگلی تھامے سُر کبھی نیچے ہوتے ہیں کبھی اونچے۔

ایک طرف دریا۔ دوسری طرف تھل کا ریگستان۔ نہ بنگال کی طرح ہریالی میں گھٹنوں گھٹنوں ڈوبا ہوا علاقہ۔ نہ کاغان اور سوات کی طرح پھولوں میں ڈھنپا ہوا خطہ۔ دور دور تک پتھر، چٹانیں اور پہاڑ ـــ ساری زمین کا رنگ پتھروں جیسا۔ سارے علاقے کا مزاج چٹانوں جیسا۔ اس کے باوجود اس سرزمین سے نغمے پھوٹے، گیتوں کی فصلیں اگیں اور تانوں کے پھولوں کے خوشے پوری پوری شاخوں سمیت جھک آئے۔ اس علاقے میں موسیقی خوب خوب پروان چڑھی۔

میں جس روز میانوالی پہنچا، میرے احباب مجھے شہر میں لیے لیے پھرے۔ شاہراہ فضائیہ کے شہزاد ہوٹل میں ہم کھانے پہنچے تو انہوں نے دکھایا کہ دوسری میزوں پر کیسے کیسے نامور گلوکار بیٹھے ہیں۔ کچہری روڈ کے رضوان ریسٹورنٹ میں پہنچے تو معلوم ہوا کہ دائیں اور بائیں بڑے بڑے مشہور گانے والے بیٹھے ہیں۔

آخر اسی سڑک پر لندن میوزک سنٹر آگیا۔ میانوالی کی ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ چلنے والے اس بازار میں ایک بورڈ پر اپنے شہر کا نام دیکھ کر میں چونکا، میوزک کا لفظ پڑھ کر خوش ہوا اور سنٹر میں داخل ہو کر جھوم اٹھا۔ وہاں فرش سے چھت تک موسیقی کے ان گنت کیسٹ چُنے ہوئے تھے۔ ایک چھت کے نیچے اتنی ساری لوک موسیقی میں نے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ وہیں ایک طرف ایک بزرگ خاموش بیٹھے تھے۔ کسی نے کہا: اِن سے ملیے۔ سینکڑوں سرائیکی نغموں کے خالق استاد غلام حسن!

میں ان سے واقف تھا۔ وہ مجھے جانتے تھے۔ ذرا ہی دیر بعد گھل مل کر باتیں ہونے لگیں۔ میں نے غلام حسن صاحب سے پوچھا کہ آپ جو سرائیکی گانوں کی طرزیں لوک دھنوں اور راگوں کی بنیادوں پر بنا رہے ہیں کیا اس کے لیے آپ نے کوئی تربیت حاصل کی ہے؟

وہ بولے ـــ "تربیت میں نے صرف کلاسیکی موسیقی کی حاصل کی ہے، اس کے بعد اب

جس وقت ہم طرز بناتے ہیں تو کسی راگ کو مدنظر رکھ کر نہیں بناتے۔ جب طرز بن جاتی ہے تو پھر ہم دیکھتے ہیں کہ یہ کونسا راگ ہے۔ پھر گلوکاروں کو بتاتے ہیں کہ یہ راگ ہے، اس میں گیت کمپوز ہو گیا ہے اور اس میں دوہڑے اور ماہیئے آپ کو کہنے ہیں۔"

میں نے پوچھا کہ آپ کی جو لوک طرزیں ہیں کیا یہ بہت پُرانی ہیں یا نئی ہیں؟

"یہ پرانی بھی ہیں بلکہ سچ پوچھئے تو ساری پرانی طرزیں ہیں جو اس علاقے میں چلتی ہیں۔ اس کے علاوہ نئی طرز بھی کوئی نہ کوئی بن جاتی ہے انسان سے ۔۔۔"

میں نے پوچھا ۔۔۔ "یہ پرانی طرزیں آپ نے کہاں سیکھیں۔ کیا ساری طرزیں آپ کو یاد ہیں یا کہیں جا کر یہ طرزیں ڈھونڈتے ہیں؟ ۔۔۔"

جواب ملا ۔۔۔ "جناب ہم یہ گانے اپنے بزرگوں اور باپ دادا سے سنتے تھے۔ تو اُن کی طرزیں سن کر اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہ پرانی طرزیں ہیں ان سے ہم نے یہ سب کچھ سیکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں ایک ہیمڑی ٹپّہ ہوتا ہے، اُس کی ایک ہی طرز ہوتی ہے، کوئی نئی طرز نہیں بنانی پڑتی۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں دو ہی راگ مقبول ہیں؛ جوگ اور بھیروی۔ لوگ زیادہ تر یہی راگ پسند کرتے ہیں ۔۔۔"

میں نے پوچھا ۔۔۔ "گھروں میں جو عورتیں گاتی ہیں، خصوصاً شادی بیاہ میں؛ ان گانوں سے آپ استفادہ کرتے ہیں؟ ۔۔۔"

"ہمارے علاقے میں عورتیں جو گانا گاتی ہیں اس کو ہم ہیمڑی کہتے ہیں۔ وہ ٹپّے گاتی ہیں۔ اُن کی بس ایک ہی دھن ہوتی ہے۔"

میں نے پوچھا "آپ کے علاقے کے گانوں کے ساتھ ساز کون سے ہوتے ہیں؟ ۔۔۔"

"ہمارے علاقے کے سرائیکی گانوں کے ساتھ ڈھولک طبلہ اور ہارمونیم اور گھنگھرو ہوتے ہیں ۔۔۔"

میرا اگلا سوال تھا ۔۔۔ "اس علاقے کے کچھ گانے والوں کے نام بتایئے جو آج کل بہت اچھا گا رہے ہیں؟"

"میانوالی کے اچھے دوہڑہ ماہیا گانے والوں میں شفیع اختر، تہ خیلوی ہو گئے، ایوب نیازی ہو گئے،

اس کے بعد یونس ہو گئے۔ لیاقت علی خاں ہو گئے، شفاء اللہ خاں اور عطاء اللہ خاں نیازی سے تو ایک دنیا واقف ہے۔ وہ بھی ہمارے میانوالی کے ہیں۔"

میں نے پوچھا ــــ "کچھ نئے گانے والے بھی آرہے ہیں۔ کچھ لوگوں کی تربیت ہو رہی ہے یا نہیں؟"

"جی ہاں۔ نئے گانے والے بھی آرہے ہیں۔ کافی لوگوں کو شوق ہے۔ مثلاً غلام شبیر ہیں، اس کے علاوہ مظہر علی ملک ہیں اور کافی گلوکار ہیں مثلاً گلستان خان ــــ"

اب میں نے بات آگے بڑھائی ــــ "یہ بتایئے غلام حسن صاحب کہ آج کی موسیقی میں مغربی اثرات تیزی سے آرہے ہیں۔ کہیں ڈسکو کا انداز ہے، کہیں پاپ میوزک ہے۔ جدید الیکٹرانک ساز بجائے جا رہے ہیں۔ آپ کی سرائیکی موسیقی میں بھی ایسے اثرات آرہے ہیں یا نہیں؟"

"نہیں جناب، ہماری موسیقی میں ایسے اثرات داخل نہیں ہوئے۔ اس علاقے کے لوگ ڈسکو کو پسند نہیں کرتے۔ وہ تو بس ثقافتی موسیقی پسند کرتے ہیں۔ لیکن ہم نے جو گانا سیکھا ہے خان صاحب توکل علی خاں صاحب سے اس میں انہوں نے مغربی موسیقی بھی سکھائی ہے اور ہم مغربی موسیقی کے سُر پلٹے بھی کرتے ہیں۔ ان کا انداز علیحدہ ہوتا ہے ــــ"

بات اُور آگے بڑھی۔ میں نے کہا۔ "لوک موسیقی کا ذکر ہوتا ہے تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کبھی بارش ہوئی تو لوگ گانے لگے۔ کبھی رات کا سناٹا ہے تو کوئی گانے لگا۔ میانوالی میں ایسا کچھ ہوتا ہے؟"

"جی ہاں۔ اس طرح ہوتا ہے۔ کبھی ہجر کے گیت گائے جاتے ہیں، کبھی خوشی کے گیت گائے جاتے ہیں۔ پھر شادی بیاہ کے گیت ہوتے ہیں۔ کوئی درد کے گانے گاتا ہے۔ ماہیے بھی گاتے ہیں۔ دوہڑے بھی گاتے ہیں۔ اس طرح اکثر ہوتا ہے ــــ"

میں نے کہا ــــ "یہ بتایئے کہ اس طرح کے موسموں، خوشیوں اور غموں کے گانے اور درد اور ہجر کے گانے عورتیں بھی گاتی ہیں؟ ــــ"

"جی ہاں۔ گاتی ہیں۔ سب گانے گاتی ہیں۔"

"معیوب یا برا تو نہیں سمجھا جاتا؟ ــــ"

"نہیں جی ــــ بُرا نہیں سمجھا جاتا۔"

گفتگو ختم ہوئی۔ مصافحے ہوئے، معانقے ہوئے اور ہم باہر نکلے۔ بہت سے تانگے ریلوے اسٹیشن کی طرف چلے جا رہے تھے جن میں برقعہ پوش عورتیں بیٹھی تھیں۔ برقعہ کیا تھا، سر سے پیر تک کپڑے کے تھان لٹکے تھے۔ سر پر ٹوپی جیسی کوئی شے منڈھی تھی جس کے اوپر کلس جیسی چونچ نکلی تھی۔ کیا مجال جو بدن کا ذرا سا حصہ بھی نظر آ جائے اور کہیں چہرے کی کوئی جھلک دیکھنے کو مل جائے۔

گھوڑوں کی ٹاپیں اور ان کی ٹانگوں میں پڑے گھنگھروں کا شور مدھم ہوتا گیا۔

لندن میوزک سنٹر والوں نے دوبارہ گانے کا کوئی کیسیٹ چلا دیا۔ ہجر کے گانوں میں سوز بھرا تھا۔ اس مرتبہ سوز کا سبب سمجھ میں آنے لگا—

ایک پیڑ، ایک پُل

ہم میانوالی سے چلے تو دسمبر کا سورج کافی اونچا ہو چکا تھا اور عجب بات ہے کہ سڑک کی دونوں جانب کھڑی فصلیں بھی بہت اونچی تھیں۔ ارہر جیسی!

تنگ مگر اچھی سڑکوں پر کار دوڑتی گئی کہ اچانک پھر وہی انگریزوں کی جانی پہچانی نشانی نظر آئی: ریلوے اسٹیشن!

وہ لوہے کے جنگلے۔ اونچے ستونوں پر پانی کی بڑی بڑی ٹنکیاں۔ شیڈ۔ مسافر خانے۔ ٹکٹ گھر۔ برآمدے۔ جالی دار دروازے۔ اونچے اونچے روشن دان۔ اور اسٹیشن کی عمارت کی پیشانی پر انگریزی اور اردو میں لکھا ہوا اسٹیشن کا نام، کندیاں جنکشن!

اس علاقے کے ان تمام چھوٹے شہروں کی بڑی سڑک ان کے بیچ سے گزرتی ہے۔ وہی شہر کی مین روڈ کہلاتی ہے اور وہی شہر کا بڑا بازار ہوتا ہے۔ ہم کندیاں کے بازار میں داخل ہوئے۔ دونوں طرف اینٹوں کی قدیم عمارتیں اور محراب دار دکانیں۔ ان کے آگے نالیاں اور ان کے آگے تنگ سڑک کو اور تنگ کیے ہوئے سودے والے، پھیری والے، خونچے اور ریڑھی والے۔

وہیں میری ملاقات محمد افضل کندی صاحب سے ہوئی۔ ان کی پرانے زمانے کی دکان میں نئے زمانے کی کیمیادی کھاد کی بوریاں چُنی ہوئی تھیں۔ تنگ سی جگہ میں لکڑی کی چوکی لگی تھی۔ اس پر لکھنے پڑھنے کا قدیم ڈیسک رکھا تھا اور نئے زمانے کی دوسری نشانی بھی تھی: ٹیلی فون!

محمد افضل صاحب اپنے شہر کندیاں کے بارے میں بتا رہے تھے کہ بہت پرانا ہے۔ یہ بازار بھی ساٹھ ستر سال پرانا ہے البتہ اس میں جو نئے لوگ آ رہے ہیں وہ نئی دکانیں، نئی عمارتیں بنا رہے ہیں۔ میں نے حیرت سے پوچھا کہ اس دور دراز قصبے میں آنے والے نئے لوگ کون ہیں؟

جواب ملا" وہ جو ہمارے میانوالی ضلع کے لوگ ہیں جو وہاں دشمنی کی وجہ سے نہیں رہ سکتے، وہ سکونت ترک کر کے کندیاں آجاتے ہیں۔ یہ امن کا شہر ہے اس لیے لوگ یہیں آ کر آباد ہو جاتے ہیں"

کندیاں شہر کی زیادہ تر آبادی ریلوے کی ملازم ہے۔ باقی لوگ کھیتی باڑی یا دکان کرتے ہیں۔ شہر میں صنعت کوئی نہیں اور دستکاری بھی نہیں۔ میں نے محمد افضل صاحب سے پوچھا کہ کندیاں شہر کے کچھ مسئلے ہیں؟

وہ بولے ۔" اس شہر کے بہت زیادہ مسئلے ہیں۔ یہاں پر کوئی ترقی نہیں ہو رہی ہے۔ جب یہاں انتخابات ہوتے ہیں اور کچھ لوگ برسر اقتدار آتے ہیں تو ان کے مخالفین ان کو کام نہیں کرنے دیتے۔ وہ سوچتے ہیں کہ اگر اس چیئرمین نے یہ کام کر دیا تو یہ لوگوں کو بتائے گا کہ یہ میں نے سڑکیں بنائی ہیں۔ یہ تعمیرات کرائی ہیں، اس کے نتیجے میں وہ آئندہ الیکشن میں کامیاب ہو جائے گا لہٰذا اس کے مخالفین کوشش کرتے ہیں کہ چیئرمین کوئی کام نہ کرنے پائے۔"

انتخابات کی بات چلی تو محمد افضل صاحب نے مجھے بتایا کہ اس پورے علاقے میں سارے انتخابات ذات برادری کی بنیاد پر لڑے جاتے ہیں۔ جسے برادری کی حمایت حاصل ہو اُسے کوئی نہیں ہرا سکتا۔

اس پر یاد آیا کہ اسی علاقہ کے عام انتخابات میں ایک بڑی برادری نے اپنا اُمیدوار کھڑا کیا اور پولنگ کے دن جا کر سارے ووٹ اسی کو دے دیئے چنانچہ اس کی انتخابی مہم پر کچھ خرچ نہیں ہوا۔ کہیں ایک پیسہ بھی نہیں اُٹھا۔ نہ شامیانے لاؤڈ اسپیکر لگے، نہ ٹرانسپورٹ دوڑی، نہ درکروں کو کچھ کھلایا گیا۔ نہ با اختیار لوگوں کو کچھ پلایا گیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جب الیکشن کمیشن کے سامنے خرچ کے گوشوارے پیش کرنے کا وقت آیا تو کہنے والے کہتے ہیں کہ شامیانوں، لاؤڈ اسپیکروں، ٹرانسپورٹ اور کھانے پینے کے اخراجات کی فرضی رسیدیں داخل کرنی پڑیں

ہاں تو کندیاں کا ذکر ہو رہا تھا۔ یہ شہر دریائے سندھ کے بہت قریب ہے۔ میں نے محمد افضل صاحب سے پوچھا کہ اس چھوٹے سے شہر کو دنیا کے اتنے بڑے دریا سے کوئی فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں؟

انہوں نے کہا " یہاں پر دریائے سندھ سے کوئی فائدہ نہیں پہنچتا ہے سوائے مچھلی کے۔

یہاں پر صرف مچھلی ہے وہ پکڑ لیتے ہیں۔"

میں نے کہا کہ یہاں کوئی بند یا بیراج تو ہوگا۔ وہ بولے "ہے۔ ضرور ہے مگر اس سے شہر کو کوئی فائدہ نہیں بلکہ نقصان ہے۔"

باتیں ختم ہوئیں۔ ہم آگے بڑھے اور جوں ہی کنڈیاں سے باہر نکلے دریائے سندھ نظر آنے لگا۔ چمکتی دھوپ میں اس کی ریت جگمگانے لگی۔ کہیں نیلا پانی بہہ رہا تھا، کہیں گرم ریت دہک رہی تھی چنانچہ ہوا کے گرم اور ٹھنڈے جھونکے بھی آپس میں الجھ رہے تھے۔ البتہ اونچے درختوں کے سایوں کی راحت بٹورتے ہوئے ہم ایک بہت بڑی آبادی، بہت بڑے شہر کے قریب جا پہنچے۔ ہر طرف کوٹھیاں، بنگلے، باغ، ریسٹ ہاؤس، اونچی نیچی چھوٹی بڑی عمارتیں، فلیٹ اور گھروندے، نہریں اور چشمے، مگر سناٹا۔ ہو کا عالم آدم نہ آدم زاد۔ جیسے ہالی ووڈ کی کسی بڑی فلم کا سیٹ لگا ہو مگر اداکار موجود نہ ہوں۔

جس شہر کو دیکھ کر میری آنکھیں دنگ رہ گئیں وہ چشمہ تھا۔ یہی وہ جگہ ہے جہاں فرانس کی مدد سے ایٹمی پلانٹ لگنا تھا۔ جہاں ایسا جوہری بجلی گھر لگنا تھا جو پنجاب کے چپے چپے کو منور کر دیتا مگر عالمی سیاست نے ایک ہاتھ سے اُس منصوبے کے گلے میں پھندا ڈالا اور دوسرے سے پاؤں تلے کا تختہ کھینچ لیا۔

جوہری پلانٹ کا منصوبہ منسوخ ہو گیا اور اس کے لیے جو شہر بنایا گیا تھا وہ بسایا نہ جا سکا۔

ہماری کار مڑی۔ اب خاموش شہر ہماری پشت پر اور شور مچاتا چشمہ بیراج ہمارے سامنے تھا۔

کار بیراج کے اوپر چلی تو دور دور تک پھیلا ہوا دریا نظر آیا۔ دریا کی سوکھی تہہ میں لگے خیمے نظر آئے اور تپتی دھوپ میں دریا کی خاک چھانتے لوگ نظر آئے جو اس کے چمکیلے ذرّوں سے سونا نکالتے ہیں۔

دریا پار اتر کر ہماری کار کنارے کنارے دوڑنے لگی۔ کوہِ سلیمان کے سلسلے کے اونچے نیچے پہاڑ ہمارے ساتھ دوڑتے ہوئے لگے کہ اچانک منظر بدلا۔ دو رویہ کھجور کے درخت نظر آنے لگے، بہت پرانے گھنے کھجور کے درخت۔ اونچے پشتوں کے پیچھے دوڑتی ہوئی نہریں۔ پشتوں کے اوپر چلتے ہوئے چرواہے اور ان کی ڈھلانوں پر چرتے ہوئے ان کے مویشی۔ کہیں کہیں مٹی ڈھونے اور زمینیں کھودنے والی دیو ہیکل مشینوں کے لاشے جنہیں اب زنگ کھائے جا رہا تھا۔ دور دور تک سنگلاخ میدانوں میں پتھر بکھرے ہوئے تھے اور یوں لگتا تھا جیسے یہ بڑے بڑے شہروں کے کھنڈر ہیں۔

اتنے میں ایک بستی آ گئی۔ دکانیں، چائے خانے اور بس اسٹاپ آ گئے۔ ہم نے بورڈوں پر بستی کا نام

پڑھا۔ بلوٹ!

اور پھر ایک کچّی سی سڑک پر بہت سی برقعہ پوش عورتوں کو جاتے دیکھا۔ وہیں ایک بورڈ لگا تھا جس پر لکھا تھا؛ خاندانی منصوبہ بندی کا مرکز ــــــ میں حیران تھا کہ اس علاقے کی عورتیں اتنی بڑی تعداد میں خاندانی منصوبہ بندی پر ایمان کیسے لے آئیں۔ تب کسی نے بتایا کہ اُدھر بلوٹ شریف کے بزرگوں کا آستانہ اور خانقاہ ہے۔ اُدھر تعویذ دیئے جاتے ہیں۔ اُدھر جن اتارے جاتے ہیں۔

ہم نے بھی اپنی کار ادھر موڑ دی۔ راہ کے نالے پر بنا ہوا پرانا پُل آدھا ٹوٹ چکا تھا اور کاریں نیچے اتر کر نالہ پار کر رہی تھیں۔ پار اترتے ہی قدیم زمانے کی عمارتیں نظر آنے لگیں۔ مسجدیں۔ محرابیں۔ زیارت گاہیں، امام باڑے ــــ مجھے تو یہی کچھ نظر آیا۔

کچھ دیر بعد ہم بلوٹ شریف کے پیر صاحب کی قیام گاہ پر جا پہنچے۔ وہاں پہلے سے کئی کاریں کھڑی تھیں۔ ہمیں ایک انتظار میں بٹھایا گیا۔ نئے زمانے کی جدید عمارت تھی۔ نئی طرز کا فرنیچر آراستہ تھا۔ عمارت اندر ٹھنڈی تھی۔ باہر برآمدوں میں لکڑی کی جالیاں لگی تھیں۔ اور وہیں دور دور سے آئے ہوئے بہت سے مرد اور ان سے بھی زیادہ عورتیں بیٹھی تھیں۔ ان کی آوازیں آرہی تھیں۔ وہ پیر صاحب کو اپنے دکھ درد بتا رہے تھے اور پیر صاحب ان کو ضروری ہدایتیں دے رہے تھے۔ ہمارے آنے کی انہیں خبر کردی گئی۔ کوئی ایک گھنٹے بعد ذرا فرصت ہوئی تو وہ اٹھ کر ہمارے پاس آئے۔

پتلون قمیص میں ملبوس، خوش شکل، خوش اخلاق۔ آتے ہی ہم سے تاخیر کی معذرت چاہی، انگریزی زبان میں ــــ اور پھر ہمارے آنے کا سبب پوچھا۔ فوراً ہی گفتگو کا سلسلہ چل نکلا۔ وہ بلوٹ شریف کے مخدوم زادہ حاجی جعفر شاہ تھے۔ پنجاب یونیورسٹی سے تاریخ کی اعلیٰ تعلیم پا چکے تھے چنانچہ دیر تک اس علاقے کی تاریخ بتاتے رہے۔

بلوٹ کا پرانا نام بِل کوٹ تھا۔ وہاں حضرت عیسٰی سے سوا دو سو سال پہلے کا قلعہ اور بودھوں اور ہندوؤں کے آثار موجود تھے۔ دریائے سندھ کبھی اس بستی سے لگا لگا بہتا تھا، اب بہت دور چلا گیا ہے۔ انہوں نے بتایا کہ ملتان، اور اوچ شریف اور بلوٹ شریف کے یہ وہ علاقے ہیں جہاں ظہورِ اسلام کے فوراً بعد عربوں کا آنا جانا شروع ہوگیا تھا جن کی نشانیاں آج تک موجود ہیں۔ حاجی جعفر شاہ بتا رہے تھے:

"اگر آپ بلوٹ کو دیکھیں اور خود مشاہدہ کریں تو آپ کو یہاں محسوس ہوگا اور ہمارے آباؤ اجداد نے اپنی تصانیف میں بھی لکھا ہے کہ ایک جگہ ہے جہاں پر ثابت ہوتا ہے کہ یہاں رسول پاکؐ کی اونٹنی کے پاؤں کا نشان ہے اور اس کے بالکل نزدیک علی مرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کے گھوڑے کے سُم کا نشان ہے۔ پھر ایک پتھر پر حضرت علیؓ کے ہاتھ کا نشان ہے اور اس کے بالکل قریب جناب رسالت مآبؐ کی دو انگلیوں کا نشان ہے۔ اور اسی قلعے کے شمال کی طرف تھوڑے سے فاصلے پر جناب علیؓ کے پاؤں کے نشان ہیں جو کہ پتھر میں دھنسے ہوئے ہیں اور پھر اس کے علاوہ جناب رسالتمآبؐ کے اصحاب کی مزاریں ہیں جن میں جناب پیر عبدالرحمٰن صاحب بہت مشہور ہیں۔ اس علاقے میں اصحابِ رسولؐ کی کم و بیش دس پندرہ مزاریں ہیں جو کہ ہمارے آباؤ اجداد نے بتایا ہے کہ یہ اصحاب سے منسوب ہیں اور واقعی اگر دیکھا جائے تو ان کے قد و قامت اور قبر کی طوالت سے ویسے ہی محسوس ہوتا ہے کہ عربی نژاد کے لوگ ہیں۔"

کہنے لگے کہ خود ان کے خاندان کا تعلق سادات نقویہ سے ہے۔ ان کے بزرگ پہلے اوچھ شریف اور وہاں سے بلوٹ شریف آئے اور اس علاقے کے باشندوں کو نہ صرف داخل اسلام کیا بلکہ اُن کے نئے پرانے جھگڑے چکانے کی رسم بھی ڈالی۔ یہ سلسلہ آج تک جاری ہے۔ ہر سال چیت کے مہینے میں یہاں میلہ ہوتا ہے، دُعائیں ہوتی ہیں، تعویذ دیئے جاتے ہیں، جن اتارے جاتے ہیں اور جیسا کہ جعفر شاہ صاحب نے کہا:

"یہ ٹھیک ہے کہ دنیا سائنٹفک ہو چکی ہے تو اس میں بھی کچھ مشاغل آگئے ہیں لیکن آج بھی ہم نے اپنے بزرگوں کا منشور نہیں چھوڑا کہ جب بھی لوگ آتے ہیں تو اگر ہمارے مریدوں کے درمیان کوئی تنازعہ ہو تو ہم ان کی افہام و تفہیم کرتے ہیں۔ ان میں آپس میں صلح کراتے ہیں بلکہ ان کے قتل جیسے کیس بھی ختم کرا کے ان کو رشتوں ناطوں میں جوڑ دیتے ہیں تاکہ آئندہ یہ فساد نہ ہو۔ اسی طرح زمین کے جھگڑے یا دوسرے مسائل ہوتے ہیں وہ ہم حل کرتے ہیں ــــ"

اب ذرا بے تکلفی سے باتیں ہونے لگیں۔ میں نے جعفر شاہ صاحب سے کہا کہ آپ نے تو نئے زمانے کی تعلیم پائی ہے، آپ کو جن بھوتوں پر یقین کیسے آگیا؟

کہنے لگے ــــ "مجھے یاد ہے میں اس وقت بی اے کا طالب علم تھا اور گورنمنٹ کالج لاہور

میں پڑھتا تھا۔ تو میں جب چھٹیوں میں یہاں آیا تو وہ چیت کا میلہ آیا ہوا تھا۔ میں وہاں گیا جہاں جنات کھیل رہے تھے۔ تو تصور کیجیے کہ ضلع میانوالی کے ایک بے حد پسماندہ علاقے کی دیہاتی عورت کھیل رہی تھی اور ایڈیشنل سیشن جج صاحب میرے ساتھ تھے۔ ہمیں دیکھ کر وہ اَن پڑھ عورت انگریزی بولنے لگی۔ اور اس نے کہا کہ یہ سیشن جج صاحب بھی نہیں مانتے اور تم مخادیم خاندان سے تعلق رکھتے ہو اور تم بھی منحرف بن رہے ہو۔ پھر اُس نے ہمیں دو تین ایسی نشانیاں دیں کہ ہمارا ذہن تسلیم کر گیا کہ واقعی یہ ٹھیک کہتی ہے۔۔۔"

اس کے بعد انہوں نے کچھ اَور دلچسپ باتیں بتائیں۔ مثلاً بلوٹ شریف میں ان کے بزرگوں نے قرآن کی تفسیریں لکھی ہیں جن کے قلمی نسخے آج تک محفوظ ہیں جن میں تفسیر کے عجیب و غریب پہلو سامنے آتے ہیں۔ میں نے پوچھا "اَور کیا چیزیں محفوظ ہیں یہاں؟۔۔۔"

"ہمارے پاس پرانے بادشاہوں مثلاً امیر تیمور، اکبر بادشاہ، ابراہیم لودھی۔ شاہ جہاں اورنگ زیب اور نادر شاہ دُرّانی وغیرہ کی اسناد موجود ہیں۔ انہوں نے ہمیں سندیں دی ہیں، انہوں نے ہمیں لباس فاخرہ دیئے ہیں۔ تلواریں اور خنجر دیئے ہیں اور انہوں نے سند دی ہے کہ یہ جاگیر وقف ہے لنگر کے لیے اور اس خاندان کے لیے۔ اس کے علاوہ ہمارا مخدوم جو ہے وہ شمالی پاکستان کے تمام پرانے خاندانوں کے نسب کی تصدیق کرتا ہے کہ یہ سیّد ہے یا غیر سیّد ہے۔ ہمارے پاس بہت پرانے شجرۂ نسب موجود ہیں جو لوگ ہم سے لے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ لوگ اپنے شجرے لے آتے ہیں۔ ان میں اندراج بھی کراتے ہیں لیکن اس کے لیے ہم پہلے بہت تحقیق کرتے ہیں۔ بہت ہی عمیق اور دقیق طور پر اس کی انوسٹی گیشن کرنے کے بعد اس پر ہم اپنی مُہر لگاتے ہیں کہ یہ سیّد ہے۔ اسی وجہ سے ان کا لقب ہے مخدوم السادات۔ یعنی سب سادات کا یہ مخدوم ہے۔۔۔"

بلوٹ شریف میں چیت کے مہینے میں لوگوں کے سروں سے جن اتارے جانے کی شہرت تو کافی ہے لیکن ایک اور شہرت ماہ محرم کی نویں شب کی ہے جب کہتے ہیں کہ مٹی میں دبے ہوئے کوئلوں سے آپ ہی آپ شرارے پھوٹتے ہیں۔

وہ بتا رہے تھے ۔۔۔" اس کا قصہ یہ ہے کہ یہ ایک چھوٹی سی جگہ ہے جہاں پرانی راکھ پڑی ہوتی ہے۔ سال بھر اس پر بارش بھی ہوتی ہے، ہوا بھی چلتی ہے۔ سب کچھ ہوتا ہے اس کے باوجود جب آپ

محرم کی نویں کی رات اس کو کھولیں گے تو آپ دیکھیں گے کہ پرانے کوئلے خشک بھی نہیں ہوتے۔ برسات کے سیلے ہوئے ہوتے ہیں لیکن آپ دیکھیں گے کہ ان میں سے ایک کوئلہ ٹوٹے گا اور اس میں سے چراغ کی لو کی طرح شرارہ پھوٹے گا اور اس کے بعد آپ اس آگ کو بڑھا دیں گے۔ چنانچہ ہم آگ بڑھا دیتے ہیں پھر اس پر روٹی وغیرہ پکاتے ہیں اور پھر تبرکات لنگر پکتے ہیں جو مرید اور معتقدین آ کر کھاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ محرم کی نویں کی رات کو ہوتا ہے —"

شام ہونے لگی تھی۔ ہمیں ڈیرہ اسمٰعیل خان پہنچنا تھا۔ ہم لوٹے تو بلوٹ شریف سے بہت سارے تھکے ماندے لوگ لوٹ رہے تھے شاید اس یقین کے ساتھ کہ بس اب کوئی نیا شرارہ پھوٹے گا اور ان کے دکھ درد ختم کر دے گا۔

اب کے جو ہم لوٹے تو وہ پہلے والے منظر بدلے بدلے سے محسوس ہوئے۔ ایسا لگا کہ دریا وہاں سے اَور دور جا چکا تھا اور کھجوروں کے درخت اَور پرانے ہو چکے تھے۔

اب تک آپ مجھ سے دریا کی کہانی سنتے رہے ہیں۔ آج میں آپ کو ایک پُل کی داستان سُنا رہا ہوں۔

ڈیرہ اسماعیل خان کہنے کو صوبہ سرحد کا شہر ہے۔ مگر پنجاب سے بالکل لگا ہوا ہے۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان اور سرزمین پنجاب کے درمیان ایک دریا حائل ہے لیکن یہ کوئی چھوٹی موٹی ندی نہیں بلکہ وہ شیر دریا ہے کہ تبّت اور لدّاخ والے آ کر دیکھیں تو انہیں یقین آ جائے کہ یہ حقیقتاً شیر دریا ہے اور یہ کہ انہوں نے دریا کا یہ نام یوں ہی نہیں رکھ دیا۔

وہاں اوپر لداخ میں جس دریائے سندھ کو میں اپنے پتلون کے پائنچے چڑھا کر پار کر گیا تھا یہاں نیچے ڈیرہ اسماعیل خان میں اُسی دریائے سندھ کا پاٹ ۱۴ میل کا ہے۔ لداخ میں تو میرے گھٹنے بھی نہیں بھیگے تھے۔ یہاں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں یہ دریا ایسا جان لیوا ہے کہ جب ہر دسویں بارہویں دن ایک نہ ایک نوجوان کا ڈوب جانا معمول ہو گیا تو ڈیرے والوں نے ڈر کے مارے اپنی تیراکی کی بہت پرانی روایت ترک کر دی۔

دیکھنے میں اس جگہ دریائے سندھ پھیل کر چپ سا ہو گیا ہے مگر یہ صرف نظر کا دھوکا ہے۔ اس دریا نے اس شہر کو بار بار اجاڑا ہے۔ رات کو آیا اور ڈیرہ اسماعیل خان کو بنیادوں سے بہا کر لے گیا۔ ہر مرتبہ شہر والوں کو ذرا ہٹ کر اپنا نیا شہر بسانا پڑا۔ پرانا ڈیرہ اسماعیل خان اپنی موجودہ جگہ سے چھ کیلو میٹر دور تھا لیکن ۱۸۲۳ء میں دریائے سندھ نے اجاڑ دیا چنانچہ لوگ بلوچ سردار محمد اسماعیل خان کے بسائے ہوئے اس شہر کو اٹھا کر اس کی موجودہ جگہ لے آئے۔

اوپر کی سمت چشمہ بیراج بن جانے سے دریا کی سرکشی کچھ کم تو ہوئی مگر اس کا پھیلا ہوا دامن سمٹ نہ سکا۔ پنجاب کا ساحل اب بھی ۱۴ میل دور تھا اور اُس ساحل پر جدید ریل گاڑیاں بھی دوڑ رہی تھیں۔ منڈیاں بھی وہیں تھیں، اسپتال بھی وہیں تھے، کالج اور مدرسے بھی اسی کنارے پر تھے۔ ڈیرہ اسماعیل خان والے خوشی خوشی نہیں جاتے تھے بلکہ ان کی ضروریات انہیں کھینچ کھینچ کر پنجاب لے جاتی تھیں اور دریا پار اُترنے کے لیے انگریزوں کے زمانے کا ایک چھوٹا جہاز ہی دستیاب تھا جسے چاہیں تو فیری کہہ لیں۔

ہم اُس روز اس فیری کے عرشے پر کھڑے تھے۔ دور دور تک دریا تھا، بیچ میں بڑے بڑے ٹاپو تھے، سرسبز، زرخیز اور چھوٹے بڑے درختوں سے ڈھکے۔ عرشے پر میرے ساتھ بہت سے احباب تھے۔ اُن سب کو اس فیری کے سفر اور اس سے بھی بڑھ کر اس سفر کی صعوبتیں یاد تھیں۔

ہمارے ایک میزبان ہمیں بتا رہے تھے: "اس فیری کا نام ایس ایس جہلم ہے اور یہ پاکستان بننے سے پہلے سے یہاں پر موجود ہے اور ڈیرہ اسماعیل خان اور دریا خان کے درمیان آنے جانے والوں کو پار اتارتا رہا ہے۔ ویسے تو دریائے سندھ ۱۴ میل چوڑا ہے لیکن درمیان میں خشکی کی دو پٹیاں ہیں۔ جب تک یہاں پُل نہیں بنا تھا، ڈیرہ اسماعیل خان سے دریا خان جانے میں ہمیں پورا دن لگ جاتا تھا۔ پہلے یہاں سارے مسافر اور مویشی اس جہاز پر سوار ہوتے تھے اور کافی دیر بعد یہ دوسرے کنارے پر پہنچتا تھا۔ وہاں ہم بسیں لیتے تھے اور دریا کے دوسرے پاٹ پر پہنچتے تھے۔ وہاں پر ہم کشتیاں لیتے تھے اور آگے جاتے تھے۔ اس طرح پورا دن لگ جاتا تھا جس کے لیے ہمیں پانی کے تین دھارے پار کرنے ہوتے تھے۔ جہاں پانی زیادہ تھا وہاں لانچیں چلتی تھیں اور جہاں پانی کم تھا وہاں کشتیاں چلا کرتی تھیں اور اب بھی چلتی ہیں۔"

عین اُسی وقت ہم نے دیکھا کہ کشتیوں پر لاد کر دودھ کے برتن لائے جا رہے ہیں۔ میں نے اپنے میزبانوں سے پوچھا کہ شہر کے لیے یہ دودھ کہاں سے لایا جا رہا ہے۔

جواب ملا ــــ "ڈیرہ اسماعیل خان اور دریا خان کے درمیان خشکی کی پٹیوں پر کچھ دیہات ہیں جنہیں ادوانا بھی کہتے ہیں اور کچی آبادی بھی کہتے ہیں، یہ جو سامنے جزیرے سے نظر آ رہے ہیں، ان پر یہ لوگ رہتے ہیں اور جان ہتھیلی پر رکھ کر رہتے ہیں کیونکہ خدانخواستہ اچانک سیلاب آجائے تو یہ لوگ بہہ بھی جاتے ہیں۔ جزیروں پر ان کی آبادی کا سبب یہ ہے کہ وہاں مویشی کا چارا آسانی سے مل جاتا ہے اور کاشتکاری بھی ہو جاتی ہے اس لیے یہ لوگ وہاں رہتے ہیں اور وہیں سے دودھ لاتے ہیں۔ اکثر دودھ کے برتن کشتیوں کے ذریعے آتے ہیں لیکن کبھی کبھی یہ لوگ مشک جیسی کھال میں ہوا بھر کر اس کو تیراتے ہوئے اس کے ذریعے دودھ لاتے ہیں۔ دودھ فولاد کے برتنوں میں بند ہوتا ہے اور دریا کا پانی بہت ٹھنڈا ہوتا ہے اس لیے کنارے پر آتے آتے دودھ کے اُوپر مکھن تیرنے لگتا ہے۔"

یہ بات کہتے کہتے ہمارے میزبان کو ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ہنس کر کہنے لگے ــــ "آپ جانتے ہیں اس زمانے میں ایمانداری تو بہت زیادہ ہے۔ ایک مرتبہ ہم دریا کے کنارے کھڑے دودھ کا انتظار کر رہے تھے۔ دودھ آیا اور ہم سب دودھ کے برتن کھولنے کے لیے لپکے تا کہ پہلے مکھن ہم لے لیں۔ مگر ہم نے دودھ کا برتن کھولا تو اوپر سطح پر مکھن کی بجائے ایک چھوٹی سی مچھلی تیر رہی تھی۔ ہم نے کہا کہ آج یہ دودھ میں مچھلی کہاں سے آ گئی؛ اس پر ایک اور شخص نے ہمیں بتایا کہ دودھ والا بے ایمان ہے۔ اس نے راستے میں دودھ میں دریا کا پانی ملایا جس کے ساتھ مچھلی بھی دودھ میں چلی گئی۔"

میزبان کی یہ بات سن کر عرشے پر موجود سارے احباب نے قہقہہ لگایا۔ اتنا بلند قہقہہ کہ دریا میں تیرتی ہوئی آزاد مچھلیاں گہرائی میں جا کر چھپ گئیں۔

کچھ دیر بعد اس تاریخی جہاز کی بات دوبارہ چھڑ گئی۔ ہمارے میزبان بتا رہے تھے اس میں انسان اور حیوان کیسے سفر کرتے تھے اور کتنا ٹکٹ لگتا تھا۔ کہنے لگے "جہاز کی نچلی منزل میں سارے مویشی ہوتے تھے مثلاً بکریاں اور بھینسیں، اور اوپری منزل پر ہم جیسے انسان ہوتے تھے۔ یقین کیجئے کہ جہاں اس پر آپ کھڑے ہیں یہ مویشی والی نہیں بلکہ انسانوں والی جگہ تھی۔ اور جہاز پر سوار ہو کر پار اترنے کا ٹکٹ صرف چار آنے ہوا کرتا تھا۔"

میں نے پوچھا "یہ جہاز کب سے بند پڑا ہے۔ کب سے یہ نمائش کے طور پر یہاں کھڑا ہے؟"

وہ بولے "یہ جہاز تین چار سال سے بند ہے۔ غالباً ۸۵ء سے اس نے کام بند کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے یہ مسلسل چلتا تھا۔ پھر ڈیرہ اسماعیل خان اور دریا خان کو ملانے والا پُل بن گیا۔ یہ غالباً ۸۳ء اس سے پہلے یہ جہاز باقاعدگی سے چلتا تھا ـ چلتا تو اب بھی ہے۔ یہ نہیں کہ اب نہیں چلتا مگر اب ضرورت نہیں رہی۔"

ہاں تو پُل کی بات نکل آئی۔ اس پُل کا قصّہ یہ بتاتے ہیں کہ جب پہاڑ جیسا تربیلہ ڈیم بن کر تیار ہو گیا اور مٹی ڈھونے والی بڑی بڑی مشینیں فارغ ہو گئیں تو ان کی بچی کھچی زندگی سے فائدہ اٹھانے کی سوچی گئی ـــــ اب دو تجویزیں سامنے تھیں۔ ایک یہ کہ دریائے سندھ کے دائیں کنارے پر پشاور سے کراچی کی بندرگاہ تک جدید شاہراہ بنا دی جائے۔ یا پھر دریائے سندھ کے تین اہم مقامات پر پُل بنا کر کروڑوں لوگوں کے دکھ دور کیے جائیں۔ آخر فیصلہ پُلوں کے حق میں ہوا اور یوں ڈیرہ اسمٰعیل خان اور دوسرے کنارے پر دریا خان کو ملانے والا یہ پُل بنا جس کی کہانی آج میں کہہ رہا ہوں۔

وہیں دریا کے کنارے میری ملاقات ایک موٹر لانچ کے کپتان احمد نواز سے ہوئی۔ ان کی لانچ ہر روز کچھ آبادیوں اور ڈیرہ اسماعیل خان کے درمیان سات آٹھ پھیرے کرتی ہے اور شہر والوں کے لیے دودھ لاتی ہے۔ صرف ایک روپیہ دے کر دودھ والے شہر آتے ہیں اور واپس جاتے ہوئے گھر گرہستی اور مال مویشی کی ضروریات کا سامان ساتھ لے جاتے ہیں۔ میں لانچ کے کپتان احمد نواز سے باتیں کر رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ پُل کے کھل جانے سے ان کا نقصان ہوا ہوگا اور یہ ناخوش ہوں گے مگر وہ کہنے لگے کہ پُل کی تعمیر سے وہ بہت خوش ہیں۔ کیونکہ پُل بننے سے علاقے کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔

"کیا فائدہ پہنچا ہے؟" میں نے پوچھا

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے "پُل بننے سے جی ڈی آئی خان کو بہت فائدہ پہنچا ہے۔ ایک تو مال آ رہا ہے، پسنجر بھی آ رہا ہے اور ٹرک بھی آ رہا ہے اور پسنجر کو جو پریشانی اٹھانی پڑتی تھی وہ دور ہو گئی ہے۔ خصوصاً لیڈیز کو بے حد تکلیف ہوتی تھی۔ پانی زیادہ ہو تو انہیں لانچ سے اُتر کر پانی میں چلنا پڑتا تھا۔ بچاریاں صبح چھ بجے چلتی تھیں اور تین سے لگا کر چھ گھنٹے تک سفر کر کے اور مصیبت

اٹھا کر پار پہنچتی تھیں۔ بس یوں سمجھئے کہ کراچی کا سفر اور یہ دریا پار کا سفر، دونوں برابر تھے۔"

میں نے پوچھا ـــ "مسافر رات کو کہاں ٹھہرتے ہوں گے؟ ـــ"

احمد نواز نے بتایا ـــ "انہیں دریا خان میں ٹھہرنا پڑتا تھا۔"

میں نے کہا ـــ "وہاں ان کے ساتھ کیا سلوک ہوتا تھا؟ ـــ"

کہنے لگے ـــ "نہ پوچھیے۔ وہاں جو ہوٹل والے تھے وہ چارپائی کا کرایہ بھی زیادہ چارج کرتے تھے اور رات کے کھانے کے بھی زیادہ دام مانگتے تھے۔ عورتوں کو بے حد تکلیف تھی کیونکہ ادھر نہ کمرے تھے نہ باتھ روم تھے۔ عورتیں بہت خوار ہوتی تھیں۔ ہر ایک تھک کر چور ہو جاتا تھا۔"

میں نے پوچھا ـــ "اب یہ راستہ پُل بننے کے بعد کتنی دیر میں طے ہو جاتا ہے؟"

احمد نواز جواب دیتے دیتے جھومنے لگے۔ کہنے لگے ـــ "اب تو زیادہ سے زیادہ آدھا گھنٹہ لگتا ہے ورنہ عموماً یہ راستہ اب صرف بیس منٹ میں طے ہو جاتا ہے۔"

اور اب اس کہانی کا دوسرا رُخ بھی سن لیجیے۔

ڈیرہ اسماعیل خان تمام بڑے شہروں سے دور ہے۔ ملتان یہاں سے ساٹھ میل کے فاصلے پر اور بیچ میں دریا ہے۔ پشاور یہاں سے دو سو دس میل کی دوری پر ہے اور بیچ میں پہاڑ اور ویرانے ہیں۔ پھر کسی کے ہاتھوں نئے زمانے کا ایک کارنامہ انجام پایا۔

جس شہر کو بسا کر اس کے بسانے والے بھی بھول گئے ہوں گے اُس نے اِس شہر میں ایسی بڑی اور شاندار یونیورسٹی تعمیر کرا دی کہ آپ دیکھیں تو خود اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آئے۔ یونیورسٹی کا ذکر آگے چل کر آئے گا۔ پہلے تو یہ سنیئے کہ ڈیرہ اسماعیل کی اس یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر نواب اللہ نواز خان نے اپنی ایک ہزار ستر ایکڑ زمین اٹھائی اور یونیورسٹی کو سونپ دی۔ اس وسیع و عریض خطّے کے ایک گوشے میں صرف دو سوا ایکڑ زمین پر تو یونیورسٹی کا کیمپس بن گیا، طے یہ پایا کہ باقی زمین پر یونیورسٹی کا شہر بسایا جائے گا۔ یہ فیصلہ ہونا تھا کہ مکانوں کے لیے زمینیں خریدنے کی خاطر ایک خلقت دوڑ پڑی۔ اس یلغار کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یونیورسٹی کے صدر دروازے سے لگی لگی جو سڑک آگے تک جاتی ہے، خیال تھا کہ دریائے سندھ کا پُل اسی سڑک پر بنے گا اور اس کے بعد رہائشی پلاٹوں کی مٹّی سونا چاندی

بن جائے گی۔

قریب تھا کہ اس زمین پر جیتا جاگتا شہر کھڑا ہو جائے کہ پُل کی تعمیر کا اعلان ہو گیا اور اعلان ہو گیا کہ یہ پل یونیورسٹی والی سڑک پر نہیں بلکہ غلیل کی شاخ کی طرح الگ ہو جانے والی دوسری سڑک پر تعمیر ہو گا۔ یہ اعلان ہونا تھا کہ ایک عجب واقعہ ہوا ــــ

آپ نے کبھی دیکھا ہے کہ کوئی بستی بسنے سے پہلے اجڑ گئی ہو۔ پُل کی تعمیر کا مقام بدلنا تھا کہ اس زمین کے ــــ اس محبوبہ کے عاشقوں کی نگاہیں بدل گئیں۔ اور پھر ان میدانوں میں گھروندے بنانے کے لیے کوئی نہیں آیا۔ پُل بن گیا مگر بستی کی تعمیر کا پورا منصوبہ ڈھے گیا۔

دریا بیکار ہے

آپ کو یاد ہے کہ استاد سے آخری مرتبہ آپ نے ڈانٹ کب کھائی تھی؟ مجھے یاد ہے۔ یہ ابھی سال ڈیڑھ سال پہلے کی بات ہے۔ ہوا یہ کہ میانوالی سے میں نے ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی کے استاد ڈاکٹر حمید اللہ کو ٹیلی فون کیا ــــ اور بتایا کہ میں کل دوپہر آپ کے پاس آ رہا ہوں۔ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے کہ میں آپ کا انتظار کروں گا ــــ پھر یہ ہوا اور اس میں میرا قصور نہیں کہ راستے میں بلوٹ شریف آ گیا۔ تاریخ اور تصوف کے اس اہم ٹھکانے پر میں ذرا دیر ٹھہرا تو ڈیرہ اسماعیل پہنچتے پہنچتے دوپہر ختم ہوئی اور سہ پہر آ پہنچی۔ میں لپکا ہوا استاد کے کمرے میں پہنچا۔ ڈاکٹر حمید اللہ اپنے قول کے سچے تھے۔ وہ میرا انتظار تو کر رہے تھے مگر دیر سے آنے پر خفا خفا سے تھے۔ کہنے لگے کہ ہم لوگ تو خیر بدنام ہیں۔ آپ انگلستان سے آئے ہیں، آپ تو وقت کی پابندی کیا کیجیے ــــ

اور بھی خدا جانے کیا کچھ کہا۔ مجھے بس اتنا یاد رہ گیا کہ اُستاد کی ڈانٹ کھا کر لڑکپن میں شرم آتی تھی اب کے لُطف آیا۔ گوشمالی کا عمل ختم ہوا رفاقتوں اور محبتوں کا سلسلہ چل نکلا۔ سارے اُستادوں کو خبر کر دی گئی کہ میں آیا ہوں ــــ سارے کمروں کی چلمنیں اُٹھیں۔ سب لوگ مجھ سے ملنے چلے آئے، اور پھر خوب گاڑھی چھنی۔

میں نے کراچی سے پشاور تک بہت سی یونیورسٹیاں دیکھی ہیں۔ مگر ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی کو دیکھ کر بڑا چین آیا۔ ہماری کار ایک بہت بڑے گیٹ پر رُکی، محافظوں نے اچھی طرح پوچھ گچھ کی، اچھی طرح اطمینان کیا کہ ہم کہیں ایسے ویسے تو نہیں اُس کے بعد ہم اُس ایک ہزار ایکڑ پر پھیلی ہوئی یونیورسٹی کے کیمپس میں کیا داخل ہوئے گویا گلزار میں داخل ہو گئے۔ میں نے اتنے سلیقے اور اتنے قرینے سے بنی ہوئی اتنی آراستہ یونیورسٹی اور کہیں نہیں دیکھی۔

باغ، باغیچیوں، کیاریوں اور امرتیوں کو تو جانے دیجیے، عمارتوں کو چھوڑیے۔ میں تو اُن نوجوانوں پر حیران ہوں جو اُس روز کہیں نظر نہیں آرہے تھے۔ نہ سبزہ زاروں پر ٹولیاں جمائے بیٹھے تھے نہ راہداریوں میں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے گھوم رہے تھے۔ نہ درختوں کے سایوں کے نیچے بیٹھے سرگوشیاں کر رہے تھے۔ نہ کہیں طالبات کی ٹولیاں تھیں، نہ لڑکیوں کے پیچھے تپتی دھوپ میں سرگرداں گریباں چاک لڑکے تھے۔ میں نے حیرت سے پوچھا یہ کیسی یونیورسٹی ہے۔ سارے طالب علم کہاں ہیں۔جواب ملا۔اپنی اپنی جماعتوں میں۔ آج میں اسی یونیورسٹی کی کہانی کہہ رہا ہوں۔

ڈاکٹر حمید اللہ علی زئی بہت پڑھے لکھے ہیں۔ یوں تو زراعت کے استاد ہیں۔ لیکن اُن دنوں قائم مقام وائس چانسلر بھی تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ یہاں ڈیرہ اسماعیل خان میں جو دنیا سے بالکل الگ تھلگ ہے۔ اتنی اعلیٰ یونیورسٹی کب اور کیسے قائم ہوئی۔

ڈاکٹر صاحب کو تو گویا سارا جواب ازبر تھا۔ کہنے لگے:

"جب ۱۹۷۴ء میں یونیورسٹی قائم ہوئی تو یہاں نہ کوئی یونیورسٹی کے قابل بلڈنگ تھی۔ نہ ہوسٹل تھے، نہ کتابیں تھیں، نہ فرنیچر تھا مگر اس وقت کے پہلے وائس چانسلر نواب اللہ نواز خان میں ایک جذبہ تھا۔ انہوں نے یونیورسٹی کے لیے اپنی تقریباً ایک ہزار ستر ایکڑ اراضی جس پر یہ یونیورسٹی قائم ہے وقف کر دی۔ لوگوں نے اپنے گھر لڑکوں کے ہوسٹلوں اور کلاسوں کے لیے خالی کیے۔ اس علاقے سے تعلق رکھنے والے اعلیٰ تعلیم یافتہ حضرات ملک میں جہاں بھی خدمت سرانجام دے رہے تھے۔ اس یونیورسٹی کی خدمت کے لیے کھنچے چلے آئے کیونکہ نواب صاحب کی درخواست تھی کہ اس علاقے کی خدمت کے لیے اپنے آرام اور آسائشوں کو بالائے طاق رکھ کر آئیں اور یونیورسٹی کے پاس آئندہ خط وکتابت کے وسائل بھی نہیں ہیں اس لیے وہاں سے اپنی نوکریوں کو ہمیشہ کے لیے خیرباد کہہ کر آئیں۔ یہاں سے تعلق رکھنے والے تجربہ کار حضرات جوق در جوق آئے اور اپنی خدمات پیش کیں۔ تو یوں اس یونیورسٹی کا کاروبار چلا۔"

بات یہاں تک آگئی تو ڈاکٹر حمید اللہ کو اپنی یونیورسٹی کے پہلے وائس چانسلر نواب اللہ نواز خاں یاد آئے اور فرطِ جذبات سے ان کی آواز بھرا گئی۔ کہنے لگے۔ "وہ چار سال وائس چانسلر رہے اور اس دوران انہوں نے کوئی تنخواہ نہیں لی، نہ یونیورسٹی سے کوئی ٹی اے ڈی اے لیا بلکہ غریب

طالب علموں کو وظیفے دیئے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔"

ڈاکٹر حمیداللہ علی زئی چونکہ زراعت کے استاد ہیں اس لیے انہوں نے ڈیرہ اسماعیل خان کے علاقے کے بارے میں بعض دلچسپ باتیں بتائیں۔ دراصل یوں ہے کہ ایک طرف دریا ہے اور ایک طرف پہاڑ— پہاڑوں پر موسم برسات کے بادل خوب خوب برستے ہیں لیکن ان کا پانی طغیانی کی صورت بہتا ہوا، میدانوں کے چوڑے چکلے سینے پر دوڑتا ہوا دریا میں جا گرتا ہے۔ کوئی اگر اس پانی کو روک لے تو ان میدانوں کے دن پھر جائیں اور ان زمینوں کے مقدّر جاگ اُٹھیں۔

ایک زمانہ تھا جب یہ پانی روکا جاتا تھا، یہ زمینیں سیراب ہوتی تھیں اور سونا اگلا کرتی تھیں۔ اس کے متعلق ڈاکٹر حمیداللہ نے بتایا "ہمارے مغرب میں رودکوہی کا نظام ہے۔ اس کے لیے کئی دفعہ اسکیمیں بنی ہیں۔ مثلاً گومل زام اسکیم ہے لیکن چالیس سال ہو گئے ہیں، ابھی تک وہ مکمل نہیں ہوئی ہے۔ ہمارے پاس ہزاروں کیوسک پانی ہے جو ہر سال بہہ کر دریائے سندھ میں چلا جاتا ہے۔ مسئلہ یہ ہے کہ باہر کے انجینئر حضرات کو اس علاقے سے دلچسپی نہیں اور نہ وہ یہاں آنا چاہتے ہیں نہ کام کرنا چاہتے ہیں۔ اسکیم بنی ہے اور وہ چل نہ سکی۔ تو اگر یہاں ایک نیوکلیئس ہو جائے، انجینئرنگ کا مرکز بن جائے تو میں یہ سمجھتا ہوں کہ بڑا دوررس اثر ہوگا ذرا سوچئے کہ یہ زرعی علاقہ ہے اور یہاں ہزاروں ایکڑ زمین بیکار پڑی ہے۔ ایک دفعہ پانی روک کر اور ذخیرہ کر کے استعمال ہونے لگے تو یہ علاقہ زیرِ کاشت آسکتا ہے اور آباد ہو سکتا ہے —"

کاش ایسا ہو جائے۔

میں نے پوچھا کہ کیا یہ صحیح ہے کہ آزادی سے پہلے انگریز حکام اس رودکوہی نظام کو خوب خوب چلاتے تھے اور کوہِ سلیمان کی ترائی کے لوگ ان زمینوں سے فصلیں اگایا کرتے تھے؟

"جی ہاں۔ اگر آپ ڈیرہ اسماعیل خان کی تاریخ اُٹھا کر دیکھیں تو آپ کو پتہ چلے گا کہ انگریزوں کے دور میں یہاں کا ڈپٹی کمشنر گھوڑے کی پیٹھ پر بیٹھ کر، دھوپ کا ہیٹ پہن کر خود جایا کرتا تھا اور اپنی ذاتی نگرانی میں پانی کے ذخیرے اور تقسیم کا انتظام کراتا تھا۔ اس علاقے کے جتنے زمیندار تھے ان کو برابر کا حصہ ملا کرتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ یہ جو پانچ سے دس ہزار کیوسک تک پانی جو اب بہہ کر دریائے سندھ میں چلا جاتا ہے اور کسی کام نہیں آتا۔ یہی پانی ایک باقاعدہ نظام کے تحت کام آیا کرتا تھا۔ اسی کو

رودکوہی نظام کہا کرتے تھے اور اُس وقت یہ علاقہ بہت ہی زرخیز اور آباد تھا۔ آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ ہماری صرف ایک تحصیل کلاچی کا جو ریونیو تھا وہ صوبے کی تمام تحصیلوں سے زیادہ تھا۔ سبب یہی تھا کہ یہ علاقہ آباد تھا۔ آج اس کی حالت یہ ہے کہ ہماری غلط پالیسیوں کی وجہ سے نہ پانی کو روکا جا رہا ہے۔ نہ بند باندھے جا رہے ہیں، نہ پانی کا ذخیرہ ہو رہا ہے۔ اس پانی سے بجلی بھی مل سکتی تھی؛ زراعت بھی ہو سکتی تھی مگر اس پر کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ نتیجہ یہی ہے کہ مانسون کے موسم میں زراعت تو رہی ایک طرف، غریب کسان کی جان کے لالے پڑ جاتے ہیں کیونکہ پہاڑوں کی جانب سے اتنا بڑا سیلاب آتا ہے کہ کھڑی فصلیں اور بارانی فصلیں سوکھے تنکے کی طرح بہہ جاتی ہیں، مال مویشی بھی بہہ جاتے ہیں اور کسانوں کے گھر بھی تباہ ہو جاتے ہیں۔"

یہ تو خیر برسات کے پانی کی بات ہوئی، وہ جو دریائے سندھ کا میٹھا پانی اس سرزمین کے ٹکڑوں کو چھوتا ہوا گزرتا ہے وہ اس کی تپتی پیشانی کو بھی ٹھنڈک پہنچاتا ہے یا نہیں، میں نے ڈاکٹر حمید اللہ سے پوچھا کہ دریائے سندھ سے آپ کے علاقے کو فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں؟

ذرا ان کا جواب سُنیئے ——— "اس وقت ہمیں دریائے سندھ سے کوئی فائدہ نہیں کیونکہ دریا ہمارے علاقے سے گزر رہا ہے۔ اس کا لاکھوں کیوسک پانی ہم دیکھتے ہیں لیکن اس کی بوند بوند کو ترستے ہیں۔ دریا ہمارے سامنے سے بہتا ہوا سمندر کی طرف چلا جاتا ہے۔ حکومت کی اسکیم تھی کہ چشمہ رائٹ بینک کینال بنائی جائے گی۔ ہم لوگوں کی بڑی اُمیدیں تھیں۔ ہم سوچتے تھے کہ آزادی ملے گی اور پاکستان بنے گا تو چشمہ رائٹ بینک کینال یہاں آئے گی اور ہماری ضرورتیں پوری کرے گی۔ مگر افسوس کی بات یہ ہے کہ نامعلوم وجوہات کی بنا پر اس منصوبے کو پس پشت ڈال دیا گیا اور چالیس سال گزر جانے کے باوجود وہ اسکیم مکمل نہیں ہوئی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ اتنے بڑے دریائے سندھ سے ہمیں کوئی فائدہ نہیں۔"

یہ تو ہوئے گومل یونیورسٹی کے وائس چانسلر اور یہ ہیں اُسی یونیورسٹی کے رجسٹرار ڈاکٹر ذوالفقار عالم خان اس روز ڈیرہ اسماعیل خان کی تاریخ، باشندوں اور ان کے مسائل کی باتیں کر رہے تھے:

"کہا جاتا ہے کہ اسماعیل خاں بلوچ، جو افغانستان سے تشریف لائے تھے، یہاں پہنچے اور اپنا ڈیرہ جمایا۔ اسی لیے اسے ڈیرہ اسمٰعیل خان کہتے۔ ان کے دو بھائی تھے دریا خان اور غازی خان۔ انہوں نے جہاں اپنے ڈیرے جمائے وہ مقامات دریا خان اور ڈیرہ غازی خان کہلائے۔ یہاں پر زیادہ تر

بلوچی باشندے آباد ہیں۔

ڈیرہ کے لوگ بہت ملنسار ہیں۔ بہت ہی مہمان نواز ہیں۔ ان کے لیے یہاں تک مشہور ہے کہ مہمانوں کو آنے دیتے ہیں جانے نہیں دیتے۔ اس کی وجہ سے آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ باہر سے آئے ہوئے جو لوگ ایک دفعہ ان کے پاس ٹک گئے وہ مستقل طور پر یہاں کے سکونتی ہو گئے ہیں۔

ابھی حال ہی میں ڈیرے کو دریا خان سے ملانے والا پل بنا ہے جو پنجاب کے ساتھ بہت اہم رابطہ ہے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی کھل جانے سے یہ علاقہ اب کچھ ترقی کر رہا ہے۔ یہاں کا لکڑی کا کام اور ڈیرے کا حلوہ بہت ہی مشہور ہے۔

موسم تو آپ نے دیکھ ہی لیا ہوگا کہ یہاں بہت گرمی ہے اور یہ ریگستانی علاقہ ہے۔

غریبی بہت ہے۔ آپ نے دیکھا ہوگا کہ بہاولپور اور کالا باغ کی طرح یہاں بھی سائیکل رکشہ چلتے ہیں اور انسان یہاں انسان کو کھینچتا ہے۔ یقین کیجیے کہ یہی سائیکل رکشہ یہاں روزگار کا بڑا ذریعہ ہے۔ جو دستکار یا ہنرمند نہیں، ان کے لیے یہاں روزگار بھی نہیں۔"

میں نے ذوالفقار عالم خان صاحب سے پوچھا کہ یہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کا علاقہ اتنا پسماندہ کیوں ہے؟ اور اس سوال کا جواب بڑے کرب لیے ہوئے تھا اپنے پہلو میں۔ اس جواب میں اُن اساتذہ کا حال بھی کھلا جو علم پھیلانے کے جذبے سے سرشار یہاں چلے آئے تھے مگر یہاں ٹھہر نہ سکے۔

ہاں تو میں نے پوچھا کہ یہ علاقہ اتنا پسماندہ کیوں ہے؟۔ جہاں میرا سوال ختم ہوا، وہیں ان کا جواب شروع ہوگیا۔ بولے ـــــ "اس لیے کہ یہ علاقہ ایک ایسے کونے میں ہے جس کا پہلے کوئی رابطہ نہیں تھا۔ ہمارا صوبائی دارالحکومت پشاور یہاں سے ڈھائی تین سو کیلومیٹر دور ہے اور سارا راستہ پہاڑی ہے۔ پہلے دن میں صرف ایک سرکاری بس پشاور جاتی تھی، اب نجی شعبے کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے تو پرائیوٹ بسیں چلتی ہیں، لوگ آتے جاتے ہیں۔ اسی طرح پنجاب کے ساتھ ہمارا کوئی رابطہ تھا ہی نہیں۔ اب حال میں پُل بنا ہے۔ رابطہ نہ ہونے کا افسوسناک نتیجہ نکلا۔ مثلاً ڈیرہ اسماعیل خان کی گومل یونیورسٹی میں ملک بھر سے بڑے بڑے اساتذہ کو بلایا گیا۔ لیکن وہ لوگ یہاں سے چھوڑ کر چلے گئے۔ حالت یہ تھی کہ اگر کوئی شخص لاہور سے یہاں آیا ہے اور اسے کوئی مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو واپس پہنچ بھی نہیں سکتا تھا۔"

میں نے پوچھا: "اب یہ بتائیے کہ اتنے الگ تھلگ علاقے میں یہ جو آپ کی یونیورسٹی کھلی ہے، یہ ملک کے دوسرے تعلیمی اداروں سے کس لحاظ سے مختلف ہے؟"

جواب ملا — "مختلف اس لحاظ سے ہے کہ یہ پُرامن یونیورسٹی ہے۔ آپ نے یونیورسٹی دیکھی۔ آپ نے محسوس کیا ہوگا کہ لوگ یا تو کلاس روم میں ہیں یا لیبارٹریز میں موجود ہیں، وہ دوسری جگہوں کی طرح باغوں میں اور راہ داریوں میں نہیں بیٹھے ہیں۔"

لیجیے میری بات کی تصدیق ہو گئی اور سند بھی ملی تو ایک استاد سے۔ مگر بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی۔ میں نے ڈاکٹر ذوالفقار عالم خان صاحب سے پوچھا: "ہر چند کہ آپ کا علاقہ دوسرے خطّوں سے کٹا ہوا تھا، مگر اب تو راستے کھل رہے ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ان راستوں سے دوسرے خطّوں کی سماجی لعنتیں بھی چل کر یہاں پہنچ رہی ہوں؟"

جواب ملا — "نہیں ابھی اس علاقے میں وہ صورت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ یہ تھوڑا سا وی سی آر کی وجہ سے لوگوں کے ذہن اُس طرف چل نکلیں ورنہ ایسی کوئی بات نہیں۔ یہاں پر بہت ہی زیادہ اسلامی ذہن ہے —"

میں نے کہا — "تو پھر کیا امید ہے آپ کو۔ اب کیا ہوگا۔ بڑی یونیورسٹی بن جانے سے اس خطّے کے لوگوں کے دن پھریں گے یا نہیں؟۔ اس تاریک گوشے میں علم کا نور پھیلے گا یا نہیں؟"

وہ بولے — "ہر مسئلے کے لیے کچھ وقت درکار ہوتا ہے۔ شروع میں تکالیف بہت تھیں۔ یہ یونیورسٹی گھروں میں بکھری ہوئی تھی، ہمارا یونیورسٹی کیمپس نہیں تھا۔ اب کیمپس بنا ہے اور یہاں کے بہت سے غریب لوگ جو تعلیم کے لیے باہر نہیں جا سکتے تھے اب یہاں پر تعلیم یافتہ ہو گئے ہیں۔ کافی کالج اب بن گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اب ہوٹلوں کے ملازم بھی آپ کو پڑھے لکھے نظر آئیں گے۔ پہلے ہمیں دفاتر کے لیے بھی تعلیم یافتہ لوگ نہیں ملتے تھے۔ اب تو چپراسی کی آسامی کے لیے بھی میٹرک اور ایف اے پاس لوگ درخواستیں دیتے ہیں۔"

میں نے ذوالفقار عالم خان کا یہ جواب سُنا اور حیرت کے سمندر میں ڈوب گیا — میں سوچ رہا تھا کہ ان کے اس جواب پر مجھے خوش ہونا چاہیے یا افسوس کرنا چاہیے۔

کاش اس روز میرے سامنے کوئی تیسرا راستہ ہوتا۔

غلام فرید صاحب ڈیرہ اسمٰعیل خان کی گومل یونیورسٹی کے استاد ہیں۔ شہر میں ایک چھوٹے سے مگر آرام دہ اور آراستہ مکان میں رہتے ہیں لیکن اپنے دیہاتی ہونے پر اصرار بھی ہے اور ناز بھی۔
میں اُس روز اُن کے ہاں پہنچا تو مجھے احساس نہ تھا کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے علاقے کی ثقافت، تمدن، رسم و رواج اور لوک ورثے پر وہ کیسی لکتی ہوئی، مہکتی ہوئی گفتگو کریں گے۔ مجھے احساس نہ تھا کہ ان کی بولی میں دیہات کا جو رنگ ہے وہ اُردو سے مل کر اس زبان میں کیسی مٹھاس گھولے گا۔ لیکن جب بات چلی تو اس کا اعجاز دیکھیے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کے چھوٹے سے مگر آرام دہ اور آراستہ مکان سے چل کر آج ہمارے اور آپ کے گھروں میں پہنچ رہی ہے اور دلوں میں گھر کر رہی ہے۔
میں نے غلام فرید صاحب سے پوچھا کہ ذرا ڈیرہ اسمٰعیل خان کے بارے میں کچھ بتایئے۔ اس علاقے میں بسنے والوں کا حال سنایئے، لوگ کیسے ہیں، ان کے درمیان محبتیں کیسی ہیں، ہمیں بھی بتایئے۔

انھوں نے بتایا اور خوب خوب بتایا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان وطنِ عزیز کے قدیم شہروں میں سے ہے اور یہاں رفتارِ ترقی چونکہ سُست رہی ہے، معاشرتی اقدار میں اتنا تغیّر واقع نہیں ہوا لہٰذا میں یہ وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ یہاں قدیم تہذیب کے نقوش ابھی تک باقی اور سالم ہیں۔
دریائے سندھ ہماری تہذیب کا ایک حصّہ بن چکا ہے جس کے مغربی کنارے پر، ساحل کے ساتھ ساتھ بہت سے ایسے چھوٹے گاؤں موجود ہیں جہاں پر جا کر آپ خود مشاہدہ کریں گے کہ ان کی تہذیب محبت والفت کی آئینہ دار ہے اور لوگ اتنے حلیم الطبع اور اتنے منکسر المزاج ہیں کہ ان کے اندر وہی شیرینی پائی جاتی ہے جو ایک قدیم تہذیب کی علامت ہوا کرتی ہے۔
اس میں ایک بات یہ ہے کہ پورا کا پورا گاؤں اپنے آپ کو ایک کنبہ سمجھتا ہے۔ غم میں خوشی میں اتنی شراکت ہے کہ وہ اپنے آپ کو غیر نہیں سمجھتے۔ ان کے غم میں بھی اور خوشیوں میں بھی آپ وہ لطافت اور شیرینی پائیں گے کہ جو اب بڑے شہروں میں ناپید ہوتی جا رہی ہے۔"
یہ تو ہوئی لوگوں کی بات کہ جس کے دوران غلام فرید صاحب کے ہونٹوں پر مسلسل مسکراہٹ پھیلی رہی جس میں افتخار کی آمیزش تھی۔ میں نے پوچھا کہ اب یہ بتایئے کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کا علاقہ کیسا ہے اور اسے شروع میں کس نے بسایا؟

جواب ملا — "اس کی مغربی جانب ایک وسیع و عریض چٹیل میدان کا علاقہ ہے جس کو دامن کہتے ہیں، یعنی کوہِ سلیمان کا دامن! اور اگر آپ اس میدان سے مغرب کی جانب جائیں تو وہ پہاڑی علاقہ شروع ہو جاتا ہے جس کو کوہِ سلیمان کہتے ہیں۔ اس کوہِ سلیمان کی آبادی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو براہ راست حضرت بہاءالدین زکریاؒ کے شاگرد، یعنی سہروردیہ سلسلے کے تھے۔ ضمناً میں یہ عرض کر دوں کہ نواب محمد اسمٰعیل، جن کے نام پر یہ شہر آباد ہوا، سہروردیہ سلسلے کے تھے اور ان کے ساتھ بہت بڑے تمن یعنی قبیلے والے آئے اور وہ تمن دار جو تھے انہوں نے مختلف بستیاں آباد کیں جن میں گرائی اور دوسرے علاقے ہیں۔ یہ دراصل ان ابتدائی بلوچوں کے نام پر آباد ہیں —"

میں نے کہا — "اچھا یہ تو ہوا — اب یہ فرمائیے غلام فرید صاحب کہ اس علاقے میں تہذیبیں کیسی ہیں۔ ثقافتیں کیسی ہیں۔ تمدن کیسا ہے؟ —"

وہ بولے — "ڈیرہ اسمٰعیل خان کی تین تحصیلوں میں الگ الگ تہذیبوں کے نشانات ملتے ہیں۔ مثلاً خود ڈیرہ اسمٰعیل خان کی تحصیل میں جو رسم و رواج ہیں وہ سرائیکی کے آئینہ دار ہیں۔ کلاچی میں سرائیکی اور پشتو کا حسین امتزاج ہے۔ آپ ان سے گفتگو کریں، دو فقرے پشتو میں بولیں گے اور اس میں سرائیکی کی چاشنی ملا دیں گے۔ پھر ہماری تحصیل ٹانک سراسر پشتو کا علاقہ ہے اور ہمارے قبائلی علاقے کے لوگ جن میں محسود اور وزیر شامل ہیں وہ اب ٹانک میں آباد ہو چکے ہیں۔ ان کی تہذیب کا انداز وہی قبائلی علاقے اور قبائل جات کا ہے۔ جس کو قبائل زو کہتے ہیں۔ قبائل زو کے معنی ہیں ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے ان کا باہمی منسلک ہونا —"

اب میں نے کہا "اور آئیے اب ان لوگوں کی باتیں کریں جو آج آباد ہیں اور خدا کرے رہتی دنیا تک آباد رہیں۔ جیسا کہ انشاؔ نے کہا تھا:

لو فقیروں کی دُعا ہر طرح آباد رہو
خوش رہو، موجیں کرو، تازہ رہو، شاد رہو

اس خطّے کے لوگ، ہم سب جانتے ہیں کہ انشاؔ کی دُعا کا فیض اٹھا رہے ہیں، وہ خوش رہتے ہیں، موجیں کرتے ہیں، بتائیے یہاں گانے بجانے کی کوئی روایت ہے؟

میرا سوال سن کر غلام فرید صاحب کھِل اُٹھے "سبحان اللہ، آپ نے بڑی لطیف بات کی۔ یہاں ایک

انداز ہے اور ہماری موسیقی کا ایک خاص گیت ہے جس کو ہم بگڑو کہتے ہیں۔ اس بگڑو کی تحقیق یہ ہے کہ یہ لفظ سرائیکی کا ہے۔ اس کے معنی پھولوں کے ہار۔ عام طور پر بگڑو میں ہم اُس رومانس کو بیان کرتے ہیں جو عین عالم شباب میں ہوتا ہے اور موجیں مارتی ٹھاٹھیں مارتی موسیقی میں اس کا اظہار کیا جاتا ہے۔ اُس کی صنف کچھ اِس قسم کی ہے کہ پہلا مصرعہ بے تکا ہوتا ہے جس کے ساتھ دوسرا باقاعدہ مصرعہ ملا لیتے ہیں۔

اب رہ گیا رقص، تو اس علاقے کا خاص رقص جھومر ہے۔ جھومر گول دائرے میں ہوتا ہے۔ ہمارے علاقے میں اب تک کچھ ایسے دیہات ہیں جہاں مرد و زن بلا تخصیص مل کر کے اکٹھا رقص کرتے ہیں اور اس کو معیوب تصوّر نہیں کیا جاتا، کیونکہ سارا گاؤں ایک ہی خاندان تصوّر کیا جاتا ہے۔ البتہ جھومر کی ایک خاص دھن ہے۔ اس دھن پر ہمارے نوجوان الگ رقص کرتے ہیں اور عورتیں الگ جھومر رقص کرتی ہیں —

یہ جھومر کا رواج ڈیرہ غازی خان میں ہے اور کچھ میانوالی کے علاقوں میں بھی جھومر ناچی جاتی ہے اور بڑے لطف سے اس کو دیکھا جاتا ہے۔"

غلام فرید صاحب نے جھومر کا حال جھوم جھوم کر سنایا تو یوں لگا کہ دریا کا ہلکا ہلکا شور بھی تھرکنے لگا ہے۔

بات آگے بڑھنے لگی۔ "اور اب یہ بتائیے کہ آپ کے علاقے میں، وہ ڈیرہ اسمٰعیل خان ہو یا کلاچی یا ٹانک، میلے ٹھیلے کی کیا روایت ہے؟—"

ان کا جواب یوں تھا — "میلے اب بھی لگا کرتے ہیں۔ ہوتا ایسا ہے محترم کہ چار پانچ دیہاتوں میں مل کر کہیں ایک جگہ متعین کی جاتی ہے اور پھر دو دن تین دن پہلے اعلان کیا جاتا ہے۔ لوگوں کا ایک جمِ غفیر امڈ کر آجاتا ہے۔ آج کے مصروف ترین دنوں میں بھی جب لوگ اکٹھے آتے ہیں، جوان بوڑھے سب مل کر تو وہ منظر دیکھنے کے قابل ہوتا ہے — پھر وہ سب مل کر بیٹھتے ہیں۔

البتہ ایک بات عرض کروں جسے میں خود محسوس کرتا ہوں دیہاتی ہونے کی حیثیت سے۔ پہلے یوں ہوا کرتا تھا کہ عصر کے وقت ایک جگہ مقرّر ہوتی، وہاں بزرگ بھی بیٹھتے اور چھوٹے بھی بیٹھتے۔ بڑے وزنی قسم کے پتھر رکھے جاتے اور ان پتھروں کو اٹھانے کی ورزش کی جاتی۔ اور جب کوئی

نوجوان کسی پتھر کو اٹھانے میں ناکام رہتا تو ایک بوڑھا، عمر رسیدہ اُس کو تخلیئے میں بلا کر کہتا کہ دیکھو تن کی حفاظت کرو اور اپنے من کی بھی حفاظت کرو۔ مجھے کچھ شک گزرتا ہے ___ تو دیکھو ایسا کرو، اپنی جان کو سنبھال کے رکھو۔

اسی کے ساتھ ساتھ نوجوانوں کو تلقین کی جاتی، صفائی کی، ستھرائی کی، پاکیزگی کی، شرم کی اور حیا کی بوڑھے اور نوجوان مل کر کے یہ کھیل کھیلا کرتے تھے، ڈھول کی تھاپ کر۔

یہ پرانے وقتوں کی بات ہے۔ ہمارے ہاں اَب جو میلے لگتے ہیں ان میں گھوڑ دوڑ، کشتی اور تِڈّے کی دوڑ ہوتی ہے اور ان میلوں کو بہت شوق سے دیکھا جاتا ہے۔ ان ہی میلوں میں کچھ تہذیبی آثار اور بھی نظر آتے ہیں۔ وہ یہ کہ نوجوانوں کی جو صلاحیتیں ہیں، بزرگ لوگ ان کی نشاندہی کرتے ہیں اور پھر اس کے والد کو یا قریبی آدمی کو وہ کہہ دیتے ہیں کہ تمھارا نوجوان بڑا ہنر مند ہے۔ ذرا اس کا خیال رکھو، یہ ہیرا بن کے چمکے گا ___"

گفتگو ختم کرنے کو جی تو نہ چاہا مگر رات ڈھلنے کا احساس شاید کسی چوکیدار کی صدا سے ہوا۔ میں نے کہا ___" آخر میں میرا یہ سوال ہے غلام فرید صاحب کہ اب پُل بن رہے ہیں۔ سڑکیں کھلنے لگی ہیں، ہوائی جہاز اترنے لگے ہیں، بجلی، ٹیلی فون، ریڈیو، ٹیلی ویژن، یہ سب چلے آ رہے ہیں۔ یہ سب نئے زمانے کی آسائشیں ہیں مگر کہیں یہ نئی آسائشیں پُرانی روایتوں کو مٹا تو نہیں دیں گی؟"

انھوں نے ایک لمبی سانس لی اور شاید اس طرح سوچنے کی مہلت لی اور پھر بولے ___ "میرا خیال ہے کہ اس علاقے میں تہذیبی اقدار کے ساتھ ہماری جو اُلفت، محبت اور جذباتی لگاؤ ہے، کچھ عرصے تک تو ہم اس کو سنبھال کر رکھیں گے اور کچھ چیزیں ایسی ہیں جو معاشی ترقی کا تقاضا کرتی ہیں اور میرے دیہاتوں میں معاشی ترقی ہو رہی ہے، یعنی بجلی وہاں پہنچ چکی ہے۔ ٹرانزسٹر اور ریڈیو تو پہلے سے وہاں موجود ہے اور اسی قسم کی دوسری چیزیں پہنچ رہی ہیں لہٰذا خاص طور پر نوجوان نسل کی توجہ اب مبذول ہو رہی ہے اور کچھ ایسا ہے کہ جسے آپ انتقالِ آبادی کہتے ہیں۔ دیہاتی لوگ اب شہروں کو منتقل ہو رہے ہیں۔ اس عمل کی وجہ سے لوگ اپنے آبائی ٹھکانوں سے بھی ذرا دور ہو رہے ہیں اور تہذیبوں سے بھی دور ہو رہے ہیں اور یہ

ایک امتزاج ہو رہا ہے، قدیم اور جدید کا—"

غلام فرید صاحب کی باتیں تمام ہوئیں اور خواجہ غلام فریدؒ کی وہ کافی میرے ذہن میں گونجنے لگی جس میں اُس کونج کے رونے کا احوال ہے جو اپنی ڈار سے بچھڑ گئی تھی—

بھکّر دیس بھی دیکھ

دو چیزوں پر کبھی اعتبار نہ کرنا چاہیے: موسم کا حال اور شہروں کا نقشہ۔

نقشے پر ڈیرہ اسماعیل خان سے ڈیرہ غازی خان تک سیدھی سپاٹ سڑک بنی ہوئی تھی۔ دیکھنے میں یوں لگتا تھا کہ چاہیں تو اُس پر ہوائی جہاز اتارلیں چنانچہ جب میں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں اپنے کام سے فارغ ہوا، تھکا ہوا اٹھا، زور کی انگڑائی لی اور بولا — "اب کل صبح بس میں بیٹھوں گا اور سیدھا ڈیرہ غازی خان پہنچ کر دم لوں گا —"

احباب نے پوچھا "کس راستے سے جائیں گے؟ —"

میں نے نقشہ پھیلادیا اور وہ عمدہ سی سڑک انہیں دکھادی۔ احباب کو اپنی آنکھوں پر اور مجھے اُن کے تبصرے پر یقین نہیں آیا۔ کہنے لگے کہ یہ سڑک کبھی کی کھنڈر بن چکی ہے۔ رود کوہیاں اسے بہاکر لے گئیں۔ اس کے نشانوں پر کچھ ٹرک وغیرہ چلتے ہیں۔ خدا کے لیے اس راستے سے جانے کی کوشش نہ کیجئے گا —

"تو پھر کیا کروں؟" میں نے وہی سوال کیا جو حالات نے مجھ سے کروایا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ دریا پار بھکّر چلے جایئے۔ رات وہیں گزاریئے اور صبح تڑکے کی بس یا ریل گاڑی سے ڈیرہ غازی خان چلے جایئے۔

تو صاحبو! اس طرح دریا کے دائیں کنارے پر چلنے کا میرا خواب پورا نہ ہوسکا اور ہم نے دریائے سندھ پار کر کے بائیں کنارے پر بھکّر جانے کا فیصلہ کیا۔

مجھے یوں بھی اُس پُل کو دیکھنے کا اشتیاق تھا جس کے بننے سے پہلے دریا پار کرنے میں آٹھ نو گھنٹے لگا کرتے تھے اور اب صرف پندرہ منٹ لگتے ہیں۔ ذرا ہی دیر میں پُل سامنے آگیا۔ بہت

عمدہ، جدید اور مضبوط پُل نظر آتا تھا۔ اُس کا ایک سرا صوبہ سرحد میں اور دوسرا صوبہ پنجاب میں تھا۔ ہماری کار پل کی طرف بڑھی۔ میں نے احباب سے کہا کہ یہاں تو پولیس کھڑی ہے۔ شاید کار کی تلاشی لی جائے گی۔ احباب بولے ــــ "اِدھر والی پولیس کی تو فکر نہ کیجیے۔ یہ صوبہ سرحد کی پولیس ہے، کچھ نہیں کہے گی۔ البتہ پُل کے دوسرے سرے پر پنجاب کی پولیس ملے گی، وہ ضرور ستائے گی۔ دیکھیے صاحب۔ سرحد کے پولیس والوں نے کار میں جھانکا۔ ہم شاید صورتوں سے شریف نظر آئے اور انہوں نے ہمیں جانے دیا۔

زمین پر تنی ہوئی دریا کی نیلی چادر پر جزیروں کے بڑے بڑے بوٹوں کے منظر سے لطف اندوز ہوتے ہوئے ہم پل کے دوسرے سرے پر پہنچے۔ وہاں پنجاب کے پولیس والے کھڑے دور ہی سے ہماری کار کو تاک رہے تھے۔ انہوں نے وہیں سے رکنے کا اشارہ شروع کردیا۔ ہم سب نے دعائیں مانگیں کہ یہ کہیں پریشان نہ کریں۔ ہماری کار رکی تو ایک کانسٹیبل صاحب نے کھڑکی کے اندر گردن ڈالی اور کہا ــــ "جی۔ اِس بندے کو آگے جانا ہے، اِسے دریا خان پر اتار دینا ــــ"

اور اس سے پہلے کہ میں اپنی سادہ شستہ اُردو میں کہتا ــــ "ہاں ہاں ضرور اتار دیں گے ــــ" میرے احباب نے صاف بے باک پنجابی میں جواب دیا ــــ "کوئی نہیں۔ ہم بھکر جا رہے ہیں۔"

اور کچھ دیر بعد ہم بھکر جا پہنچے۔ کندیاں کے بعد اب پہلی بار ریل کی پٹڑی نظر آئی۔

بھکر بہت پرانا شہر ہے۔ پنجاب اور افغانستان کے درمیان آتے جاتے قافلے ادھر سے گزرا کرتے ہوں گے۔ دریا اس شہر سے لگا لگا بہتا تھا مگر جب یہ پُل بنا اور اس کے پُشتے بندھے اور بند کھڑے کیے گئے تو دریا سمٹ کر دور ہٹ گیا اور بھکر کا دامن خشک ہو گیا۔

اس علاقے کے زیادہ تر شہروں کی طرح بھکر کے بھی کچھ حصے پرانے ہیں اور باہر کی بستیاں نئی ہیں۔ ایک جانب کچے پکے آدھے ادھورے مکان، دوسری طرف وسیع کشادہ اور سرسبز کوٹھیاں، بنگلے اور نئی طرز کی عمارتیں۔

بھکر پہلے تحصیل تھی اب یہ ضلع بن گیا ہے۔ یہ سارا علاقہ کھیتی باڑی کا ہے مگر یہاں کچھ فیکٹریاں اور کارخانے بھی ہیں۔ کھیتوں میں ٹیوب ویل لگ گئے ہیں۔ ٹریکٹر چلنے لگے ہیں اور کسان خوشحال ہونے لگے ہیں۔ شہروں اور قصبوں میں اسکول کھل گئے ہیں۔ لڑکیاں کم مگر لڑکے زیادہ تعلیم پانے

لگے ہیں۔ تعلیم پھیلی ہے تو روزمرہ زندگی پر اس کا نکھار اب نظر آنے لگا ہے۔

میں بھکّر کے ایک معزز گھرانے کے بزرگ غلام اکبر خان صاحب سے باتیں کر رہا تھا، اور پوچھ رہا تھا کہ ترقی اور تعلیم کا یہاں کے معاشرے پر کیا اثر پڑا ہے؟

وہ بولے "تعلیم بہت زیادہ ہو رہی ہے اور اب ہمارے جتنے ایم پی اے یا ایم این اے بنے ہیں وہ تعلیم یافتہ ہیں اور ینگ ہیں، ینگ آدمیوں کے آنے کی وجہ سے یہاں ڈولپمنٹ زیادہ ہو رہا ہے۔ تعلیم پھیل رہی ہے۔ بہت سے لوگ بی اے ہیں۔ اس لحاظ سے ہم سمجھتے ہیں کہ ہمارے ہاں تعلیم اور ینگ بلڈ اوپر آرہا ہے۔"

میں نے غلام اکبر صاحب سے پوچھا کہ بھکّر میں لوگ ذرا ذرا سی بات پر قتل تو نہیں کر دیتے، یہاں امن وامان کا کیا حال ہے؟

"بھکّر میں امن ہے۔ قتل بہت کم ہوتے ہیں اور کوئی دشمنیاں نہیں ہوتیں، یہاں ایسے حالات نہیں ہیں۔ یہاں صرف زمینوں کے مقدمات ہوتے ہیں اور دوسرے جھگڑے نہیں ہوتے —"

غلام اکبر صاحب کے گھرانے کے نوجوان اب قومی اسمبلی اور صوبائی اسمبلی کی نشستوں پر بیٹھے ہیں۔

میرے احباب نے مجھ سے کہا کہ آپ بھکّر آئے ہیں تو اسد جعفری صاحب سے ملیے۔ بی بی سی کی اردو نشریات کے شیدائی ہیں۔ اور جس وقت ہم اُن سے ملنے اُن کے گھر پہنچے، جعفری صاحب اپنے ملازم سے کہہ رہے تھے کہ جلدی سے بازار جا کر بیٹری کے سیل لے آؤ۔ بی بی سی کا وقت ہو رہا ہے۔

اب یہ تو بتانا فضول ہے کہ وہ جب ملے تو کیسی بانہیں پھیلا کے ملے — اسد جعفری صاحب سے دیر تک باتیں ہوتی رہیں۔ وہ بتا رہے تھے کہ یہ شہر کیسا ہے، اس کے لوگ کیسے ہیں اور ان کا دریا کیسا ہے؟ "ایک زمانہ تھا جب شہر بھکّر دریائے سندھ کے کنارے آباد تھا اور تا حد نظر پانی ہی پانی ہوتا تھا لیکن اس کے بعد مسائل کچھ ایسے اٹھے کہ پل بنانے کے لیے دریا کا رُخ موڑنا پڑا اور رخ مڑنے کے بعد دریا کا وہ کنارہ جس پر بھکّر آباد تھا خشک ہو گیا۔ اس سے ہمارے کسانوں کو نقصان بھی ہوا اور ان کی مالی حالت بُری طرح متاثر ہوئی۔ تو اب وہ دریا تو یہاں نہیں ہے۔

دریا تو بہت دور چلا گیا ہے لیکن لوگ یہاں کے دریا دل ہیں۔ بڑے مہمان نواز ہیں اور غریبی کے باوجود مہمان نوازی پر دل کھول کر خرچ کرتے ہیں۔ بڑے نرم رَو اور بڑے نرم خو ہیں اور ان کا پیشہ زیادہ تر زراعت ہے اور زراعت کے حوالے ہی سے وہ اپنی زندگی گزر رہے ہیں۔"

اسد جعفری صاحب یہ ساری باتیں کرتے کرتے بولے کہ چلیے عابدی صاحب آپ کو خلیل رامپوری صاحب سے ملوائیں۔ بڑے اچھے انسان ہیں اور اچھے شاعر ہیں اور سارے شہر والے اُن سے کہتے ہیں کہ آپ کی آواز عابدی صاحب کی آواز سے ملتی ہے۔

ڈھلتی شام کی ٹھنڈی ٹھنڈی گلیوں میں چلتے ہوئے ہم ایک مکان کے دروازے پر پہنچے جہاں چراغ روشن ہو چکے تھے مگر جہاں کے مکینوں کے وہم گمان میں نہیں تھا کہ باہر سے کوئی ایسا شخص پکارے گا کہ سارا محلّہ سمجھے کہ صاحب خانہ خود کو بلا رہے ہیں۔

خلیل رامپوری صاحب کو دیر تک یقین نہ آیا۔ اس کے بعد گھنٹوں باتیں ہوتی رہیں، کچھ بھکّر کی اور کچھ دریائے سندھ کی باتیں۔ انہوں نے ایک اچھی بات کہی ــــ "دریائے سندھ اسی حیثیت میں ہے جس حیثیت میں انسان کی ریڑھ کی ہڈی ہوتی ہے۔ یہ جس علاقے سے گزر رہا ہے اس علاقے کی بھی نشاندہی کرتا ہے اور پرانے ورثے کی بھی بات کرتا ہے کہ جو قافلے سلطنت کے زمانے سے اور مغلوں کے زمانے سے چلے، اور ان قافلوں میں شامل حکیم بھی ہوتے تھے، وزیر بھی ہوتے تھے، طبیب بھی ہوتے تھے یہاں تک کہ اولیا بھی ہوتے تھے، یہی دریا ان قافلوں کی گزرگاہ بنے چنانچہ جگہ جگہ جو بستیاں ہم اس کے کنارے دیکھتے ہیں ان میں تاریخ کے قافلوں کے نشان ملتے ہیں۔

ان لوگوں کے مزار ہیں، مرقد ہیں، لمبی چوڑی قبریں ہیں۔ مثلاً بھکّر کے قریب ایک بستی میں میرا جانا ہوا، میں نے دیکھا کہ وہاں ایک بے حد قدیم مزار کی چھت تقریباً ۱۴ فٹ لمبے شہتیر پر ٹھہری ہوئی ہے۔ یہ کھجور کا شہتیر تھا۔"

کھجور کا ذکر آیا تو مجھے یاد آیا کہ دریا کے دائیں کنارے پر میں نے سڑک کے ساتھ ساتھ کھجور کے بے شمار درخت دیکھے تھے۔ میں نے خلیل رامپوری صاحب سے پوچھا کہ یہاں کھجور بہت ہوتی ہے؟

"جی ہاں۔ آپ ملتان سے بھکر کی طرف آیئے تو ایک خان پور کا علاقہ ہے، کوٹ ادو کا علاقہ

ہے وہاں تو باغات ہیں۔ ان کے علاوہ دریا کے کنارے کنارے بھی کھجور ہے اور کھجور کی ایک نسل وہ ہے جو چھوٹی سی کالی رنگت کی ہوتی ہے۔ اس میں گٹھلی نہیں ہوتی اور وہ بھی بہترین کھجور ہوتی ہے۔ تو وہ یہی ہے کہ جو قافلے آئے وہ اپنے ساتھ ایسی چیزیں لائے جنہیں وہ جان سے زیادہ عزیز رکھتے تھے اور کھجور جس میں شامل ہے، اور وہ یہ بستیوں میں لگاتے ہوئے چلے گئے ـــ جیسے ڈھکی میں آپ نے دیکھا کہ کھجور گلاب جامن سے بڑی۔ اس کا اکتوبر سے سیزن شروع ہوتا ہے۔ باقی کھجوروں کا سیزن بہت پہلے شروع ہوجاتا ہے لیکن یہ کھجور سب سے بعد میں آتی ہے اور ریڑھوں پر رکھی ہو تو یہ معلوم ہوتا ہے جیسے یہ شخص گلاب جامن بیچ رہا ہے اور یہ برآمد ہوتی ہیں۔ غیر ممالک کو جاتی ہیں۔ کراچی تک جاتی ہیں اور سعودی عرب تک جاتی ہیں اور بہت سی کھجوریں ایسی بھی ہیں جو سعودی عرب کی پیداوار کہلاتی ہیں، وہ یہاں سے جاتی ہیں اور وہاں سے زائرین بطور تحفہ لے کر آتے ہیں۔"

اس میں شک نہیں کہ تاریخ کی بوڑھی آنکھوں نے ان راستوں سے گزرتے ہوئے ان گنت قافلے دیکھے ہوں گے۔ کہنے والے تو کہتے ہیں کہ تاریخ اسلام کی برگزیدہ ہستیاں نہ صرف ادھر سے گزریں بلکہ یہیں کی خاک میں پیوست بھی ہوگئیں۔

خلیل رامپوری صاحب بتا رہے تھے: "کئی مقبرے آپ کو ملیں گے جو سندھ کے کنارے واقع ہیں۔ آپ نکل جائیں چشمے تک تو بہت مقبرے نظر آتے ہیں اور یہاں کے پرانے لوگوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ تاریخ کی نشانیاں ہیں۔ لوگوں کا ذکر آیا تو یہ بھی سن لیجئے کہ بالکل سیدھے سادے ہیں۔ لمبے لمبے کپڑے پہنتے ہیں، پگڑیاں باندھتے ہیں۔ جیسے لوگ ہیں ویسی ہی گفتگو ہے۔ ویسے ہی سادا لوگ ہیں۔ پرانا معاشرہ، پرانے لوگ، ان کے پاس پرانے زمانوں کی نشانیاں مل جاتی ہیں۔"

خلیل صاحب کی گفتگو یہاں تک پہنچی تو اسد جعفری صاحب نے بات آگے بڑھائی۔ کہنے لگے ـــ "تقریباً ہر بستی میں کوئی نہ کوئی چھوٹا یا بڑا صوفی یا پیر یا بزرگ دفن ہے اور ان کی بڑی عقیدت ہے، بڑے عرس منائے جاتے ہیں اور لوگ جوق در جوق جاتے ہیں، تو اس سے پتہ چلتا ہے کہ اُن کاروانوں اور قافلوں کے ساتھ اس قسم کے لوگ کثرت سے یہاں آتے تھے۔"

تاریخ کی ہستیوں کے بعد شعر و ادب کی شخصیتوں کا ذکر نکلا۔ اب تک بس یہی ایک موضوع بچا

تھا۔ خلیل رامپوری صاحب کہنے لگے " اب یہ مکمل شہر ہے۔ ادبیات بھی یہاں پر ہیں، شعر و شاعری کا شغل بھی یہاں پر ہے۔ میں یہاں کوئی پچیس چھبیس سال سے ہوں اور اکثر سوچتا ہوں کہ یہاں ادب اور شعر کو خوب فروغ ہوا ہے۔ ابھی کالج میں ایک تقریب ہوئی تھی۔ میرا وہاں جانے کا اتفاق ہوا تو میں نے دیکھا کہ کالج کے کوئی دس بارہ لڑکے تھے جنھوں نے غزلیں سنائیں، نظمیں سنائیں اور شعر سنائے طبیعت خوش ہوئی۔ تو ان سے ہٹ کر بھی یہاں جو محفلیں ہوتی رہی ہیں، بیس پچیس سال سے میں دیکھ رہا ہوں، جب بھی یہاں مشاعرے ہوئے۔ ان میں پندرہ بیس اچھے شاعر ضرور شامل ہوئے۔ تو یہ ایک ادب کا چھوٹا سا گہوارہ رہا ہے۔ میں تو اس کے بارے میں اکثر کہا کرتا ہوں

گلزاروں میں بسنے والے بھکّر دیس بھی دیکھ
تھل کا ریگستان بھی ہے گدڑی میں لعل لیے "

اس ایک شعر کا پڑھا جانا تھا کہ اشعار کا خزانہ کھل گیا۔ احباب نے بڑے اچھے اچھے شعر سنائے۔ اسد جعفری صاحب کے شعروں میں اپنے زمانے، اپنے حالات اور اپنے علاقے کی ساری علامتیں موجود تھیں، کہنے لگے۔

کوئی دلجوئی نہیں تھی، کوئی شنوائی نہ تھی
جیسے اہل شہر سے میری شناسائی نہ تھی

باغباں کی اِک ذراسی لغزشِ ترتیب سے
موسم گل تھا مگر گلشن میں رعنائی نہ تھی

جن سے تھی انصاف کی اُمید اہلِ درد کو
غور سے دیکھا تو اُن آنکھوں میں بینائی نہ تھی

ناخدا مجھ کو اپاہج کر گیا ورنہ اسد
آسماں اونچا نہ تھا دریا میں گہرائی نہ تھی

اسد جعفری کی طرح خلیل رامپوری بھی سادہ سہل زبان میں شعر کہتے ہیں جو اپنے دَور کی بھی تصویر ہیں اور اپنی سرزمین کی بھی:

اب کہاں پہلی سی ہمدردیاں انسانوں میں
جھاڑیاں خشک ہوئی جاتی ہیں میدانوں میں
ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے رہوگے کب تک
مکڑیاں چھت سے اُتر آئیں قلم دانوں میں
اپنے ماحول سے ہشیار رہو لے لوگو
ماچسیں بانٹ رہا ہے کوئی شیطانوں میں
شور کرتے ہیں پرندے تو اُڑا دیتے ہیں
آدمی بند کیے جاتے ہیں تہ خانوں میں

خلیل رامپوری کا کلام خاتمے کو پہنچا اور میرا ڈیرہ اسمٰعیل خان اور بھکر کا قیام بھی۔

ان علاقوں کے بارے میں میرا سارا علم کتابی تھا مجھے جو کچھ بتایا ان شہروں میں بسنے والوں نے بتایا البتہ جو کچھ کتابوں میں لکھا تھا وہ شاید بتانا بھول گئے۔ مثلاً ہندوستان اور افغانستان کے درمیان سرحد کھینچنے والے سر مورٹیمر ڈیورینڈ ۱۸۷۱ء کے پہلے روز ٹانک میں ایک حادثے میں مر گئے تھے۔ ان کی قبر ڈیرہ اسماعیل خان کے گرجا گھر کے احاطے میں موجود ہے ـــ اور بھکر! اس کی خوبی یہ ہے کہ موسم صاف ہو تو یہاں سے مغرب کی جانب تختِ سلیمان صاف نظر آتا ہے۔

اب کے جائیں گے اور موسم صاف ہوگا تو تختِ سلیمان ہم بھی دیکھیں گے!

اِدھر سورج نکلا، اُدھر بھکر سے میری ٹرین ڈیرہ غازی خان کی طرف روانہ ہوئی۔ کروڑ سے گزر کر ٹرین فراٹے بھرتی ہوئی لیّہ کی طرف چلی۔ یوں لگا کہ پنجاب کی سرزمین میں مانگ نکالتی جا رہی ہو، راستے میں جگہ جگہ گاؤں آنے لگے۔ صاف ستھرے گاؤں۔ اُن کی لپی پُتی روشن دیواریں، ان میں بسنے والے بھی ویسے ہی جن پر صبح کی پہلی دھوپ کا نکھار تھا۔ بچے سڑک کے کنارے کھڑے تھے اور اسکول جانے کے لیے شاید بس کا انتظار کر رہے تھے۔ لڑکیاں بھی نیلی قمیصیں اور صاف سفید شلواریں پہنے۔ لال دوپٹے اوڑھے اسکول جا رہی ہیں۔ یہ سب پڑھ لکھ جائیں گے تو کتنا اچھا ہوگا۔ اَن پڑھ اب شاید گاؤں کے کتّے تھے جو میری ٹرین کے ساتھ ساتھ دوڑ رہے تھے بھونکتے

ہوئے ـــــ خدا جانے کیوں؟

ذرا آگے چلے تو راستے میں باغات آ گئے جن کے درختوں کی شاخیں پھلوں کے بوجھ سے جھکی جا رہی تھیں۔ کوئلے کی بھٹیاں سلگ رہی تھیں جن سے ہلکی رنگت کا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ قریب ہی لکڑی کے ڈھیر تھے جنھیں جلا کر کوئلہ بنایا جا رہا تھا اور دوسری طرف کوئلے کے انبار بھی تھے۔

جب میں بھکّر سے اس ٹرین میں سوار ہوا تو اس کے کنڈکٹر گارڈ آ گئے۔ فرض کیجئے ان کا نام ہدایت اللہ تھا، صبح مجھے ناشتہ نہیں مل سکا تھا۔ میں بھوکا تھا۔ وہ میرے لیے پوری حلوہ لے آئے اور اپنی چائے میں بھی ساجھا کرنا چاہتے تھے مگر دوسری پیالی نہیں تھی۔ وہ لپک کر برابر کے ڈبے میں گئے اور کسی مسافر کی پیالی لے آئے۔

ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ہدایت اللہ صاحب بتا رہے تھے کہ ریلوے کی ملازمت میں ان کو کیسے کیسے پاپڑ بیلنے پڑے۔ کس طرح تیرہ سال تک وہ مال گاڑیوں کے کنڈکٹر رہے، کس طرح مال گاڑی کے بریک میں وہ اکیلے سفر کیا کرتے تھے، گارڈ کا چھوٹا سا بریک ہوتا تھا اور ساتھ اگر کچھ ہوتا تھا تو اسی مال گاڑی کے بہتر ڈبے اور بس! اس بریک میں نہ پانی ہوتا تھا، نہ بجلی، نہ کوئی ملازم اور نہ کوئی ساتھی۔ راستے میں کبھی ڈاکو ستاتے تھے کبھی چور اور کبھی پولیس والے سامان چھین لیتے تھے۔ تیرہ سال کی مشقّت کے بعد وہ پسنجر گاڑی کے گارڈ بنائے گئے جو چلتی کم اور رکتی زیادہ تھیں۔ آخر خدا خدا کرکے وہ ایکسپریس ٹرین کے گارڈ بنائے گئے ہیں اور بس! اس کے بعد ترقی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ہدایت اللہ صاحب نے خوف کے مارے اپنی گفتگو ریکارڈ کرانے سے انکار کر دیا۔

کچھ دیر بعد اس گاڑی کے ٹکٹ چیکر صاحب بھی آ گئے۔ فرض کیجیے ان کا نام محمد انوار ہے۔ وہ بھی اپنے دکھ دیر تک بتاتے رہے۔ اُن کا بیٹا بڑا ہو گیا ہے۔ پہلے ریلوے کے ملازموں کے بیٹوں کو ریلوے ہی میں ملازمت مل جایا کرتی تھی مگر اب ملازم زیادہ ہیں، اُن کے بیٹے بھی بہت ہیں اس لیے نوکری کی کوئی ضمانت نہیں ہے۔ محمد انوار صاحب بتا رہے تھے کہ اگر اپنے لڑکے کو ریلوے میں ملازم رکھوانا ہو تو اب رشوت دینی پڑتی ہے۔ کہنے لگے کہ پہلے تو اس رشوت کی رقم مقرّر تھی۔ مگر اب بولیاں لگتی ہیں۔ دس ہزار، پندرہ ہزار، بیس ہزار دیجیے تب کہیں

ملازمت ملتی ہے لہٰذا محمد انوار اب اپنے بیٹے کو ٹیچر بنوا رہے ہیں۔ ریلوے میں اس کے روزگار کا کوئی امکان نہیں ہے۔

اس دوران ہماری گاڑی لیہ سے آگے نکل گئی۔ یہاں اونچی اونچی گھاس لگی تھی۔ دور دور تک کھیت تھے۔ ریلوے لائن کے ساتھ ساتھ ایک سڑک تھی جس کی دوسری جانب دریا تھا۔ ہمارا شیر دریا!

سڑک پر فلائنگ کوچ دوڑی چلی تھی۔ فلائنگ کوچ اور سوزوکی گاڑیاں آج کی اقتصادی زندگی میں بہت اندر تک چلی آئی ہیں۔ اب وہ چلتی ہیں تو زندگی کا کاروبار چلتا ہے۔

یہاں دور دور تک درخت تھے اس سے پہلے تا حدِ نگاہ کھیت ہی کھیت تھے۔ میرے داہنے ہاتھ پر دریائے سندھ تھا جس کے پچھواڑے کوہ سلیمان کا سلسلہ چلا جا رہا تھا اور میرے بائیں ہاتھ پر تھل کا ریگستان تھا، پنجاب کا تھل — لیکن یہ ویسا ریت اڑاتا ریگستان نہیں جیسا ہم سمجھتے ہیں۔ یہاں ہریالی تھی، کھیت تھے۔ باغ اور درخت تھے۔ گرد کم تھی اور تھوڑے فاصلے پر گاؤں تھے۔ کہیں کوئی علاقہ ویران نہیں تھا۔

پھر جمن شاہ کا اسٹیشن تیزی سے آیا اور اتنی ہی تیزی سے گزر گیا۔ اس کی پیشانی پر اُردو اور انگریزی میں "جمن شاہ" لکھا ہے۔ اس عبارت کے نیچے پرانے حرف نظر آ رہے ہیں، کسی زمانے میں بھی ہندی میں بھی جمن شاہ لکھا ہوگا۔

پھر مائیکر و دیو کا بہت بڑا اسٹیشن آ پہنچا۔ اس کے ٹاور کے نیچے ایک اسکول تھا اور قدیم گاؤں کے سارے بچے جدید ٹیکنولوجی کے ستون تلے باہر کی ہلکی ہلکی دھوپ میں بیٹھے پڑھ رہے تھے۔ اندر جماعتوں میں یقیناً شدید سردی ہوگی۔ یہاں جمن شاہ میں بھی کھیت ہیں جن کی مینڈھیں بن رہی تھیں۔ زمین ہموار کی جا رہی تھی اور غالباً اگلی فصل بونے کی تیاری تھی۔

اس کے بعد ریت کے ٹیلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا لیکن اُن پر اونچی گھاس لگی تھی جس سے یہ ریت اڑتی نہیں البتہ جیسے جیسے ہماری گاڑی آگے بڑھتی گئی، ہوا میں ریت بھی بڑھتی گئی۔ دریا شاید دور نکل گیا تھا۔

وہاں سے ٹرین دائرہ دین پناہ ہوتی ہوئی کوٹ ادو پہنچی۔ وہاں سے اس کا رُخ بدلا۔ یہ واپس لوٹی

اور لائین بدل کر دریا پار اترنے لگی اور پھر دریا کے دائیں کنارے پر چلتی ہوئی ڈیرہ غازی خان پہنچی۔ اُسی ڈیرہ غازی خان، جسے اسّی سال پہلے دریا بہالے گیا اور لوگوں نے دس بارہ میل پرے ہٹ کر نیا شہر بسایا۔

اب وقت آگیا تھا کہ اس سرزمین کو دیکھا جائے اور اس میں بسنے والوں کا حال جانا جائے۔ وہاں بہت اوپر ہمالیہ کے پچھواڑے لداخ سے چل کر دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا میں ڈیرہ غازی خان پہنچا تو احساس ہوا کہ بہت تاخیر سے پہنچا۔ مجھ سے پہلے بے شمار قافلے، کاروان، لشکر، سپاہ سالار، جرنیل اور فاتحین یہاں پہنچ چکے تھے اور ڈیرہ غازی خان کی سرزمین کے سادہ ورق پر اپنے اپنے نشان چھوڑ چکے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ زمانے کی تند ہوائیں اور برساتی کی تیز رو رود کوہیاں وہ سارے نشان بہا کر لے گئیں۔ اس خطے کی تاریخ محفوظ نہ ہو سکی اور نہ شاید ہو سکے گی کیونکہ آج بھی ڈیرہ اسماعیل اور ڈیرہ غازی خان کے میدانوں میں کتنے ہی عظیم قلعوں، محلوں اور شہروں کے کھنڈر ویران پڑے ہیں اور ان میں یا تو سائیں سائیں کرتی ہوئی ہواؤں کا گزر ہوتا ہے یا سال کے سال بہنے والے برساتی پانی کے ریلوں کا یا پُرانے زمانے کے پتھر، موتی اور زیور تلاش کرنے والوں کا۔ تاریخ داں ادھر بہت کم آتے ہیں۔ محکمۂ آثار قدیمہ والوں کو شاید کوہ سلیمان کے دامن میں بکھری ہوئی تاریخ کی اِن نشانیوں کی خبر بھی نہیں۔

آئیے آج ڈیرہ غازی خان کی تاریخ کی گفتگو کریں اور آج ہم بات کر رہے ہیں شہر کے ایک بزرگ صحافی سردار محمود خان بوزدار صاحب سے جو پچھلے تیس برسوں سے ڈیرہ غازی خان سے ہفت روزہ بلال شائع کر رہے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ قدیم تاریخ میں اس علاقے کے واقعات ملتے ہیں یا نہیں؟

جواب ملا ــــ "تاریخ میں جو کچھ واقعات آئے وہ سکندر کے حملے کے وقت آتے ہیں کہ سکندر جب حملہ آور ہوا ہے اور واپس جا رہا تھا تو ہڑنگ کے قلعے پر آیا۔ ہڑنگ اُس وقت دارا کی بیٹی نوشابہ کی جاگیر میں تھا۔ یہیں رہتی تھی۔ یہیں اس کی شادی ہوئی تھی۔"

اس کے بعد اس علاقے پر یونانیوں کی اور پھر ہندوؤں کی حکومت رہی۔ یونانی دور کے آثار تو نہیں ملتے مگر ہندو دور کے نوادر اب تک میدانوں میں بکھرے پڑے ہیں۔

سردار محمود خان صاحب نے بتایا ـــ "ہندوؤں کے زمانے میں ایک راجا دِتورائے تھا۔ اس کے شہر کے آثار اب کھنڈروں کی صورت میں ہیں۔ پتہ نہیں وہ شہر زلزلے سے تباہ ہوا یا دریائے سندھ کے پانی نے اسے تباہ کیا یا رود کوہیوں نے ـــ بہرصورت وہ شہر تباہ ہوگیا لیکن اب تک وہاں سے نوادر مل رہے ہیں۔ گندم اور چاول کے دانے تک صحیح صورت میں نکل آتے ہیں بعض قیمتی اشیاء، مثلاً زیورات اور مٹی کے برتن وغیرہ بھی برآمد ہوتے رہے ہیں ـــ"

ان میں سے کچھ چیزیں بہاولپور کے عجائب گھر میں محفوظ ہیں۔

دتورائے کے بعد یہاں راجا داہر کی حکومت ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب عربوں نے یہاں پہنچنا شروع کیا۔ اور یہ بات محمد بن قاسم سے بھی پہلے کی ہے۔ بوزدار صاحب بتا رہے تھے "محمد بن قاسم سے بھی قبل یہاں پر عربوں نے جب ہنوں فتح کیا تو اُس وقت یہ علاقہ بھی انھوں نے فتح کرلیا چنانچہ یہاں پر ایک ندی کا ہاہے اس کے درّے پر سات قبریں ہیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ صحابہ کی قبریں ہیں۔"

محمد بن قاسم کے بعد یہاں اسلامی مملکت قائم ہوئی اور صدیوں بعد بلوچ قبیلے یہاں پہنچنے شروع ہوئے۔ انتظام کی رو سے یہ علاقہ پنجاب میں سہی مگر تاریخ کے اعتبار سے اس پر بلوچوں کی بہت گہری چھاپ ہے۔

محمود خاں صاحب، جن کا تعلق بوزدار قبیلے سے ہے بتا رہے تھے "پندرہویں صدی عیسوی میں یہاں پر بلوچ قبائل آنے شروع ہوئے۔ ان میں ایک میرانی قبیلہ تھا۔ نواب احمد خان خانِ قلات کہتے ہیں کہ وہ دراصل میروانی قبیلہ تھا۔ میروانی قبیلے کی شاخ اب بھی بلوچستان میں ہے اور خود خان قلات کا تعلق اسی قبیلے سے ہے۔ تو ان کی حکومت پندرہویں صدی سے لے کر اٹھارہویں صدی تک رہی۔ ان کے ۱۳ حکمران ہوئے۔ وہ باری باری غازی خان اور حاجی خان کہلائے اور ان ہی ناموں سے مشہور ہوئے۔ آخری حکمران کمسن بچّہ تھا۔ اس کے ایک وزیر محمود خان گوجر نے غداری کرکے کلہوڑوں کو سندھ سے یہاں بلوالیا اور اس بچارے بچّے کو ان کے حوالے کردیا۔ اسے وہ حیدر آباد لے گئے۔ اس کی قبر بھی وہیں حیدر آباد میں ہے۔"

عجیب تاریخ ہے اس علاقے کی۔ اس میں غداری کی داستانیں بھی ملتی ہیں اور اس میں وطن پرستی

اور قوم پرستی کے قصّے بھی بھرے پڑے ہیں۔

ہاں تو ڈیرہ غازی خان پر کلہوڑوں کا قبضہ رہا۔ پھر خان قلات کا قبضہ رہا۔ ان کے گورنر نے یہ علاقہ حاکم بہاولپور کو بیچ دیا۔ اُن سے یہ علاقہ سکھوں نے چھینا مگر بعد میں نواب بہاولپور کو اجارے پر دے دیا۔ مطلب یہ کہ کھاؤ، کماؤ مگر اس میں سے ہمارا حصّہ ہمیں دیتے رہو۔ بعد میں بہاولپور والوں نے یہ علاقہ سکھوں کو دے کر اُن سے بہاول نگر کا علاقہ لے لیا۔ سکھ حکمرانی کرنے آئے تو بلوچوں نے تلواریں سونت لیں اور کھوسہ قبیلے نے یہ علاقہ سکھوں سے چھین لیا۔ یہاں تک تو ٹھیک تھا لیکن انھوں نے یہ سرزمین انگریزوں کے حوالے کر دی۔ انگریزوں کو کسی جنگ کی زحمت بھی نہیں کرنی پڑی مگر بلوچوں نے پھر آزادی کی تحریکیں چلائیں، پھر حملے کیے، پھر غدّاریاں ہوئیں اور پھر بہادر مارے گئے ــــ بڑی مشکل سے صلح ہوئی۔ اس کے بعد کا حال محمود خان صاحب یوں بیان کرتے ہیں :

"اس کے بعد اسلحہ کی جنگ تو ختم ہو گئی پھر یہاں کے لوگوں نے انگریزوں کے خلاف عدم تعاون کی تحریک شروع کی۔ اس عدم تعاون تحریک کا لیڈر سردار محمد اسلم خان تھا۔ اس نے ۱۹۰۰ء میں یہ تحریک شروع کی۔ ۱۹۱۴ء تک وہ تحریکیں چلتی رہیں۔ ۱۹۱۵ء میں انگریزوں نے اُسے جلا وطن کر کے یہاں سے نکال دیا۔ وہ افغانستان جا کے رہا اور فوت بھی وہیں ہوا۔ یہ وہ دور تھا جب ہندوستان میں ابھی ترکِ موالات کی تحریک شروع نہیں ہوئی تھی لیکن اُس نے اس سے قبل ہی یہ سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔"

سردار محمد اسلم خان کو اب دنیا بھول بھال گئی ہے۔ مجھے یاد تھا کہ اس نے غریبوں کی اقتصادی حالت بہتر بنانے کے لیے ایک تحریک چلائی تھی۔ میں نے محمود خان صاحب سے تصدیق چاہی۔ وہ بولے ــــ "جی ہاں۔ سردار محمد اسلم خان نے ایک بینک قائم کیا تھا اس میں پیسہ وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ اُس میں اناج، بھوسا اور ہر قسم کی زرعی پیداوار کی چیزیں رکھی جاتی تھیں۔ وہ جن کے پاس فالتو ہوتی تھیں اُن سے لیکر ان کا اندراج رجسٹر پر کر دیا جاتا تھا اور وہ غلّہ وغیرہ ضرورت مندوں کو دے دیا جاتا۔ اور پھر فصل کے موقع پر اُن سے واپس لے لیا جاتا تھا۔"

اُس زمانے میں یہ زمینیں اپنے غریب باشندوں کو اناج اور بھوسے کے سوا کچھ نہ دیتی تھیں۔ آج یہی زمینیں یہاں کے باشندوں کے لیے معدنیات کے خزانے اگلنے کو بے چین ہیں مگر انسان کی بے حسی نے زمین کی بے چینی پر غلبہ پالیا ہے۔

جپسم، یورینیم، لوہے، گندھک اور کوئلے کی دبیز تہیں دفن ہیں کہ کوئی آئے اور انہیں دن کا اجالا دکھائے۔ بس ایک دفعہ ایک صاحب آئے تھے۔ محمود خان صاحب نے مجھے بتایا — "کراچی میں جب اسٹیل مل لگ رہی تھی تو اس سے پہلے ایک ماہر معدنیات فاروقی صاحب یہاں آئے تھے۔ وہ کوئلہ تلاش کر رہے تھے مگر انہیں لوہا مل گیا۔ اس لوہے کو نکال کر انہوں نے اس کے کچھ نمونے پنجاب یونیورسٹی کو بھی بھیجے اور بہت سے نمونے جرمنی بھیجے۔ وہ ایسا لوہا تھا کہ جرمنی والوں نے نمونے کے طور پر اس کی ایک کار بنا کر بھیج دی۔ لیکن ہماری اسٹیل مل والوں نے اس لوہے کو استعمال کرنے کی بجائے درآمد شدہ لوہا منگانے کا فیصلہ کیا۔ وہ کوک بھی درآمد کرتے ہیں اور لوہا بھی درآمد کرتے ہیں —"

مقامی باشندے پورے وثوق سے کہتے ہیں کہ ڈیرہ غازی خان کے خام لوہے میں ۳۲ سے ۴۰ فی صد تک اور کہیں کہیں تو پچاس سے ساٹھ فی صد تک لوہا موجود ہے لیکن سرکاری ریکارڈ میں ایک اور واقعہ محفوظ ہے۔ آج کی یہ آخری بات سردار محمود خان بوزدار صاحب کی زبانی سنیئے۔ کہنے لگے — ۱۹۶۶ء میں ہمارے علاقے کے ایک ممبر اسمبلی تھے سردار منظور احمد خان قیصرانی۔ انہوں نے ایوان میں سوال پیش کیا تھا کہ ڈیرہ غازی خان میں معدنیات نکالنے کے لیے کیا کام ہو رہا ہے۔ اس کا جواب اسمبلی میں یوں دیا گیا کہ ڈیرہ غازی خان میں معدنیات ہیں ہی نہیں۔"

یہاں آکر بوزدار صاحب خاموش ہوگئے اور پھر کچھ سوچ کر بولے: "یہ علاقہ حکومت کی بے پروائی اور بے التفاتی کا نشانہ ہے ورنہ بہت زیادہ امکانات ہیں بشرطیکہ وہ کام میں لائے جائیں۔ پاکستان کے لیے یہ بہت قیمتی اثاثہ ہوگا —"

بلوچستان بلوچستان

جس روز میں ڈیرہ غازی خان پہنچا مجھے معلوم نہیں تھا کہ شہر میں کس سے ملاقات ہوگی، مجھے فکر تھی کہ کون میرا میزبان اور رہنما ٹھہرے گا۔ اور تشویش تھی کہ رات قیام کہاں ہوگا۔

اسٹیشن پر اتر کر سب سے پہلے میری ملاقات سوچیے کس سے ہوئی ہوگی۔ وہی شخص جو گیٹ پر کھڑا مسافروں سے ٹکٹ لیا کرتا ہے۔ جوں ہی میں نے بتایا کہ کون ہوں اور کہاں سے آیا ہوں، یوں لگا کہ میرے لیے اسٹیشن ہی کا نہیں، دلوں کا گیٹ بھی کھول دیا گیا۔ ٹکٹ کلکٹر صاحب نے اتنی گرمجوشی سے ہاتھ ملائے کہ ساری فکر دور اور ساری تشویش رفع ہوگئی۔ کہنے لگے کہ ڈیرہ غازی خان آنا مبارک ہو۔ ہم آپ کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

میں نے کہا — "سنیئے۔ آپ کے شہر میں کوئی کالج ہوگا؛ میں وہاں جانا چاہتا ہوں —"

انہوں نے جھٹ ایک نوجوان کو آواز دی: "دیکھو، عابدی صاحب کو تانگے پر بٹھاؤ۔ تانگے والے سے کہو کہ انہیں ڈگری کالج لے جائے اور تین روپے سے زیادہ نہ لے —"

اگلے ہی لمحے میرا تانگہ ڈیرہ غازی خان کی سڑکوں پر دوڑ رہا تھا سرسبز شہر، اچھا خاصا نیا، کشادہ اور صاف ستھرا — نیچی عمارتیں۔ دکانیں ہی دکانیں۔ بڑھئی۔ کاریگر، ریڈیو ٹی وی کی مرمّت والے، کمہار، ٹوکریوں اور ہاتھ کے پنکھوں والے، پنواڑی، ٹائپسٹ، فوٹو کاپی، فوٹوگرافر، غرض یہ کہ اس شہر میں ہر پیشے والے نظر آئے۔

پھر قدم قدم پر بینر دکھائی دیئے۔ شہر میں اگلے روز بلوچوں کا کوئی بڑا کنونشن تھا۔ پہاڑوں سے اتر کر سینکڑوں بلوچ آگئے تھے اور اگلے روز کے بڑے جلسے کی تیاریاں تھیں۔ ایک بینر پر لکھا تھا:

از مکران تا ڈی جی خان

بلوچستان۔ بلوچستان

—— تھوڑی دیر بعد میں ڈیرہ غازی خان کے ڈگری کالج پہنچ گیا۔ ایک استاد سے اپنا تعارف کرایا۔ لمحہ بھر میں خبر پھیل گئی کہ میں آیا ہوں اور دیکھتے ہی دیکھتے بہت سارے استاد آگئے۔ اجنبیت ختم ہوئی۔ کچھ بھی نیا اور پرایا نہ رہا۔ اب مسئلہ یہ نہیں تھا کہ کہاں قیام کروں اور رات کہاں گزاروں اب مسئلہ یہ تھا کہ اتنے بہت سے عزیزوں میں سے کس کی میزبانی قبول کروں اور رات کے قیام کے لیے کس کے اصرار کے آگے اپنی جبیں ٹیکوں۔

آخر طے پایا، اور سب ہی اس پر متفق ہوگئے کہ پروفیسر شریف اشرف صاحب کے ہاں پڑاؤ ہوگا۔ کالج کے کیمپس ہی میں ان کا مکان تھا۔ سارے نئے، اچھے اور آرام دہ مکان تھے۔ اکثر کے سامنے اسکوٹر اور کاریں کھڑی تھیں۔ کہیں کہیں ایئر کنڈیشنر لگے تھے۔ گھروں میں ٹیلیویژن چل رہے تھے اور نہائے دھوئے صاف ستھرے لوگ بھلے لگ رہے تھے۔

شریف اشرف صاحب کے مکان میں داخل ہوتے ہی برآمدے میں ایک انوکھی چیز دیکھی۔ ایک اتنی بڑی چارپائی، بلکہ پلنگ، جس پر ایک دو افراد نہیں، سارا کنبہ لیٹ رہے تب بھی جگہ بچ جائے۔

میں حیرت سے بولا —" یہ کیا ہے؟—"

انہوں نے خوشی سے جواب دیا —" ہماچی "

میں نے کہا —" اتنی بڑی؟ —"

انہوں نے کہا " یہ تو چھوٹی ہے، ہماچی کہلاتی ہے۔ اس سے بھی بڑا ہماچا ہوتا ہے۔ اس پر تو پورا محلہ بیٹھ سکتا ہے —"

—— اس کی تفصیل آگے آئے گی۔

میں نے وہاں پہنچتے ہی فرمائش کی کہ شہر میں کچھ لوک گانے والے یا ساز بجانے والے ہوں تو ان کے پاس چلیں۔ انہوں نے کہا کہ جانے کی کیا ضرورت ہے؟ —— یہیں بلوائے لیتے ہیں۔ چنانچہ الغوزہ اور بنجو بجانے والے سازندوں کو پیغام بھجوا دیا گیا۔ جواب آیا کہ وہ ٹھیک سات بجے پہنچ جائیں گے۔ سات بجے۔ پھر آٹھ —— پھر نو —— مگر سازندے نہیں آئے۔ اُس وقت اتفاقاً کوئی گھر کے باہر نکلا تو دیکھا کہ سازندے گیٹ کے سامنے کھڑے ہیں۔ دروازوں پر دستک دینا بد تہذیبی ہوتی لہٰذا وہ کھڑے

انتظار کر رہے تھے کہ کوئی گھر سے باہر آئے تو اندر خبر کرائیں کہ وہ آگئے ہیں۔

ڈیرہ غازی خان کے ان باشندوں کو دیکھ کر میں گہری سوچ میں پڑ گیا اور پھر جو اہل علم سے گفتگو ہوئی تو حال کھلا کہ دو چیزوں نے ان لوگوں کے سارے رویّے اور پورے طرزِ عمل پر بڑی گہری چھاپ لگائی ہے۔ ایک تو جاگیرداروں نے، دوسرے برساتی نالوں نے۔ جاگیرداری، تُمن داری اور سرداری کے نظام نے ان لوگوں کو صدیوں ننگا بھوکا رکھا اور ان کی عزتوں کو ایڑی تلے روندا اور برساتی نالوں یا آبپاشی کے رود کوہی نظام نے ان کی یہ حالت کر دی کہ بیٹھے آسمان کو تکا کرتے تھے کہ بادل آئیں گے، بارش برسے گی، پہاڑوں سے بہ کر پانی میدانوں میں آئے گا، کھیت سیراب ہوں گے تب کہیں جا کر فصل اُگے گی۔

دریائے سندھ اس علاقے سے لگا لگا بہتا ہے مگر یہ لوگ کہتے ہیں کہ دریا کا منہ زور پانی آبادی کم اور بربادی زیادہ کرتا ہے۔ چنانچہ پسماندگی اس علاقے کا مقدر بن گئی اور ان لوگوں کی شہرت یہ ٹھہری کہ سست اور کاہل ہوتے ہیں۔ بڑے بڑے پلنگوں پر بیٹھے رات دن باتیں کیا کرتے ہیں اور قصّے کہانیاں کہا کرتے ہیں۔

اس پسماندگی نے انہیں مذہب اور قدامت پرستی سے اور قریب کر دیا اور اپنے دکھوں کے علاج ڈھونڈنے کے لیے وہ پیروں کے آستانوں اور فقیروں کے مزاروں پر جانے لگے۔

میں نے پروفیسر شریف اشرف صاحب سے پوچھا "آپ بتائیے۔ ڈیرہ غازی خان کے لوگ کیسے ہیں؛ اُن کی زندگی کیسی ہے، رسم درواج کیسے ہیں؛ اور تمدّن کیسا ہے؛ —"

ان کا جواب سیدھا سادا تھا — "یہاں پیروں فقیروں کے مزارات بہت زیادہ ہیں۔ تونسہ ہے۔ پیر عادل ہے۔ دائرہ دین پناہ ہے۔ سخی سرور ہے۔ کوٹ مٹھن کے خواجہ فرید ہیں۔ اس کے علاوہ چونکہ زرعی سماج ہے اس لیے لوگوں کو میلے ٹھیلے کا شوق بہت زیادہ ہے۔ کچھ حد تک ان کی اقتصادی درماندگی آڑے آتی ہے لیکن اس کے باوجود خصوصاً چیت کے موسم میں خاصے عوامی میلے ہوتے ہیں جن میں یہ لوگ پورے جوش و خروش کے ساتھ حصّہ لیتے ہیں۔ ان میں ان کے پرانے کھیل بھی ہوتے ہیں۔ مثلاً ہاتھ کو پکڑ لیتے ہیں اور زور آزمائی کرتے ہیں۔ ایک اپنی طرف کھینچ رہا ہوتا ہے دوسرا اپنی طرف۔ اسی طرح بوجھ اٹھاتے ہیں، بڑے بڑے بھاری پتھر اٹھانے کا مقابلہ ہوتا ہے۔

پتھر نہ صرف اٹھاتے ہیں بلکہ اوپر اچھالتے ہیں۔ پھر ان کا کبڈی جیسا ایک کھیل ہے جسے دودا یا بلارو کہتے ہیں۔"

پروفیسر صاحب کہے جا رہے تھے۔" ہمارے گاؤں میں مجھے یاد ہے، اور میری عمر اتنی زیادہ لمبی نہیں، قریب قریب ہر رات ہر ایک گاؤں میں وساق ہوتا ہے جہاں لوگ اکٹھے ہوتے ہیں رات کو، حقہ پیتے ہیں، گفتگو کرتے ہیں مختلف مسائل پر۔ وہ یوں کہیئے کہ ایک کلچرل سنٹر ہوتا ہے۔ وہاں قصے سناتے ہیں، مثالیں ہوتی ہیں مختلف قسم کی ــــ اور وہاں مالش بھی ہو رہی ہے۔ گیت بھی گائے جا رہے ہیں۔ بگڑو بھی سنائی جا رہی ہے۔ یہ سب ہمارے علاقے کے گیت ہیں مثلاً بگڑو ــــ اور لُڑھاو۔ مجھے یاد ہے کہ جب ہم چھوٹے تھے اُن دنوں یہاں ٹرانسپورٹ کا نظام اتنا اچھا نہیں تھا۔ یہاں قافلے گزرا کرتے تھے اونٹوں کے۔ اُن پر جوار لدی ہوتی تھی اور تبادلہ ہوا کرتا تھا اجناس کا۔ دریا پار کے لوگ جوار کی فصل لے جاتے تھے اور جب ان کی گندم پکتی تھی تو وہ واپس لاتے تھے۔ تو یہ جو قافلے آتے جاتے تھے تو خاص راگ میں گاتے تھے جو پہاڑی سے ملتا جلتا ہوتا تھا۔ اس کو وہ لوگ لُڑھاؤ کہتے تھے۔

اور اسی طرح وہاں شادی بیاہ کے موقع پر گیت ہوا کرتے تھے جنہیں سَمّی کہتے تھے۔ اور گیت بہت تھے۔ فصل کٹنے کے گیت ہوتے تھے ــــ اسی طرح یہاں ڈیرہ غازی خان سے جب ہم ملتان جایا کرتے تھے، اب تو خیر یہ پُل بن گیا ہے، پہلے یہاں اسٹیمر چلا کرتا تھا اور بالعموم ایسا ہوتا تھا کہ اسٹیمر پھنس گیا ہے دریا میں۔ تو وہاں اس اسٹیمر کو نکالنے کے لیے لوگ مختلف بول گایا کرتے تھے۔ عجیب و غریب قسم کے۔ خاصی ان سے تحریک سی پیدا ہوتی تھی اور وہ اسٹیمر کو نکالنے میں کامیاب ہو جاتے تھے۔ سب مل کر گاتے تھے اور ہر بول ہیُ شا پر ختم ہوتا تھا مثلاً زور لگا کے ہیُ شا۔ گہرا پانی ہیُ شا۔ بس یہی رزمیہ آہنگ تھا جو ان میں تحریک پیدا کرتا تھا۔

پھر جب یہ نہریں لگاتے تھے اپنی زمینوں کو سیراب کرنے کے لیے تو وہاں آواز لگتی تھی ــــ "الہوالہ دمبو بھابلک" کہاں سے یہ لفظ نکلے، کچھ پتہ نہیں۔ غالباً اللہ اللہ دم بہاؤ الحق کی یہ بگڑی ہوئی شکل تھی۔ یہ ملتان کے بزرگ کا نام نامی تھا جو غالباً اس میں آتا تھا۔

تو میں سمجھتا ہوں کہ یہاں زندگی میں دینی اثرات اور وادیٔ سندھ، جس کا ایک حصہ اسے کہا جاتا ہے، اس کے قدیم ثقافتی اثرات کا گہرا رچاؤ ہے۔

رقص ان کے اپنے ہیں جنہیں یہ جھومر کہتے ہیں، بلوچی جھومر بھی ہے، علاقائی جھومر بھی ہے اور خاصا خوبصورت سماں پیدا کرتا ہے۔ اس کے ساتھ چمٹے ہوتے ہیں اور دوسرے ساز ہوتے ہیں، انہیں بجاتے ہیں اور رقص کرتے ہیں۔ بہت وجد آفریں تاثر ہوتا ہے۔

اسی طرح جب کنواں چلا رہے ہوتے ہیں یا جب بھینسوں کو لے کر دریا کے علاقے میں چرانے کے لیے لے کر جاتے ہیں تو اُن کے بھی اپنے گیت، اور اپنی آوازیں تھیں۔

تو اس علاقے کی اپنی ایک ثقافتی پہچان ہے اور اس کو میں سمجھتا ہوں کہ محفوظ ہونا چاہیئے۔"
شریف اشرف صاحب کا بیان اپنے منطقی انجام کو پہنچا۔

یہ محنت کش لوگ، یہ غریب لوگ زندگی کے ایسے کٹھن دن دیکھ چکے ہیں جب ان کا اناج جاگیردار چھین کر لے جاتے تھے۔ گوشت اتنا مہنگا تھا کہ اس کے یہ متحمل نہیں ہو سکتے تھے چنانچہ ان کی عمریں ساگ کھاتے کھاتے گزرتی تھیں اور ساگ بھی شاید برساتی نالوں کے کنارے خود ہی اُگ آتا ہوگا۔

ڈسٹرکٹ اسپتال، ڈیرہ غازی خان کے ڈینٹل سرجن نظام فرید صاحب نے اس پوری صورتحال کا نقشہ کھینچ دیا۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ اس علاقے میں ساگ کی مقبولیت کا کیا قصہ ہے؟

ہنس کر بولے ــــ" ساگ! ساگ جی گُنّے (ہنڈیا) کے اندر پکاتے ہیں اور خواتین اس کو ڈوئی کے ساتھ گھوٹتی رہتی ہیں اور کیونکہ یہاں پر سب سے سستی سبزی ساگ ہی ہے، تو لوگ بعض اوقات گندم کی بجائے ساگ سے ہی پیٹ بھرنے کے متحمل ہو سکتے ہیں۔ اس وجہ سے ساگ بڑی محبت اور اہتمام سے کھایا جاتا ہے، ساگ اور دال یہاں کی بہت مقبول غذا ہے ــــ"

میں حیران تھا کہ اس شہر کے باشندے گوشت نہیں کھاتے تھے۔ باتوں باتوں میں پتہ چلا کہ شہر والے سب کے سب کاریگر ہوتے تھے۔ اُن کی عورتیں بھی کام کرتی تھیں، اتنا کام کہ کھانا پکانے کی فرصت نہیں ہوتی تھی اور کھانا بازار سے آتا تھا۔ اُس میں گوشت یقیناً ہوتا تھا مگر جانور کے بدن کے صرف اُن حصّوں کا گوشت جو عموماً بیکار سمجھ کر پھینک دیئے جاتے ہیں۔

الیکزانڈر برنس جب ۳۰-۱۸۳۶ء میں ڈیرہ غازی خان گیا تھا تو شہر میں ۱۵۹۷ دکانیں تھیں

جن میں چالیس دکانیں طباقیوں یعنی نان بائیوں کی تھیں۔ الیگزانڈر برنس یہ نہ لکھ سکا کہ شہر میں وہ بڑی بڑی چارپائیاں کتنی تھیں جنہیں لوگ ہماچی کہتے ہیں۔ میں نے نظام فرید صاحب سے پوچھا کہ قدیم روایات کے بارے میں بتائیے اور یہ بتائیے کہ اس ہماچی کا کیا قصّہ ہے۔

وہ سارا قصّہ سنانے لگے — "بہت بڑی ایک چارپائی ہوتی ہے اور بعض اوقات درخت کے تنے کے اس کے پائے اور لمبے لمبے سے اس کے بازو ہوتے ہیں۔ اس پر کبھی کبھی چالیس پچاس آدمی بھی بیٹھ جاتے ہیں اور وہاں بیٹھ کر مجلس کرتے ہیں۔ تو ایک تو یہ چیز ہے۔

اور یہاں کی ثقافت کی دوسری قدیم چیز طباق ہے۔ یہاں طباقی ہوتے ہیں یعنی طعام گھر — یہاں پر بڑے بڑے مٹکوں میں یا گُنّوں میں وہ سالن بناتے ہیں۔ عام طور پر جانوروں کا فالتو گوشت مثلاً سری ہو گئی، پائے ہو گئے، یا اوجھڑی ہو گئی۔ اس قسم کی چیزیں جو یہاں کے پُرانے لوگ بآسانی خرید سکتے ہیں، تو وہ بنایا کرتے تھے کیونکہ اس وقت یعنی قیامِ پاکستان سے پہلے اقتصادی حالات اچھے نہیں تھے۔

میں یہ پہلے بتانا بھول گیا کہ یہاں پر زیادہ تر کاریگر اور دستکار لوگ رہتے تھے۔ یہ شہر کی بات کر رہا ہوں۔ یہاں کے بلوچ باشندے اکثر باہر سے آ کر آباد ہوئے۔ تو کَئی (کاریگر) لوگوں کی عورتیں اور مرد اکثر سارا دن کام کرتے رہتے تھے۔ جوتے بنانا، لنگایں بنانا، کاشی کاری، برتن بنانا اس قسم کے اَور کام مثلاً پتّوں سے ٹوکریاں وغیرہ بنانا۔ تو سب عورتیں اور مرد مصروف رہتے تھے جب دوپہر کا وقت ہوتا تھا اور عورتیں چونکہ کھانا نہیں بنا سکتی تھیں تو وہ ایک بڑی سی سینی کے اندر چھوٹی چھوٹی دس پندرہ بیس کٹوریاں بھیج دیا کرتی تھیں اور طباقی کی دکان سے وہ سالن اور روٹی منگا لیا کرتی تھیں اور اس طرح گھر کے لوگ کھا لیا کرتے تھے۔ وقت کی بچت ہو جاتی تھی۔

اس کے علاوہ جو کچھ ہر مرد، ہر عورت یا ہر بچّہ کماتا تھا وہ الگ الگ لوٹے کے اندر اپنے پیسے جمع کرتے جاتے تھے۔ عورتیں عموماً اُس سے سونا خرید لیا کرتی تھیں۔ باقی لوگ اس پیسے کو روزمرّہ مصرف میں لاتے تھے۔ چنانچہ ان کی زندگی کا معیار اونچا نہ ہو سکا —"

دن ختم ہو رہا تھا۔ ہماری باتیں بھی اپنے خاتمے کو پہنچ رہی تھیں۔ مگر ہماچی کا ذکر ابھی جاری تھا۔ وہی بڑی سے چارپائی جو شاید ان لوگوں کی ترقی کی راہ میں بڑی سی دیوار ثابت ہوئی۔ نظام فرید

صاحب بتا رہے تھے :

"میں چھوٹا سا تھا، اپنے گھر سے نکل کر تعلیم حاصل کرنے گیا۔ تو ہمارے محلے میں ایک بڑی چارپائی پڑی تھی جس پر میں شام کو بچوں کے ساتھ کھیلتے کھیلتے سو جایا کرتا تھا۔ بہت دیر سے میری آنکھ کھلتی تھی اور میں روتا پیٹتا گھر پہنچتا تھا۔

تو چھوٹا سا تھا میں جب گھر سے نکلا، مجھے یاد ہے کہ پندرہ بیس سال مختلف علاقوں میں تعلیم حاصل کرتا رہا، لمبے عرصے بعد جب میں گھر آیا تو آپ حیران ہوں گے کہ جن لوگوں کو میں جس ہماچی پر بیس سال پہلے دھوتی باندھ کے، پیٹ نکال کے بیٹھا ہوا چھوڑ گیا تھا، بیس سال کے بعد جب آیا تو وہ لوگ وہیں بیٹھے ہوئے وہی باتیں کر رہے تھے جو بیس سال پہلے کر رہے تھے۔ تو بیس سال کے اندر ان کے بال تو سفید ہو گئے لیکن ان کی زندگی کے اندر اور انداز فکر کے اندر کوئی فرق نہیں آیا۔

میرا خیال ہے کہ یہ ساری ہماچی کی مہربانی ہے کہ اُس نے ان لوگوں کو اتنا سست بنا دیا۔ ان لوگوں نے ہماچی کو عزیز رکھا اور اپنی ترقی کو گنوا دیا ——"

ڈیرہ غازی خان میں اُس روز بلوچستان والوں کا کنونشن تھا۔ ایک بڑی عمارت کے لمبے چوڑے دالان میں شامیانے لگائے گئے تھے، کرسیاں ڈالی گئی تھیں۔ اسٹیج سجائے گئے تھے اور فضا میں آوازیں گونج رہی تھیں۔ کچھ احتجاج کی آوازیں، کچھ شکایتوں کی اور کچھ مطالبوں کی آوازیں اور کچھ پہاڑوں سے اتر کر دریائے سندھ کے کنارے آنے والے سازندوں اور گلوکاروں کی آوازیں جن کی تپی ہوئی رنگت، گتھی ہوئی سیاہ ڈاڑھیاں، ویسی ہی کالی پلکیں، گھنی بھنویں اور آنکھوں میں ایسی لکیریں جیسے سُرمہ پھیرا گیا ہو اور رنگوں کی دھنک پر اُس روز نغمے گونج رہے تھے۔

بلوچستان کا کنونشن تھا۔ بلوچستان کا تذکرہ تھا کہ یہ پاکستان کا سب سے بڑا مگر سب سے پسماندہ صوبہ ہے۔ کسی کو اس پر توجہ نہیں، کوئی اِدھر دھیان نہیں دیتا۔ نہ سڑکیں ہیں۔ نہ بجلی ہے۔ نہ پینے کا پانی ہے۔ نہ پیٹ بھر کر کھانے کو ہے۔ زمین میں معدنیات بھری پڑی ہیں انہیں نکالتے نہیں اور جو قدرتی گیس کے ذخیرے اُبل رہے ہیں، جن کے عوض سارا ملک اربوں کھربوں روپے دے رہا ہے وہ روپے بلوچستان کو نہیں لوٹائے جا رہے ہیں۔ وہ کہیں اور خرچ ہو رہے ہیں۔ ایسے

ہی گلے تھے۔ ایسے ہی شکوے تھے۔

اُس روز بلوچ سورماؤں کے نغمے گائے جارہے تھے۔ بلوچوں کی بڑی بڑی جنگوں کی کتھائیں گائی جارہی تھیں۔ بہادروں کا ذکر تھا۔ ان کا ساتھ نبھانے والے قبائل کا ذکر تھا۔ بالکل ویسے جیسے کروکشیتر کے میدان میں خون کی دلدل میں دھنسے ہوئے کورو اور پانڈو کے معرکوں کے گیت گائے جاتے ہیں۔

بلوچستان کے کنونشن میں شرکت کے لیے پہاڑوں سے اُتر کر سردار بھی آئے تھے، امیر بھی آئے تھے، کلرک اور طالب علم بھی آئے تھے۔ مزدور اور کسان بھی آئے تھے۔ وہ جوشیلی تقریریں کر رہے تھے۔ وہ مٹھیاں بھینچ رہے تھے۔ وہ فلک تک نہیں جاسکتے تھے مگر ان کی آوازیں جارہی تھیں۔

میں اب بلوچ کنونشن سے لوٹ رہا تھا اور فضا میں معلق وہ بینر دوبارہ مجھے گھور رہا تھا جس پر کسی خطاط نے لکھا تھا: از مکران تا ڈی جی خان۔ بلوچستان بلوچستان۔ میں سوچنے لگا: وہ سرداری نظام، وہ تمن داری نظام، صدیوں اس علاقے پر مسلط رہے۔ صدیوں یہ لوگ لوٹے گئے۔ صدیوں یہ لوگ کچلے گئے۔ ان کے دھنسے ہوئے پیٹ۔ ان کی لٹی ہوئی عصمتیں، ان سب کی داستانیں لکیروں کی طرح ان کے ماتھے کی شکنوں میں آج تک نظر آتی ہیں۔

ہماری کار ڈیرہ غازی خان کے بازاروں میں چلی جارہی تھی۔ سیدھی سیدھی سڑکیں، گول چوراہے، کشادہ گلیاں، جیسے بہت سوچ سمجھ کر شہر کی منصوبہ بندی کی گئی ہو۔ یہ شہر اب جہاں ہے پہلے یہاں نہیں تھا۔ یہاں سے دس بارہ میل دور دریائے سندھ کے کنارے تھا۔ دریا اُسے بہا کر لے گیا۔ اس کے کھنڈر آج تک وہاں کھڑے ہیں۔ اس کے بعد یہ نیا شہر بسا تو اس کی منصوبہ بندی میں انگریزوں کی سوجھ بوجھ اب تک نظر آتی ہے۔

جنرل ایڈورڈز نے، جب وہ میجر ایچ بی ایڈورڈز تھے، اُس پرانے شہر کے بارے میں لکھا تھا:

"میں نے پنجاب کے جو شہر دیکھے ہیں ڈیرہ غازی خان ان میں سب سے زیادہ خوبصورت ہے۔ اس شہر کو بڑی آسانی سے کھجوروں کا شہر کہا جاسکتا ہے۔ شہر ڈیرہ غازی خان کے گرد و نواح میں علاقہ اس قدر خوبصورت اور زرخیز ہے کہ میں نے پنجاب بھر میں کہیں نہیں دیکھا۔ دریائے سندھ کے پار شمالی علاقوں کے مقابلے میں اسے گلزار کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہاں کھجوروں کے درختوں نے کھیتوں

کو ڈھانپ رکھا ہے اور نہروں پر چھاؤں کر رکھی ہے۔"

جنرل ایڈورڈز نے نہروں پر درختوں کی چھاؤں دیکھی اور اس علاقے کے باشندوں پر ظلم کا سایہ بھی دیکھا ہوگا جن کی چیخوں کی بازگشت آج تک سنی جاتی ہے۔

ہماری کار شہر کے بزرگ معالج ڈاکٹر غلام فرید صاحب کے مطب کے سامنے رُکی۔ بہت بوڑھے ہو گئے تھے مگر مریضوں کو بڑی مستعدی سے دیکھ رہے تھے۔ مریضوں سے فارغ ہوتے ہی وہ اٹھ کر میرے پاس آ گئے اور اب اتنی ہی مستعدی سے میرے سوالوں کے جواب دینے لگے۔

میں نے ڈاکٹر صاحب سے، جو تحصیل تونسہ کے باشندے ہیں، پوچھا ـــ "آپ کو اپنے بچپن کا زمانہ یاد ہے؟ ـــ وہ دَور کیسا تھا؟ ـــ"

ان کا جواب سنیئے۔ کہنے لگے "جس زمانے کو ہم نے دیکھا، اس وقت تو ہمیں کھانے کے لیے روٹی بھی پوری نہیں ملتی تھی۔ پہننے کے لیے کپڑا نہیں تھا، جو کچھ ہوتا تھا..... سرداری نظام تھا اور یہ سردار جو ہوتے تھے یہ باج گزار ہوا کرتے تھے اس زمانے کے جو بڑے بڑے نواب ہوتے تھے جیسے بہاولپور یا سکھوں کا زمانہ ـــ تو جو کچھ بھی ہوتا تھا وہ لے جاتے تھے اٹھا کے ـــ میرے ابا کی نانی تھیں۔ مجھے یاد ہے، ہم ان سے پوچھا کرتے تھے اور وہ بتایا کرتی تھیں کہ چھ چھ مہینے تک ہم اناج کی خوشبو تک نہیں سونگھ سکتے تھے۔ جو کچھ ہوتا تھا وہ اٹھا کے لے جاتے تھے۔ ساگ پات اور ان چیزوں پر ہم گزارا کرتے تھے۔ اب تو خیر جنگلات نہیں ہیں۔ پرانے زمانے میں کہتے ہیں کہ یہ سب جنگلات تھے۔ البتہ تونسہ شریف کے قریب ایک بہت بڑا جنگل تھا اور وہاں چور رہا کرتے تھے اس واسطے اس علاقے کو چور بھی کہتے تھے۔ ڈاکہ زنی وغیرہ تو روزمرہ کا معمول تھا۔ اور نواب وغیرہ تو کھانے پینے کی چیزیں تک لے جاتے تھے اور ڈاکے اس طرح پڑتے تھے کہ ہر گاؤں میں ایک مینار سا بنا ہوتا تھا اس پر نقارہ ہوتا تھا۔ نقارہ بجتا تھا کہ ڈاکو آ رہے ہیں۔ لوگ اپنا مال و اسباب بغل میں دبا کر جنگل میں گھس جاتے تھے۔ اس کے بعد پھر نقارہ بجا کہ ڈاکو چلے گئے ہیں اور پھر واپس آ جاتے تھے۔ مطلب یہ کہ ان کی زندگی بھر کی پونجی بس اتنی تھی کہ بغل میں آ جاتی تھی۔

یہ زندگی تھی۔ یہاں تمن داری نظام نے یہ حال کر دیا تھا۔ اب بھی اگر ان کا بس چلے تو خدا جانے کیا کریں۔ اب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہیں کہ ان سے پوچھا جائے کہ تمہارا خدا کون ہے تو وہ کہیں گے،

"نواب فلاں خاں اور نواب فلاں خاں یا فلاں نواب، فلاں نواب ـــــ"

اب میں نے ڈاکٹر غلام فرید صاحب سے پوچھا کہ یہ بتائیے کہ ظلم کے اُس دور میں غریبوں کی بہو بیٹیاں، ان کی عصمتیں، اُن کی عزتیں محفوظ تھیں؟

جواب ملا ـــــ "سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا ـــــ بالکل نہیں، قطعاً نہیں ـــــ تمن دار صاحب اور علاقے کے جوبڑے ہوتے تھے وہ ہوس کے مارے ہوئے تھے۔ کسی کی بہو بیٹی محفوظ نہیں تھی۔ غریبوں کے لیے بہرحال مصیبت تھی اور زیادہ تر طبقہ غریبوں کا تھا۔"

ڈاکٹر صاحب کی آنکھوں نے نئے اور پرانے سارے ہی منظر دیکھے تھے۔ ان کی آنکھیں کسی جوہری کی آنکھوں جیسی تھیں جو کھوٹے اور کھرے کو لمحہ بھر میں پرکھ لیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ گزرے دنوں کی مصیبتوں نے خود انسان کے کردار پر کیا اثر ڈالا ـــــ اُس وقت انسانی رشتے کیسے تھے؛ اور اس کے مقابلے میں آج کیسے ہیں؟

ان کا جواب صاف تھا ـــــ "میں عرض کروں جی پہلے زمانے میں محبت تھی الفت تھی۔ انسان ایک دوسرے کے ساتھ اپنا الحاق، اپنا تعلق رکھتا تھا تاکہ دشمنوں سے، جھگڑوں سے اور ایسی چیزوں سے وہ محفوظ رہے۔ آج کل تو نفسانفسی ہے، افراتفری ہے، ہر شخص یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوں میں ہوں۔ کوئی کسی امداد کی ضرورت نہیں۔ مگر یہ جو کچھ ہوا میرے خیال میں یہ انگریزوں نے آکر کیا۔ اب وہ چلے گئے تو ہو سکتا ہے وہی باتیں لوٹ آئیں جو ایک صدی پہلے تھیں ـــــ"

ڈاکٹر غلام فرید صاحب کی باتیں ختم ہوئیں۔ ان سے مل کر ہم غازی خان اول کے مقبرے پر گئے۔ اُس بلوچ حکمران اور بعد میں اس کی اولادوں کے دور میں اس علاقے نے اچھے دن دیکھے۔ چنانچہ غازی خان اوّل کا شاندار مقبرہ بنایا گیا۔ رود کوہیوں نے اس کی عمارت ڈھانی شروع کر دی تو عمارت کے گرد اونچا چبوترہ بنا دیا گیا۔ اب عمارت کے نقش و نگار مٹ گئے ہیں۔ دیواروں پر کچھ تحریر تھا وہ بھی ماند پڑتے پڑتے اوجھل ہو چکا ہے۔ اُس روز اندر اندھیرا تھا اور اونچے روشن دان سے آنے والی سورج کی کرنیں قبر کو منوّر کیے ہوئے تھیں اور کرنوں میں اڑتے ہوئے خاک کے ذرّے کبھی کبھی ابرق کی طرح چمکنے لگتے تھے۔

غازی خان کے پہلو میں اور بھی قبریں تھیں مگر اب کوئی نہیں جانتا کہ ان میں کون آنکھیں موندے

سو رہا ہے البتہ قبرستان کے باہر صبح سے شام تک ڈیرہ غازی خان کا مشہور حلوہ بھوننے والے بوڑھے غلام حیدر کو سارا شہر جانتا ہے۔ غلام حیدر بڑے فخر سے اپنا پورا نام اور تخلص بتاتے ہیں، غلام حیدر پتھر۔

اِس شہر والوں کو نوجوانی کے وہ دن یاد ہیں جب شہر کی ساری آبادی آزادی اور پاکستان کے نعرے لگاتی ہوئی سڑکوں پر نکل آتی تھی اور پنجاب کے بکے ہوئے حکمران اس پر لاٹھی چارج کرتے تھے۔ تب وہ ایک شخص تھا جو ہاتھوں میں ہرا چاندستارے کا پرچم اٹھائے رکھتا تھا۔ مار کھاتا جاتا تھا مگر پرچم کو جھکنے نہ دیتا تھا۔ پھر جب پاکستان بنا تو شہر والوں نے غلام حیدر پتھر کو بھینچ بھینچ کر سینے سے لگایا اور اسے ایسے مبارک باد دی جیسے پاکستان کی بنیاد کا پہلا پتھر اُسی نے رکھا ہو۔

اُس کے بعد وقت کی سواری گرد اڑاتی ہوئی آگے نکل گئی اور لوگ غلام حیدر کے جذبے کو بھی بھول گئے اور بھگدڑ کے دوران اس پر برستی ہوئی لاٹھیوں کے منظر کو بھی بھلا بیٹھے۔ جب میں جاکر اُن کے برابر بیٹھا، وہ کڑھاؤ میں کھویا اور گھی ڈالتے جارہے تھے اور حلوہ بھونتے جارہے تھے۔

میں نے پوچھا، غلام حیدر صاحب۔ کیسے دن تھے وہ جب آپ نے پاکستان کا پرچم اٹھایا تھا؟

ان کا جواب یوں تھا — "برطانیہ کی شہنشاہی تھی، ہندوؤں کا زور تھا۔ پھر پاکستان کا نعرہ آیا۔ بابا قائداعظم آئے۔ ہم نے یہاں مسلم لیگ کا جھنڈا اُٹھالیا۔ جلوس نکلے۔ سارے لوگ جلوس میں شامل ہوتے چلے گئے۔ میرے ہاتھ میں جھنڈا ہوتا تھا۔ ایک اسٹول ہوتا تھا، پھر لاٹھی چارج ہوا۔ اس وقت خضر حیات وزیر تھا۔ میانوالی کا ایس پی مسلمان تھا۔ اس کا نام محمد حیات تھا۔ لاٹھی چارج کرنے والا وہی تھا۔ مار مار کے اس نے ہمارا حلیہ بگاڑ دیا۔ میرے پاس جھنڈا تھا۔ مجھ پر سب سے زیادہ لاٹھیاں برسیں۔

پھر پاکستان بن گیا۔ قائداعظم آگئے۔ مگر مجھ کو کسی نے نہ پوچھا۔ بالکل نہ پوچھا۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کرتا ہوں وہی مجھے حج کرادے۔

ہاں تو جلوس نکلتا تھا۔ نعرے لگائے جاتے تھے، مسلم لیگ زندہ باد — لے کے رہیں گے پاکستان۔ خون سے خون بہادیں گے، پاکستان بنادیں گے — خضری ٹٹو ہائے ہائے۔ حیاتا بھائی ہائے ہائے۔ سبھی۔ مسلم لیگ زندہ باد —

بس ہماری تو آج بھی یہ دعا ہے کہ ملک کی اللہ خیر کرے۔ پاکستان زندہ باد۔"

تحریک آزادی کا یہ گمنام سپاہی آزادی کا صلہ نہ پاسکا۔ کسی نے اگر اُس کا حال نہ پوچھا۔ کسی نے یوں بھی نہ سوچا کہ اس کا حج کا ارمان پورا کرا دے۔

ڈیرہ غازی خان کی سڑکوں پر لارڈ ویول کی پولیس کی لاٹھیاں کھانے والے غلام حیدر پتھر نے اب اپنا تخلص اپنے سینے پر رکھ لیا ہے۔

ہرا سمندر، گوپی چندر

یہ قصّہ شہر سکھر کا ہے۔ میں نے ایک بچّے سے پوچھا: بڑے ہو کر کیا بنو گے؟

"ڈاکٹر"

"یہ فیصلہ کر لیا ہے؟"

"جی"

میں نے سکھر کے ایک اور نوعمر لڑکے سے پوچھا: بڑے ہو کر کیا بنو گے؟

"ڈاکٹر"

"مگر آج کل کے ڈاکٹر مریضوں سے زیادہ پیسے پر دھیان دیتے ہیں۔ کیا تم بھی ایسا کرو گے؟"

"جی نہیں۔ ہم پیسے کم لیں گے۔"

سکھر صوبہ سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے اور شاید اس کا تیسرا ہونا ہی غضب ہے۔ یہ اتنا بڑا نہیں کہ بچوں کی اُمیدیں پوری ہو سکیں ـــــ اور یہ اتنا چھوٹا بھی نہیں کہ بچّے خواب بھی نہ دیکھیں۔

دریائے سندھ کے کنارے یہ سکھر بڑا تاریخی شہر ہے۔ اس کی داستان راجا داہر اور محمد بن قاسم سے بھی بہت آگے جاتی ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ آج کا یہ سکھر چار ہزار سال سے زیادہ پرانے موئن جو دڑو سے ملتے جلتے شہر کے اوپر آباد ہے۔ اس کی بنیادوں میں ہزاروں سال پرانا ایسا علاقہ مدفون ہے جہاں اگر موئن جو دڑو والے پتھر لے جایا کرتے تھے۔ وہی پتھر جن سے وہ اپنے مکان اور اپنے آلات اور اوزار بنایا کرتے تھے۔

یہیں وہ بھکّر کا علاقہ تھا جہاں سے گزر کر ہماری تاریخ کے قافلے اندرون سندھ، افغانستان، ایران اور وسطی ایشیا جایا کرتے تھے۔

آج کا یہ سکھر اگرچہ گنجان آباد ہے، یہاں صنعتیں بھی ہیں، کاروبار بھی ہے۔ یہاں سے دریا، سڑکیں، ریلیں، سب گزرتے ہیں مگر یہ سکھر کا عجب المیہ ہے کہ اس کی ترقی کی رفتار سست ہے۔ یہاں اہلِ نظر تو ہیں مگر ناز بستیاں آباد نہیں ہو رہی ہیں۔

دریائے سندھ کے کنارے کنارے سفر کرتا ہوا اب سکھر آگیا ہوں اور ایک گلی میں کم سن لڑکوں کو کرکٹ کھیلتا ہوا دیکھ رہا ہوں۔

ان ہی گلیوں میں سکھر کے وہ باشندے آباد ہیں جن کا رویّہ، طرزِ عمل اور سلوک سندھ کے دوسرے علاقوں کے باشندوں سے جدا ہے۔ یہاں رواداری بہت ہے، بھائی چارا بھی ہے، لوگ ایک دوسرے کے دکھ سکھ میں شریک بھی ہیں۔ ایک دوسرے کی ثقافت، روایات اور عقیدے کا احترام بھی کرتے ہیں — اختلاف ہے مگر بہت کم — اور جو ہے تو ساتھ ہی یہ احساس بھی ہے کہ یہ نہ ہونا چاہیئے تھا۔

اس کا ایک سبب یہ ہے کہ یہ لوگ، یہ زیادہ تر لوگ غریب ہیں۔

خود سکھر اور آس پاس کے باشندوں کو بیشتر روزگار اسی شہر سے ملتا ہے چنانچہ کارخانے کم ہیں مزدور زیادہ، کاروباری ادارے تھوڑے ہیں اور ملازم بہت۔ انہیں اُجرتیں کم ملتی ہیں، انہیں کھانے کو پہننے کو کم ملتا ہے۔ انہیں محرومیاں زیادہ ملتی ہیں اور شاید اس احساس نے انہیں مل جل کر جینے کا ہُنر سکھا دیا ہے۔

گلی میں بچوں کا کرکٹ میچ شاید ہار جیت کے فیصلے کے بغیر ختم ہوگیا۔ میں نے اپنا تھیلا دوبارہ کاندھے پر لادا اور گلیوں گلیوں نصرت کالونی جا پہنچا جہاں کے گھر باہر سے مکان نظر آتے ہیں مگر اندر وہ سب کارخانے ہیں۔ اگرچہ دن ڈھل گیا تھا مگر مشینیں اپنی ایک چال ڈُہرا ڈُہرا کر شور مچائے جا رہی تھیں۔ یہ زیادہ تر کپڑا بُننے والے پاور لوم تھے۔ ایسی ہی ایک کھڈّی پر کام کرنے والے ایک مزدور حنیف سے میں نے باتیں کیں اور ایک غریب مزدور کی باتوں میں شعور کا خوب خوب ہونا مجھے حیران کر گیا۔

حنیف تقریباً سولہ سال کی عمر سے کپڑا بُن رہے ہیں۔ میں نے اُن سے پوچھا کہ آج کل کتنی عمر کے لڑکوں کو اس کام میں لگا لیا جاتا ہے؟

جواب ملا — "اصل میں یہ گھریلو صنعت ہے۔ تو اگر ضرورت ہو تو پانچ سال کی عمر ہی سے بچّے کو کام پر لگا لیتے ہیں۔ جو چھوٹے صنعت کار ہیں، مثال کے طور پر ایک مشین والے، تو ان کے سارے ہی

بچے پانچ سال کی عمر میں کام پر لگ جاتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اس میں کچھ زیادہ آمدنی نہیں ہے بلکہ پریشانی زیادہ ہے۔"

میں نے کہا۔" مگر پھر وہ بچے تعلیم سے محروم رہ جاتے ہوں گے؟"

حنیف بولے ۔" ہاں، یہ آپ نے ٹھیک کہا۔ اب صورت یہ ہے کہ تعلیم کے جو وسائل ہیں وہ مسائل کے نیچے دب گئے ہیں۔"

حنیف بتا رہے تھے کہ سکھر میں کپڑا بُننے کی صنعت بہت مشکلوں میں گھری ہوئی ہے۔ ایک ایک مزدور تین تین مشینیں چلا رہا ہے اور اسے روزانہ تیس پینتیس روپے سے زیادہ نہیں ملتے۔ میں نے پوچھا کہ پھر آپ کا کیا خیال ہے۔ کیا سکھر میں اتنی اہم گھریلو صنعت کا مستقبل روشن نہیں ہے؟

وہ بولے ۔"جی نہیں۔ لیکن یہ روشن ہو سکتا ہے مگر ہمارے حکمران اور اس صنعت سے تعلق رکھنے والے حکام توجہ دیں اور چھوٹی صنعت کو بھی مانیں کہ اس میں بھی روزگار ہے۔ ہم لوگ اپنے ہاتھوں سے کام کرتے ہیں۔ ہم بے روزگاری کے نعرے لگانے کی بجائے اور دوسری باتیں کرنے کی بجائے اپنی محنت کر کے کماتے ہیں اور جیسے تیسے گزارا کرتے ہیں۔ لیکن حکام اس پر توجہ نہیں دیتے اس لیے اس کا مستقبل روشن نظر نہیں آتا۔ یہی وجہ ہے کہ لوگ اس کو ختم کر رہے ہیں اور اس کام کو چھوڑ رہے ہیں۔"

حنیف نے ایک تازہ مثال دی ۔"خیرپور کاٹن کو ترقی نہیں دی گئی اور وہاں فیکٹریاں بند ہو گئیں۔ خیرپور کاٹن مل بند ہو گئی۔ اس سے بہت مزدور بے روزگار ہوا ۔ ان میں سے جو سکھر آسکتے تھے وہ یہاں آ کر تیس چالیس روپے روزانہ پر مزدوری کرتے ہیں۔ دس پندرہ روپے روز آنے جانے پر خرچ ہوتے ہیں۔ صرف بیس روپے وہ بچاتے ہیں۔ اب آپ اندازہ لگایئے کہ وہ گھر کا خرچ کیسے چلاتے ہوں گے؟"

میں اس شام کپڑا بُننے کے بہت سے کارخانے دیکھتا پھرا۔ ایک کارخانے میں ایک لڑکے کو دیکھا جو شاید ٹانگوں سے معذور تھا اور بیساکھیوں کے سہارے کھڑا یہ کھڈیاں چلا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر ذہانت تھی۔ اس کی آنکھوں میں متانت تھی۔ اس کی پیشانی پر سنجیدگی اور اس کے لہجے میں کرب تھا۔ اُس کا نام محمد فہیم تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ تم کس چیز کی مشین چلا رہے ہو؟

"انگوچھے کی"

"انگوچھے بُنتے ہو تم۔ اور اسکول میں بھی پڑھتے ہو؟—"

"جی"

"کس کلاس میں؟—"

"نویں میں"

"اور اسکول میں کتنا وقت گزارتے ہو؟—"

"چار گھنٹے"

"اور مشینوں پر؟—"

"پانچ گھنٹے"

"روزانہ کتنے پیسے ملتے ہیں تمھیں؟—"

"جمعے کو ملتے ہیں—"

"کتنے؟—"

"دس روپے"

میں نے حیران ہو کر پوچھا— "ہفتے بھر میں صرف دس روپے؟—"

اُس نے ادب سے جواب دیا— "جی—"

مَیں نے پوچھا— "تو تمھیں یہ کام کیوں کرنا پڑ رہا ہے؟"

"یہ تو روزی ہے"

"اس کے بغیر کام نہیں چلتا؟"

"نہیں—"

"تو وہ جو تم تعلیم پا رہے ہو، اس کے بعد بڑے ہو کر کیا بنو گے؟"

اُس نے اپنی بھولی سی آواز میں جواب دیا— "ڈاکٹر"

مَیں نے پوچھا— "یہ فیصلہ کر لیا ہے؟—"

وہ اتنی ہی بھولی سی آواز میں بولا— "جی—"

محمد فہیم کی باتیں ختم ہوئیں۔ مزدوروں کے بعد اب میں ایک فیکٹری کے مالک سے ملا۔ ان کا نام انعام الحق انصاری تھا۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کپڑا بننے کی اس صنعت کے مزدوروں کا کیا حال ہے، ان کی زندگی کا معیار کیسا ہے؟

جواب ملا" یہاں زیادہ تر مزدور اپنی برادری کے ہیں اور تقریباً سارے ہی مزدور خوش حال۔ ایسی بات نہیں کہ پریشان حال ہوں۔ انہیں اُجرت اچھی ملتی ہے۔ اچھے کھاتے پیتے خوش حال لوگ ہیں"

میں نے پوچھا ــــ" ان کے گھروں میں ٹیلی ویژن وغیرہ ہیں؟

جواب ملا ـــــ" جی! ہر چیز ہے۔ ریڈیو ہیں۔ آرام کی آسائش کی، تفریح کی ہر چیز ہے ــ بالکل"

یہ مزدور کا نہیں، مالک کا بیان تھا۔

پاکستان کا نقشہ پھیلا کر دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ سکھر عجیب و غریب جگہ واقع ہے۔ صوبہ پنجاب، بلوچستان اور سرحد اس کے قریب ہیں۔ یہاں سے سیدھی سڑک افغانستان کو جاتی ہے۔ اس بارے میں شہر کے سرکردہ ماہر قانون اور سیاستدان جناب عبدالحلیم پیرزادہ نے دلچسپ باتیں بتائیں۔ کہنے لگے ــ" سکھر سندھ کا تیسرا بڑا شہر ہے اور سکھر کی خاص بات یہ ہے کہ یہ ایسی جگہ واقع ہے جہاں تین صوبے ملتے ہیں۔ سمجھئے کہ یہ تین صوبوں کا جنکشن ہے۔ آپ کو شاید یہ سن کر تعجب ہو کہ سکھر سے آٹا کوئٹہ جاتا ہے اور وہاں سے افغانستان پہنچایا جاتا ہے۔ افغان تاجر ہمیشہ سکھر آتے رہے ہیں۔ سکھر میں افغانستان کے تاجر کو جتنا کپڑا ادھار پر ملتا ہے شاید ہی کہیں ملتا ہو۔ افغان بیوپاری لاکھوں روپے کا کپڑا لے جاتے ہیں لیکن بہت دیانت دار ہیں کہ پھر وہ پیسے واپس کر دیتے ہیں اور کپڑے کی نئی کھیپ اپنے ساتھ لے جاتے ہیں ـــــ یہ جو اعتبار آپ تاجر برادری میں سکھر میں دیکھیں گے یہ کہیں اور نظر نہیں آئے گا"

مگر یہ افغانستان والی بات اب شاید پُرانی ہوئی۔ سچ تو یہ ہے کہ افغانستان کی خانہ جنگی نے سکھر والوں سے ان کا کاروبار چھین لیا ہے۔ کپڑا بُننے والے ایک مزدور محمد اسلم سے میں پوچھ رہا تھا کہ ان کھڈیوں پر آپ انگوچھوں اور لنگیوں کے علاوہ کچھ اَور بھی بُنتے ہیں؟

"جی ہاں۔ آج کل سردی کے لحاظ سے یہ چادر بُنی جاتی ہے۔ اسے آپ اونی چادر کہہ سکتے ہیں۔ یہ کپڑا پہلے افغانستان بہت جایا کرتا تھا۔ مگر افغانستان میں حالات خراب ہونے سے ہماری یہ صنعت

بالکل ہی ختم ہوگئی ہے۔ بیچ میں تو بہت برا حال تھا۔ اب یہ تھوڑی بہت چل رہی ہے جس سے گزر اوقات ہو جاتی ہے اور ہمارے مزدور بھائیوں کا کام چل رہا ہے۔"

کیسی عجیب بات ہے کہ خانہ جنگی سینکڑوں میل دور سرحد پار افغانستان میں ہوئی اور اس کی ضرب سکھر والوں پر لگی اور وہ اپنے وسائل سے محروم ہوئے۔ لیکن جب وسائل موجود تھے اُس وقت بھی یہ شہر کوئی جنت نظیر نہ تھا۔ ہر شہر کی اپنی قسمت اور اپنی تقدیر ہوا کرتی ہے۔ سکھر کے نصیب میں کبھی وہ ترقی نہ لکھی گئی کہ یہ سندھ کے ساحل سے بلند ہوتا اور ہمالیہ کی بلندیوں کو جا لیتا۔ اس میں قصور کس کا تھا؟ یہ میں نے عبدالحلیم پیرزادہ صاحب سے پوچھا کہ خود ان کا گھرانا سیاست میں پیش پیش تھا۔

"میں سکھر کے ایک شہری کی حیثیت سے اتنا کہوں گا کہ ہمیں سیاست کے میدان میں جو قیادت ملی ہے اس نے سکھر کی طرف دھیان نہیں دیا حالانکہ اس میں میرے اپنے چچا بھی رہے ہیں۔ پیرزادہ عبدالستار صاحب اور حفیظ پیرزادہ صاحب بھی رہے ہیں — اور حضرات بھی سیاست میں رہے ہیں لیکن کچھ ایسی ستم ظریفی رہی ہے کہ کسی بھی سیاست دان نے سکھر کی ترقی کی طرف کوئی دھیان نہیں دیا۔ آپ چھوٹے سے چھوٹے ملک میں چلے جائیں۔ وہاں آپ دیکھیں گے کہ نئے ماڈل ٹاؤن بنے ہیں۔ جدید کالونیاں اور رہائشی بستیاں بنی ہیں۔ لیکن سکھر ایک واحد شہر ہے جس میں کوئی نئی ٹاؤن شپ نہیں بنی۔ صنعتی میدان میں بھی بہت کم ترقی ہوئی۔ پچھلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ سکھر کے نام سے فیکٹریاں منظور کرائی جاتی تھیں لیکن دوسرے مقامات پر بنائی جاتی تھیں۔ تو اس وجہ سے اس میدان میں سکھر بہت پیچھے رہ گیا ہے۔"

یہ تھے عبدالحلیم پیرزادہ صاحب۔

سکھر میں اگر کچھ بن رہا ہے، کچھ تعمیر ہو رہا ہے تو گلی گلی محلّے محلّے مسجدیں۔ سنّیوں کی، شیعوں کی مسجدیں۔ اہلِ حدیث اہل قرآن کی مسجدیں۔ دیوبندیوں۔ بریلویوں کی مسجدیں۔ حنفی مسجدیں، شافعی مسجدیں رات دن تعمیر ہو رہی ہیں۔ رات دن لاؤڈ اسپیکروں پر چندوں کی اپیلیں ہو رہی ہیں۔ وقت بے وقت یہ اپیلیں گونج رہی ہیں اور لاؤڈ اسپیکر پر اپنی تقریر کا جادو جگانے والوں کو اس سے غرض نہیں کہ کون بیمار ہے، کون ضعیف ہے۔ کون پڑھ رہا ہے اور کون امتحان کی تیاری میں مصروف ہے۔ کچھ اس قسم کی صدائیں چلی آ رہی ہیں:

مسجد زیرِ تعمیر ہے..... اس کی تعمیر میں حصّہ لے کر ثواب دارین حاصل کریں..... اللہ تعالیٰ آپ کی

نیک کمائیوں میں برکت عطا فرمائے.... آمین ثم آمین..... حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو دنیا میں اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے مسجد بنائے، اللہ تعالیٰ جنّت میں اس کے لیے محل بنائیں گے..... مسجد زیرِ تعمیر ہے..... مسجد زیرِ تعمیر ہے..... حدیث شریف..... اللہ تعالیٰ..... محل!

لاؤڈاسپیکروں کے اس شور میں اگرچہ میری سوچ دب گئی مگر میں سوچ رہا تھا کہ اس سرزمین میں اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ہیں جنہیں احساس ہے کہ اسپتال بنا دیں تو اچھا ہو، مدرسے کھلوا دیں تو نیکی ہو، بیواؤں، یتیموں، معذوروں اور اپاہجوں کو سہارا دیں تو ثواب ملے۔

عبدالستار ایدھی سے اب ساری دنیا واقف ہے۔ انسان کی فلاح کے لیے انہوں نے تنہا اپنا پرچم اٹھایا اور بندے کی بہبود کے لیے ایسا جہاد شروع کیا کہ جنت میں ایک مکان نہیں، شہر کے شہر انہیں سونپ دیئے جائیں تو حیرت نہ ہو۔ سکھر کی ایک سڑک پر مجھے ایدھی ویلفیئر ٹرسٹ کا بورڈ نظر آیا۔ میں عمارت میں داخل ہوا تو اس کے نگران حاجی عبدالعزیز صاحب سے ملاقات ہوئی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ نے اس شہر میں کیا تعمیر کیا ہے؟

"یہاں مولانا عبدالستار ایدھی کی طرف سے ایک ڈسپنسری قائم کی ہے جو صبح آٹھ بجے کھلتی ہے اور رات گیارہ بجے تک کھلی رہتی ہے۔ اس میں مفت دوائی دی جاتی ہے۔ مہینے کے اندر چار ہزار، ساڑھے چار ہزار، پانچ ہزار کے قریب مریضوں کو فائدہ پہنچتا ہے۔ ان سے کوئی معاوضہ نہیں لیا جاتا۔"

میرے ذہن میں چراغ جلنے لگے۔
ثواب دارین کے معنی سمجھ میں آنے لگے —

جس طرح سکھر اپنے بیراج کی وجہ سے مشہور ہے، اسی طرح سکھر کے تعلیمی اداروں میں امتحان کے دوران نقل کی سہولتوں کی بھی بہت شہرت ہے۔ کہنے والے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ یہاں امتحانوں میں نقل کرنے کی اتنی آسانیاں ہیں کہ پنجاب سے بعض طالب علم امتحان دینے سکھر آتے ہیں۔ میں نے شہر کے ایک سماجی کارکن سیّد ایوب شاہ صاحب سے پوچھا کہ سکھر میں تعلیم کا کیا حال ہے۔ ترقی ہوئی ہے یا تنزل؟

جواب ملا — "اس میں بہت زیادہ تنزل ہوا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں میں طالب علموں کے گروپ اور دھڑے بن گئے ہیں۔ وہ اتنے دلیر ہوگئے ہیں کہ اساتذہ کی بے حرمتی کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ٹیچرز نے بھی انہیں ان کے حال پر چھوڑ دیا ہے۔ لڑکے امتحانات پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ چاہتے ہیں کہ پرچہ آؤٹ ہو جائے یا نقل کی سہولت مل جائے۔ کہیں کہیں تو حالت اتنی خراب ہے کہ ٹیچر مجبور ہو کر بلیک بورڈ پر سوالوں کے جواب لکھ دیتا ہے۔"

میں نے پوچھا کہ سکھر والوں نے اپنے شہر کا حال بہتر کیوں نہیں بنایا۔ وہ جو سیاہ و سفید کے مالک ہوا کرتے ہیں انہوں نے اس شہر کو ترقی کیوں نہیں دی؟

سید ایوب شاہ نے کہا۔" اس سے پہلے وہ لوگ آزاد ہوا کرتے تھے۔ کسی جماعت یا تنظیم کے کے سامنے جواب دہ نہیں تھے۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے خود اپنی حالت اچھی کرلی اور شہر کو نہیں بنایا۔ اگر یہاں جماعتوں اور تنظیموں کی جانب سے کارکن منتخب ہو کر آتے تو یہ پیسے کی سیاست نہ ہوتی۔ پیسے کی سیاست سے ہوا یہ کہ جو بھی یہاں پر میئر یا ڈپٹی میئر منتخب ہوا اس نے بلدیہ کے بااثر افراد کو اپنے ساتھ ملا لیا اور بلدیہ کا بجٹ اپنی ذات پر صرف کیا۔ شہر کی ترقی پر بہت کم خرچ ہوا۔"

پیسے کی سیاست! یہ لفظ برصغیر کی جدید زندگی میں بہت رواج پا گیا ہے۔ شاید پیسے کی افراط نے بعض کام آسان بنا دیئے ہیں۔ پیسے سے اب صرف آٹا دال کپڑا اور صابن ہی نہیں بلکہ بہت کچھ خریدا جا سکتا ہے۔ میں عبدالحلیم پیرزادہ صاحب سے پوچھ رہا تھا کہ سکھر کے باشندے کیسے ہیں؟ سیاست میں اور سماجی زندگی میں ان کا طرز عمل کیسا ہے؟

پیرزادہ صاحب بڑے صاف گو آدمی ہیں۔" یہ سوال اگر آپ نہ پوچھیں تو بہتر ہے کیونکہ سکھر کے باشندوں میں ہم سب آجاتے ہیں۔ یہ تو اب سیاسی سرگرمیوں اور حالیہ انتخابات سے سوجھ بوجھ آئی ہے۔ اس سے پہلے ہم ایک بڑی عجیب بیماری میں مبتلا تھے۔ یہاں پر پیسے کی ریل پیل بڑی عام تھی۔ الیکشن میں بڑی بری طرح پیسے خرچ کیے جاتے تھے اور لوگوں کو خریدنے کی کوشش کی جاتی تھی لیکن اب جو انتخابات ہوئے ہیں تو میں فخریہ کہہ سکتا ہوں کہ سکھر کے لوگ اس آفت سے نکل گئے ہیں۔"

پیرزادہ صاحب سے باتیں جاری تھیں۔ باتوں باتوں میں وہ موضوع چھڑ گیا جس نے تمام باشور

ذہنوں کے سارے تار چھیڑ رکھے ہیں۔

وہ جو دلوں میں فرق آ گیا ہے۔ وہ جو گھروں میں بٹوارا ہو گیا ہے۔ وہ جو محبتوں میں کمی آ گئی ہے۔ وہ جو نفرتیں دبے پاؤں زندگی میں داخل ہو گئی ہیں، ان کی بات سندھ میں نہ چھڑتی تو کہاں چھڑتی۔ میں نے عبدالحلیم پیرزادہ صاحب سے پوچھا کہ اس آپس کے نفاق کی بنیاد کب اور کیوں پڑی؟

"یہ جو کچھ نفرت بڑھی ہے یہ ون یونٹ کے زمانے میں بڑھی۔ یہاں سندھ میں جو دوسرے صوبوں کے لوگ آباد ہیں ان سے بات کر کے دیکھیں۔ وہ بتائیں گے کہ ون یونٹ سے پہلے یہاں نہ کوئی اختلاف تھا نہ کوئی نفاق۔ ون یونٹ تو بنا اس لیے تھا کہ بیوروکریسی کو سندھ کی زمینیں چاہیئے تھیں، سندھ کی ملازمتیں چاہیے تھیں۔ اب دیکھیئے کہ فارسٹ گارڈ ایک معمولی ملازم ہوتا ہے۔ اُس زمانے میں فارسٹ گارڈ بھی پنجاب سے آتا تھا، اب مقامی آدمی نے اپنے سیاستدانوں سے پوچھنا شروع کیا کہ بھئی آپ لوگ کیا کر رہے ہیں؟ کیا ہم اس قابل بھی نہیں کہ فارسٹ گارڈ کی ملازمت سندھ میں رہنے والے کو ملے؟ چلو بھئی کوئی اعلیٰ ملازمت ہو یا ایسا روزگار ہو جس کے لیے بڑے ٹیکنیکل تجربے کی ضرورت ہو اس کے لیے باہر سے آدمی کا آنا سمجھ میں آتا ہے لیکن جب چھوٹی چھوٹی معمولی ملازمتیں بھی ہاتھ سے جانے لگیں تو عام لوگ بے چین ہو گئے۔ اس کا نتیجہ آپ نے دیکھا جب ان کا کام پورا ہو گیا۔ زمینیں اور ملازمتیں ان کے ہاتھوں میں چلی گئیں تو ون یونٹ کی ضرورت نہیں رہی اور انہوں نے ون یونٹ توڑ دیا۔"

یہ تو سکھر کے ایک قدیم خاندان کے سرکردہ اور اعلیٰ تعلیم یافتہ اور باشعور شہری کی باتیں تھیں۔ ایک شام پہلے میں سکھر کی نصرت کالونی نمبر چار کی ایک گلی میں ایک چارپائی پر بیٹھا ایک بزرگ عظیم الدین صاحب سے باتیں کر رہا تھا۔ وہ ۳۵ سال سے شہر کے اس علاقے میں آباد ہیں اور شہر والوں کو اُن کی ضعیف آنکھوں نے بہت قریب سے دیکھا ہے۔ میں نے عظیم الدین صاحب سے پوچھا کہ جب آپ پہلے پہل سکھر آئے تھے تو کیا اُس وقت سندھی غیر سندھی کا جھگڑا تھا؟

جواب ملا ــــ "نہیں جی۔ اس وقت بالکل نہیں تھا۔ ہمارے سندھی بھائیوں نے ہماری بہت مدد کی۔ وہ بہت ہمدردی کرتے تھے۔ اور کسی قسم کا کوئی بھی فساد یا کوئی بھی مسئلہ نہیں تھا اور ہم بڑے مل جل کر رہتے تھے ــــ"

میں نے پوچھا ــــ" پھر یہ اختلاف کب ہوا؟ کیوں ہوا؟ ــــ"

"میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ کچھ آگے چل کر کسی موقع پر ایسا ہوا کہ کچھ عناصر نے اپنے مفاد کے لیے آپس میں لڑوانے کی کوشش کی۔ چنانچہ یہ ہوا ــــ ہم لوگ خود بے وقوف تھے جو آپس میں لڑے اور فسادوں میں مبتلا ہوئے۔ یہ نہیں ہونا چاہیے تھا ــــ"

یہ نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یوں نہیں ہونا چاہیے تھا۔ یہ بات تمام رات میرے ذہن میں گونجا کی۔ میں جا کر اپنے ہوٹل کے کمرے میں سو گیا۔ صبح کی پہلی کرن نے آکر مجھے جگایا اور میں نے کھڑکی کھول کر دیکھا تو سامنے، میری آنکھوں کے بالکل سامنے دریائے سندھ کا راستہ روکے سکھر بیراج کھڑا تھا۔ منہ زور دریا مجبور ہو کر بغلی نہروں میں اتر رہا تھا اور دودھ جیسا جھاگ اڑاتا پانی دور دور تک کی زمینوں کے لیے سبز اوڑھنی کی بشارت بن کر جا رہا تھا۔

چار ہزار سات سو پچیس فٹ لمبا یہ سکھر بیراج پہلے لائیڈ بیراج کہلاتا تھا۔ اس وقت بمبئی کے گورنر کا نام بھی لائیڈ تھا۔ انہیں ہی یہ عظیم الشان بیراج بنانے کا خیال آیا تھا۔ ۱۹۲۳ء میں یہ بننا شروع ہوا۔ جنوری ۱۹۳۲ء میں یہ پورا ہوا ــــ اس میں ساٹھ ساٹھ فٹ کے چھیالیس در ہیں۔ اس سے سات نہریں نکلتی ہیں جن کی مجموعی لمبائی چار سو میل ہے۔ اس سے سندھ کی وہ زمینیں سیراب ہوئیں جنہوں نے پہلے کبھی پانی کا قطرہ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اس سے آبپاشی کا جو نظام وجود میں آیا وہ اپنے وقت کا دنیا کا سب سے بڑا نظامِ آب پاشی تھا۔

ہاں ایک دلچسپ بات یاد آئی۔ سنا ہے سکھر بیراج کے پرانے کاغذوں میں اُس وقت کے حکام نے لکھا ہے کہ اس علاقے کے لوگوں سے کام نکلوانے کے لیے کبھی کچھ پیسہ وغیرہ دینا پڑے تو دے دیا جائے، بس کام ٹھیک ہونا چاہیے۔

مطلب یہ کہ پیسے کی سیاست اس زمانے میں بھی چلتی تھی۔

ہاں تو سورج اونچا ہوا تو میں ہوٹل سے نیچے اُتر آیا اور دریا کے کنارے کنارے چلتا ہوا اُس جگہ پہنچ گیا جہاں برسہا برس سے پرانی کشتیاں دریا میں کھڑی ہیں اور ملّاح ان کے اندر آباد ہیں۔

کئی ملّاحوں نے آواز لگائی؛ چلیے صاحب، دریا کی سیر کریں گے؟ اور میں یہ دیکھ کر حیران رہ گیا وزنی کشتیاں کھینے والے ان ملّاحوں میں ایک خاتون بھی تھیں۔ میں ان کی کشتی میں جا بیٹھا۔ انہوں

نے گلابی جوڑا پہن رکھا تھا۔ میں جو کشتی میں بیٹھا تو انہوں نے اپنا دوپٹہ اپنی کمر کے گرد باندھا۔ شلوار کے پائنچے اونچے کیے اور مردوں کی طرح کشتی کھینی شروع کر دی۔ جب کشتی ساحل سے ذرا دور نکل گئی تو نظر آیا کہ ساحل پر نہ جانے کتنے ندیدے کھڑے خاتون ملاح کو یوں گھور رہے تھے جیسے کھا جائیں گے مگر خاتون نے اُدھر آنکھ اُٹھا کر بھی نہیں دیکھا۔ میں اُن سے باتیں کرنے لگا اور پوچھا کہ یہ کشتی کب سے چلا رہی ہو؟

"ہم بچپن سے چلاتے ہیں۔"

"یعنی جب تم چھوٹی تھیں اس وقت بھی کشتی چلاتی تھیں؟"

"چلانی پڑتی ہے نا بھائی۔"

"مگر اس میں تو بہت زور لگانا پڑتا ہے۔"

"ہاں محنت تو لگتی ہے۔"

"تھک جاتی ہوگی۔"

"نہیں۔ ہم سارا دن چلاتے ہیں۔"

"ہاتھ پیر نہیں دکھتے۔"

"نہیں۔"

"سُنا ہے کوئی عورت یہاں کشتی چلاتی تھی وہ مر گئی۔ اُسے کیا ہوا تھا؟"

"وہ پیٹ والی تھی۔"

"اچھا پھر۔"

"پھر مر گئی۔"

بات ختم ہوئی۔ سفر بھی تمام ہوا۔ دریا کے کنارے ندیدوں کا مجمع بھی چھٹ گیا البتہ ساحل کی ڈھلان پر ایک بوڑھے ملاح کو دیکھا جو یوں بیٹھا تھا کہ اُس کا ایک ہاتھ دوسرے ہاتھ پر دھرا تھا۔ میں اُس سے بھی باتیں کرنے لگا۔

"سنا ہے آپ کے بزرگ بھی دریا میں ان کشتیوں کے اندر رہتے تھے؟"

"ہاں۔ ہمارے بابا دادا سب پانی میں رہتے تھے۔"

"کہیں اور مکان نہیں ہے آپ کا؟—"

"نہیں .... نہیں .... بس—"

"آپ کی آمدنی کا ذریعہ کیا ہے؟"

"آمدنی یہی ہے۔ کوئی بیراج میں گورنمنٹ کی نوکری کرتا ہے۔ کوئی پھل بیچتا ہے۔ کوئی ماہی گیری کرتا ہے۔ مچھی مارتا ہے۔ ہمارا کوئی اور کاروبار نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا—"آپ لوگوں کے بچّے کیا کرتے ہیں۔ یہی کام کرتے ہیں یا اسکول میں جاتے ہیں؟"

"کوئی اسکول جاتے ہیں، کوئی یہی کام کرتے ہیں۔"

"اور یہ جو عورتیں یہاں کشتی چلاتی ہیں اور دریا کی سیر کراتی ہیں، یہ کام تو مردوں کے کرنے کا ہے، عورتیں کیوں کرتی ہیں؟"

جواب ملا—"بس، کسی کا دل ہے—"

"ان کی کافی آمدنی ہو جاتی ہے؟—"

"نہیں—اتنی ہے نہیں—"

"مگر آپ لوگ دریا میں کیوں رہتے ہیں؟"

"ہمیں کوئی مکان نہیں ملتا۔ کوئی پلاٹ نہیں ملتا تو ہم کیا کریں۔ ادھر رہتے ہیں۔ ہمیں کوئی روکتا نہیں—"

میں نے اگلا سوال کیا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ اس کا جواب کیا ہوگا۔ میں نے پوچھا—"اچھا اگر آپ کو مکان یا کوئی پلاٹ مل جائے تو آپ یہ کشتیاں چھوڑ جائیں گے؟"

"ہاں۔"

"چلے جائیں گے؟—"

"ہاں—"

"شہر میں رہیں گے؟—"

"ہاں—"

میرا یہ شہر چھوڑ جانے کا وقت آ پہنچا۔ سکھر کی اندھیری گلیوں میں کسی دینی مدرسے میں میلاد ہو رہا

تھا اور قمقموں کی ہلکی ہلکی روشنی تھی جس میں مَلگجے کپڑے پہنے، کس کر چوٹیاں گوندھے چھوٹی چھوٹی لڑکیاں کھیل رہی تھیں۔ وہ کھیلتی جاتی تھیں، ہنستی جاتی تھیں۔ چاندی جیسی کھنکتی ہنسی تھی ان کی۔ چاندی ہی جیسی پیشانیاں تھیں جن سے معصومیت کی شعاعیں کرن کرن پھوٹ رہی تھیں۔

اُس روز دل سے بڑی دعائیں نکلیں کہ خدا کرے یہ گلیاں یوں ہی ہنستی بستی رہیں اور یہ نسلیں شاد رہیں، آباد رہیں اور جو خواب دیکھیں وہ خواب پورے بھی ہوں۔

میں لوٹنے لگا تو لڑکیوں کی آوازیں میرے پیچھے پیچھے چلی آئیں :

"ہرا سمندر۔ گوپی چندر۔ بول میری مچھلی، کتنا پانی ؟

اتنا پانی......

اتنا پانی —"

آگے یہ ہوا

سکھر سے ہماری بس چلی تو درختوں کے سائے سائے چلی۔

اچھی سڑک ہو، دو رویہ درخت ہوں اور ہم سفر دلچسپ ہوں تو سفر پھر زحمت نہیں بنتا۔ میرے ساتھ لاڑکانہ کے عبدالحمید صاحب تھے۔ اگرچہ آج کل کی اصطلاح کے حساب سے وہ مہاجر ہوئے مگر لاڑکانہ میں اتنے عرصے سے آباد تھے کہ خود کو سندھی کہتے تھے اور شکایت کرتے جاتے تھے کہ مقامی باشندے اس بات کو نہیں مانتے۔

عبدالحمید صاحب بتا رہے تھے کہ زیادہ تر مہاجر لاڑکانہ چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ وہ خود بھی اس کوشش میں ہیں کہ ان کی جائیداد اچھے داموں فروخت ہو جائے تو وہ بھی اس سرزمین کو خیرباد کہہ جائیں۔ جذبات میں گرماگرمی آ چکی تھی۔ دلوں کے بیچ دیواریں اٹھ چکی تھیں۔ انتخابات کو چند روز گزر چکے تھے۔ بے نظیر بھٹو ملک کی وزیراعظم بن چکی تھیں۔

جوں ہی ہماری بس لاڑکانہ کے قریب پہنچی، ایک میلے کا سماں نظر آنے لگا۔ چہار جانب سے لوگ موٹر گاڑیوں میں بھر کر، پاکستان پیپلز پارٹی کے جھنڈے لہراتے ہوئے لاڑکانہ کی طرف رواں تھے۔ کسی نے بتایا کہ وزیراعظم بننے کے بعد محترمہ بے نظیر بھٹو اپنے والد کی قبر پر فاتحہ پڑھنے آئی ہیں، لوگ ان کے استقبال کے لیے جا رہے ہیں۔

ہزاروں لوگ سڑکوں کے کنارے کھڑے نئی وزیراعظم کا انتظار کر رہے تھے۔ آخر وزیراعظم اور ان کے ساتھیوں کی کاریں آئیں اور فراٹے بھرتی ہوئی گزر گئیں۔ میں نے اپنی عوامی بس کی کھڑکی سے ان کو بھی دیکھا اور پیچھے پیچھے چلنے والی کاروں میں اپنے دوستوں، واقف کاروں اور شناساؤں کو بھی دیکھا۔

کچھ دیر بعد راستے کھلے اور ہم لاڑکانہ شہر میں داخل ہوئے۔ شام ہو چلی تھی اور شہر اجنبی تھا۔ میں نے اپنے کاغذات میں لاڑکانہ کے سب سے بڑے اور اچھے ہوٹل کا نام ڈھونڈ نکالا مگر پتہ چلا کہ وہ ہوٹل کبھی کا بند ہو چکا اور اس کے خالی کمروں میں اب سناٹوں کا بسیرا ہے۔ شہر کو دیکھا تو احساس ہوا کہ جو حال ہوٹل کا ہے وہی حشر لاڑکانہ کی رونق کا، حسن کا اور دلکشی کا ہوا ہے۔ جس شہر کو بڑے پیار اور سلیقے سے سجایا گیا تھا، اس کے سبزہ زاروں میں، چمن زاروں میں اور گلزاروں میں وہی سناٹوں کا بسیرا ہے۔

اس کی بات ذرا بعد۔

میں ایک اَور چھوٹے سے ہوٹل میں پہنچا جس کی بڑی خوبی یہ تھی کہ اس کے مالکان اور اس کا عملہ مہمان نواز تھا۔ یہ گرمجوشی ملی تو اجنبیت کا احساس مٹا اور میں شام کے دھندلکے میں تنہا سیر کو نکل جانے کی جرأت اپنے اندر پاکر خود ہی حیران ہوا ــــ

بازاروں میں خوب چہل پہل تھی۔ دسمبر کا دوسرا ہفتہ تھا اور لوگ گرم کپڑے پہنے گھوم رہے تھے۔ تمام بڑے چوراہوں پر لوگ چینی کے پیالوں میں بھرا ہوا شوربہ سپائی رہے تھے جس سے بھاپ اٹھ رہی تھی۔ پتہ چلا کہ لاڑکانہ کی سڑکوں پر چین کا چکن کارن سُوپ فروخت ہو رہا ہے کیوں نہ ہو۔ اس شہر والوں کا چین پر یوں بھی بڑا حق ہے۔

مَیں نے بھی اس شام لاڑکانہ والوں کی طرح چینی سُوپ پیا جس پر دیسی مصالحوں کا سفوف چھڑکا گیا تھا۔ پھر چاول کے خشکے اور گرم گرم دال کا دور چلا۔ اس کے بعد تازہ پھلوں کا ٹھنڈا جوس پیا اور رات ہونے سے پہلے پہلے انفلوئنزا کو میں نے اپنے گلے کا ہار کر لیا۔

اگلی صبح عبدالرزاق سومرو صاحب سے میری ملاقات طے تھی۔ شہر کے سرکردہ ماہر قانون ہیں اور سیاست سے گہرا تعلق ہے۔ وزیر اعظم کی آمد کی وجہ سے کافی مصروف تھے مگر میرے لیے بہت سا وقت نکالا اور توجہ سے میری باتیں سُنیں اور انہماک سے اپنی باتیں سنائیں۔

ایک مصروف اور قدیم سڑک کے کنارے نسبتاً نئے، دلکش اور آرام دہ مکان کے بہت آراستہ ڈرائنگ روم میں ہم دیر تک گفتگو کرتے رہے۔ میں نے عبدالرزاق سومرو صاحب سے پوچھا کہ آپ کا یہ ضلع لاڑکانہ، سندھ کے دوسرے ضلعوں سے کیونکر مختلف ہے؟

وہ بولے ـــ "تاریخی اعتبار سے ہمارے ضلع کی خوش قسمتی رہی ہے کہ یہ بڑا خوش حال علاقہ رہا ہے۔ زرعی اعتبار سے بھی اور ثقافتی اعتبار سے بھی ـــ وہ اس لیے کہ جب سکھر بیراج بھی نہیں بنا تھا، ہمارے ضلع کے اندر قدرتی نہریں موجود تھیں یعنی ۱۹۳۲ء سے پہلے بھی یہاں صورت یہ تھی کہ دریا سے نکل کر نہریں ادھر آتی تھیں اور یہاں بہتی تھیں۔ تو اس وجہ سے دوسرے ضلعوں کے مقابلے میں یہاں کے لوگ زیادہ خوش حال تھے۔"

اس کے بعد سومرو صاحب کی باتوں کا رخ سیاسی شعور کی جانب ہوا۔ کہنے لگے ـــ "سیاسی شعور کے معاملے میں بھی لاڑکانہ دوسرے ضلعوں سے آگے تھا۔ یوں سمجھیے کہ خلافت موومنٹ کو قیادت لاڑکانہ سے ملی۔ اس کے علاوہ انگریز کے دور میں ہمارے ہاں سیاسی شعور کو فروغ ہوا اور نامور لوگ پیدا ہوئے۔ اوائل میں سر شاہنواز بھٹو صاحب تھے۔ پھر دوسرے دور میں خان بہادر کھوڑو تھے۔ اُسی دور میں قاضی فضل اللہ صاحب یہاں آئے۔ وہ اگرچہ یہاں کے باشندے نہیں تھے اور ضلع نواب شاہ سے آئے تھے لیکن یہاں آکر انہوں نے ۱۹۳۰ء کے عشرے میں سیاست میں حصہ لیا اور بڑی جرأت کا مظاہرہ کیا۔ اس کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کا دور آیا اور لاڑکانہ آسمان کی بلندیوں کو چھونے لگا ـــ"

میں سومرو صاحب کی باتیں توجہ سے سُن رہا تھا۔ نہروں کا ذکر ہو چکا تھا اور مجھے یاد تھا کہ یہ قدرتی نہریں نہ صرف سارے علاقے کو سیراب کرتی تھیں بلکہ ایک نہر تو شہر لاڑکانہ کے درمیان سے گزرتی تھی۔ دریائے سندھ کے کنارے اس طویل سفر میں یہ پہلا پڑاؤ تھا جہاں لوگوں نے کہا کہ دریا سے انہیں بڑا فیض پہنچا ہے۔ دریا ان کے گھروں کی دہلیزوں سے لگا لگا بہتا تھا اور نہروں میں کشتیاں چلا کرتی تھیں۔

عبدالرزاق سومرو صاحب سے یہی باتیں ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا کہ یہ میرے ہاتھ میں جرمنی کا چھپا ہوا سندھ کا جو نقشہ ہے اس میں لاڑکانہ کو "سندھ کا گلزار" لکھا گیا ہے اور بعض کتابوں میں لاڑکانہ کو "سندھ کا پیرس" کہا گیا ہے۔

اس پر سومرو صاحب نے لاڑکانہ کے حسن اور دلکشی کی بات شروع کی مگر وہ ساری بات گزرے ہوئے وقتوں کی نکلی۔

کہنے لگے ـــــ "اُس زمانے میں یہاں کے باغات مشہور تھے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا، ہمارے شہر کے درمیان سے گھاڑوا نہر گزرتی تھی۔ تو گھاڑوا کے دوسرے کنارے پر ایک باغ ہوتا تھا جس کو گیان باغ کہتے تھے۔ وہاں جانے کے لیے لوگوں کو فیری استعمال کرنا پڑتی تھی۔ وہ مستقل چلتی تھی اور لوگوں کا آنا جانا مسلسل رہتا تھا۔ اور پھر ہریالی بہت ہوتی تھی۔ اس کی وجہ یہی تھی کہ ہمارے ہاں پانی بہت زیادہ تھا۔ اب بھی لاڑکانہ میں پینے کا پانی بہت میٹھا ہے لیکن اُس زمانے میں اس سے بھی بہتر پانی تھا۔ لوگوں کو لاڑکانہ جیسا پانی کہیں نہیں ملتا تھا۔ اسی پانی کی وجہ سے یہاں باغات تھے۔ ہر طرف آم اور امرود کے باغ ہوتے تھے۔ یہاں سندھ میں کہاوت مشہور تھی کہ اگر آپ کے پاس پیسہ ہے تو جا کر لاڑکانہ دیکھیں۔"

اس کے بعد لاڑکانہ میں تعلیم کا ذکر چھڑ گیا۔ کسی زمانے میں وہاں صرف ایک گورنمنٹ ہائی اسکول تھا۔ پھر مسلمانوں نے مل کر مدرسۃ الاسلام قائم کیا جس نے کتنے ہی نامور لوگ پیدا کیے۔ یوں بھی ضلع لاڑکانہ میں دینی تعلیم کی روایت بہت پرانی تھی۔ مسلمانوں کے کئی بڑے مکتب اور مدرسے یہیں لاڑکانہ میں تھے۔ عبدالرزاق سومرو صاحب بتا رہے تھے.....

"ہمارے ضلع کو یہ شرف حاصل ہے کہ یہاں جگہ جگہ پُرانے دینی مدرسے تھے۔ نیک آدمی ان کی معاونت کیا کرتے تھے اور اس طرح لوگوں کو نہ صرف قرآن اور حدیث بلکہ عربی اور فارسی کا علم بھی ملتا تھا۔ مطلب یہ کہ تعلیم کے میدان بھی لاڑکانہ کئی دوسرے ضلعوں سے آگے تھا ـــــ"

میں نے پوچھا ـــــ "سومرو صاحب۔ سندھ میں ایک دور تھا جب غیر مسلم حضرات تجارت میں اور روپے پیسے کے لین دین میں بہت آگے تھے، اُس وقت لاڑکانہ کے مسلمانوں کی حالت کیسی تھی؟ ـــــ"

جواب ملا ـــــ "سر، لاڑکانہ کے مسلمان تجارت میں بہت پیچھے تھے۔ ہندو سب سے آگے تھے۔ میں پورے ضلع کی بات کر رہا ہوں، صرف شہر کی نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ تجارت اور کاروبار میں بس گنتی کے مسلمان تھے۔ ان کے بھی دو طبقے تھے۔ ایک تو بہت بڑے زمیندار مسلمان تھے۔ ان کو یہ گمان تھا کہ تجارت کا کام گھٹیا ہوتا ہے اور تجارت کرنا ان کی شان کے خلاف ہے وہ سوچتے تھے کہ دکان پر بیٹھنا اور سودا بیچنا ہندو کا کام ہے۔ دوسرا طبقہ دیہات کے آباد کاروں کا تھا۔ ان کی معاشی حالت اتنی خراب تھی کہ وہ تجارت کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ بات پاکستان بننے سے پہلے

کی ہے۔ ہمیں تو پاکستان نے فائدہ پہنچایا ہے۔ ہم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پاکستان نے ہمیں کیا دیا ہے اور صرف سندھ کو نہیں، اس پورے خطّے کو دیا ہے جسے بھی تاریخ کا علم اور جو ہماری عمر کا ہے، اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ پاکستان نے اس قوم کو کیسے کیسے فائدے پہنچائے۔"

عبدالرزاق صاحب کی طرح جب کوئی صدقِ دل سے تسلیم کرتا ہے کہ پاکستان نے آج کی نسلوں کو کیسے کیسے فیض پہنچائے ہیں تو ایک لاڑکانہ ہی نہیں، سارا وجود سندھ کا گلزار اور سارا شعور سندھ کا پیرس محسوس ہونے لگتا ہے۔

آیئے آگے چلیں اور لاڑکانہ کی سڑکوں پر نکلیں۔ دیکھیں کہ اگلے وقتوں کے لوگوں نے جس شہر کو گل و گلزار بنا دیا تھا میں نے اُسے کس حال میں پایا۔

ایک دنیا جانتی ہے کہ ذوالفقار علی بھٹو اسی لاڑکانہ کے باشندے تھے۔ وہ ملک کے سربراہ بنے تو اس شہر کو ہمیشہ سے زیادہ اہمیت ملی۔ ایک خلقت لاڑکانہ جانے لگی۔ دنیا بھر کے وزیر، سفیر، بادشاہ اور شہنشاہ بھٹو صاحب سے ملاقات کرنے لاڑکانہ پہنچنے لگے۔ اُس وقت اِس شہر کو نکھارا گیا، سنوارا گیا اور سبزے کی ہری اوڑھنی پہنا دی گئی۔ لیکن ادھر بھٹو صاحب کو پھانسی ہوئی، لاڑکانہ کے حسن اور دل کشی کا دم گھٹ گیا۔

سندھ کے پیرس کی درگت دیکھنے کے لیے ہم تانگے پر بیٹھے۔ وہی عبدالحمید صاحب میرے ہم سفر تھے۔ ان کی بزرگ آنکھوں نے شہر کو بنتے بھی دیکھا اور اُجڑتے بھی۔ تانگہ چلتا گیا۔ منظر آتے رہے، جاتے رہے اور عبدالحمید صاحب بولتے رہے......

"یہ دیکھیے ــــ یہاں..... اس جگہ بہت اچھے باغات تھے اور یہاں روڈ کے ساتھ بہت اچھی پھلواریاں لگی ہوئی تھیں۔ انتظامیہ نے ان کو برباد کر دیا ــــ یہ بڑا گنجان آباد شہر تھا۔ دیکھتے دیکھتے اس پر تباہی آئی ــــ دیکھیے۔ یہ گندا تالاب دیکھ رہے ہیں آپ.... یہ جو پڑا ہے اب چار دیواری کے اندر.... اس جگہ ایسی عمدہ پارک تھی کہ برابر کی سڑکوں سے ہم لوگ گزرا کرتے تھے تو خوشبو میں بس جاتے تھے۔ اب ذرا دیکھیے اس کی کیا پوزیشن ہے..... اسی طریقے سے بہت سے پارک اس روڈ کے ساتھ ساتھ تھے ــــ وہ سب تباہ ہو چکے ہیں..... یہ سب جتنی بھی آپ فٹ پیریاں دیکھ رہے ہیں، ان سب پر بینچیں اور پھول پتیوں کے بڑے عمدہ قسم کے درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ سب برباد ہو

چکے ہیں۔ جب شہنشاہ ایران آئے تو یہاں پر اتنی بڑی ڈیکوریشن ہوئی کہ ہم نے اپنی زندگی میں، برطانیہ کے دور میں بھی ایسی ڈیکوریشن نہیں دیکھی مگر وہ چیزیں بھی تباہ ہو گئیں۔ اتنے اچھے پھول پتی کے درخت، اتنے اچھے گملے، ایسے کٹنگ دار، ایسے خوبصورت، بہت ہی عمدہ یہاں پر تھے۔ اب کچھ بھی نہیں ہے ___ یہ جو نہر ہے نا آپ کے دائیں بائیں، یہاں بہت بہترین بغیچے بنے ہوئے تھے۔ رات کو نہر کے ساتھ ساتھ مرکری بلبوں کی روشنی ہوتی تھی۔ تفریح گاہ بنی ہوئی تھی۔ لوگ رات کے ایک ایک بجے تک تفریح کرنے کے لیے آتے تھے۔ مگر اب آپ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی بیٹھنا بھی گوارا نہیں کرتا۔"

عبدالحمید صاحب کی آواز ڈوبتی گئی۔ گھوڑے کی ٹاپیں بلند ہوتی گئیں اور یوں لگا کہ یہ دوڑتے ہوئے گھوڑے کی نہیں، بدلتے ہوئے وقت کی ٹاپیں ہیں جن کے تلے بستیاں پامال ہو رہی ہیں اور آبادیاں مسمار ہو رہی ہیں۔

اچھا ہوا کہ آگے ریل کا پھاٹک آگیا اور گھوڑے کو رکنا پڑا۔

اگلے روز جو میں چلا تو لاڑکانہ کے پاکستان نیشنل سنٹر کے سامنے سے گزرا۔ وہاں اُردو میں ایک تختۂ سیاہ پر کھریا سے لکھا تھا، قومی یک جہتی اور اتحاد کے موضوع پر مذاکرہ جاری ہے ___ اندر تشریف لایئے ___" میں نے تعمیل کی تو دیکھا کہ تھوڑے سے لوگ بیٹھے تقریریں سن رہے ہیں اور ایک صاحب سندھی زبان میں قومی اتحاد کے بارے میں خطابت کا مظاہرہ کر رہے ہیں اور ثابت کر رہے ہیں کہ سب لوگ برابر ہیں۔ زہد و تقویٰ میں کوئی ایک دوسرے پر افضل ہو تو ہو، رنگ، نسل، قوم اور زبان کے معاملے میں سب ایک جیسے ہیں۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں اور رخصت ہو گئے۔ مَیں بھی ہال سے نکل رہا تھا کہ لاڑکانہ کے چانڈکا کالج کے لڑکوں نے مجھے گھیر لیا اور اصرار کرنے لگے کہ چل کر ان کے کالج کی بدنظمی اور بدحالی اپنی آنکھوں سے دیکھوں ___ میں گیا ___ دیکھا ___ طب کے مدرسے میں ہر چیز خلافِ طب تھی۔ ناقص فرنیچر، اندھیرے بدبودار کمرے۔ ٹوٹی پھوٹی تجربہ گاہیں جن میں نہ ہَوا اور روشنی اندر لانے کا انتظام، نہ تعفن اور سیلن باہر نکالنے کا بندوبست۔ اوپر سے لڑکوں کو یہ شکایت کہ چیر پھاڑ کے لیے لاشیں

نہیں ملتیں، چھپکلیوں اور مینڈکوں پر مشق کر کے ہم انسان کے ڈاکٹر نہیں بن سکتے ۔کچھ عمارتیں ادھوری پڑی تھیں۔ جو مکمل تھیں وہ ڈھئی جا رہی تھیں۔ لڑکے نوجوان تھے لہٰذا مشتعل تھے اور سارا الزام پرنسپل پر رکھ رہے تھے۔ خاص طور پر انسانی لاشیں نہ ملنے پر وہ بہت ناراض تھے۔

کینٹین میں ان کے ساتھ اُس روز چائے کی آٹھویں پیالی پی اور اب نویں پیالی ہمیں لاڑکانہ کے پریس کلب کی طرف بلا رہی تھی۔ اچھے خاصے سبزہ زار میں اچھی خاصی عمارت تھی جس میں ہم داخل ہوئے تو دیکھا کہ شہر کے پرانے اخبار نویس احمد خاں کمال بیٹھے ہیں۔ کسی زمانے میں ہم اور وہ ایک ہی اخبار میں کام کرتے تھے۔ ہم توادھر اُدھر ہو گئے مگر احمد خاں کمال، جو ۱۹۵۸ء میں لاڑکانہ میں وارد ہوئے تھے، وہیں جڑ پکڑ چکے تھے۔ اب تو نہ صرف ان کا لب ولہجہ بلکہ شکل وصورت بھی سندھی ہو چلی تھی۔ سندھی زبان میں ایک کتاب بھی لکھ چکے تھے۔ خود بھی روانی سے سندھی بولنے لگے تھے —ان سے دیر تک باتیں ہوا کیں۔ میں انہیں بتا رہا تھا کہ اوپر ڈیرہ غازی خان تک لوگ کہتے آئے ہیں کہ دریائے سندھ سے انہیں کوئی خاص فائدہ نہیں، آپ لاڑکانہ والے کیا کہتے ہیں؟ دریا نہ ہوتا تو کیا ہوتا؟

وہ بولے —" اگر دریائے سندھ کو لاڑکانہ سے نکال دیا جائے تو لاڑکانہ کی کیفیت تھر جیسی ہو گی۔ دریائے سندھ سے یہاں رائس کنال نکلتی ہے اور لاڑکانہ کی زیادہ تر معیشت کا دار و مدار اسی رائس کنال پر ہے اور جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ نہر دھان کے کھیتوں کو سیراب کرتی ہے۔ یہاں زیادہ تر چاول ہی کاشت ہوتی ہے اور یہ دریائے سندھ سے نکلنے والی نہر کا کمال ہے کہ پورے سندھ میں سب سے زیادہ چاول پیدا کرنے والا علاقہ یہی لاڑکانہ ہے — پھر یہاں امرود کے باغات ہیں اور ہر ایک جانتا ہے کہ لاڑکانہ کا امرود کتنا لذیذ، میٹھا اور خوشبودار ہوتا ہے۔"

اور امرود کے بعد لاڑکانہ اور رتو ڈیرہ کے کھوئے اور مٹھائی کا ذکر ہو رہا تھا کہ کہیں قریب ہی لاؤڈ اسپیکر پر سندھی گانا بجنے لگا۔ مائی بھاگی نیم کے نیچے تنہا کھڑے ہونے کی تصویر کشی کر رہی تھیں۔ احمد خاں سندھ کے لوک ورثے کی بات کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ہزاروں سال کی روایتیں جوں کی توں برقرار ہیں۔" لوک موسیقی سے لے کر روایتی کشتی تک، جسے ملھ کہا جاتا ہے، یہاں تک کہ پہناوا، ٹوپی اور جوتا بھی بالکل وہی ہے جو سینکڑوں سال پہلے تھا۔ شہروں میں تو خیر لوگ بدل جاتے ہیں، گاؤں

دیہات میں جاکر دیکھیے آپ کو قریب قریب دہی لباس نظر آئے گا جس کے آثار موئن جودڑو میں ملتے ہیں۔ آج بھی ویسی ہی بیل گاڑی نظر آئے گی جیسی موئن جودڑو میں رکھی ہے۔ یہی حال زیور کا ہے۔ ڈھائی ہزار سال پرانے کھنڈروں کی کھدائی سے جو زیور نکلے تھے، آج تک ویسے ہی زیور پہنے جاتے ہیں۔ سندھی موسیقی میں خصوصاً صوفیانہ اور عارفانہ موسیقی میں اکتارے کا رواج بہت زیادہ ہے۔ ایسا ہی اِکتارہ ہزاروں سال پہلے رائج تھا۔ اسی طرح گاتے ہوئے چپڑی بجاتے ہیں۔ یہ لکڑی کی دو تختیاں ہوتی تھیں جنہیں ایک ہاتھ میں پکڑکر بجاتے ہیں، کبھی کبھی اُن میں گھنگرو بھی باندھ لیتے ہیں۔ یہ بھی قدیم ساز ہیں۔ شہنائی کا رواج بھی عام ہے شادی بیاہ میں شہنائی بجائی جاتی ہے۔ یہ شہنائی شمالی ہندوستان کی شہنائی سے ذرا مختلف ہے اور یقیناً بہت قدیم ہے۔ ایسے موقعوں پر ہوجمالو کا رقص ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ یہ شہنائی اور ڈھول بڑا سماں باندھتے ہیں۔"

قدیم ثقافتی ورثے کی بات تمام ہوئی تو نئی تہذیب کا موضوع چھڑ گیا۔ میں نے پوچھا کہ لاڑکانہ کے علاقے میں جدید تہذیب کے اثرات کیوں کر پہنچے۔ احمد کمال بولے — "جدید تہذیب کے اثرات کو کوئی روک نہیں سکتا چنانچہ اب تو ٹیلی ویژن کے ذریعے ان اثرات کا سیلاب آگیا ہے اور اب تو گاؤں دیہات بھی اس کی زد میں ہیں لیکن وہاں ریڈیو پہلے سے عام ہو چکا ہے۔ پہلے تو سارا گاؤں ایک ریڈیو سیٹ کے گرد جمع ہوکر سنا کرتا تھا لیکن آج ہم دیہات میں جاتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ کسان اپنے کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے اور ہل پر ایک چھوٹا سا ریڈیو ٹنگا ہوا ہے۔ وہ ہل چلاتا جاتا ہے اور گانے اور خبریں سنتا جاتا ہے۔"

مگر نئی تہذیب جہاں بھی گئی اپنی خوبیاں اور خرابیاں اکٹھا لے کر گئی۔ لاڑکانہ کے علاقے میں ریڈیو اور ٹیلی ویژن نے بیداری ضرور پیدا کی لیکن ہر تصویر کی طرح اس کا بھی دوسرا رُخ تھا۔ میں نے احمد کمال سے پوچھا کہ کیا اس علاقے میں وی سی آر بھی پہنچا ہے؟

"جی ہاں۔ وی سی آر پہنچا ہے۔ اور وی سی آر نے بڑی بیداری پیدا کی ہے۔ پڑھے لکھے طبقے نے اسے تفریح اور علم کی طور پر برتا ہے۔ ذہنوں میں کشادگی آئی ہے لیکن دیہی علاقوں میں اس کے منفی اثرات بھی ہوئے ہیں، آپ یوں سمجھ لیجیے کہ اس علاقے میں جو ڈاکو ہیں بالکل اُسی انداز میں ڈاکے ڈال رہے ہیں جس انداز میں بھارتی فلموں میں دس سال پہلے ہم دیکھتے تھے۔ دس سال پہلے

یہاں ڈاکو نہیں تھے لیکن آج جو ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں وہ بالکل فلموں کے انداز میں ہیں، اسی طرح لوگ اغوا بھی کیے جا رہے ہیں — یہ سب دی سی آر کی دین ہے —"

احمد خاں کمال صحافی ہونے کی مناسبت سے لاڑکانہ کو اچھی طرح جانتے تھے کہ ابھی میرا سوال ختم بھی نہیں ہوتا تھا کہ ان کا جواب شروع ہو جاتا ہے۔ میں نے آخر میں اُن سے پوچھا کہ یہ بتایئے، آپ کے اس شہر، اس ضلع اور اس علاقے کے لوگ کیسے ہیں؟

وہ بولے: "لاڑکانہ کے لوگ؟ — میں نے لاڑکانہ کو ہوش سنبھالنے سے لے کر آج تک دیکھا ہے۔ اکتالیس بیالیس سال کی میری عمر ہے۔ تو میرا تجربہ یہ کہتا ہے کہ لاڑکانہ کے لوگ بڑے اچھے ہیں؛ بڑے مہمان نواز ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے مزاج میں سیاست بہت ہے کیونکہ یہ علاقہ ہمیشہ سیاسی سرگرمیوں کا مرکز رہا ہے۔ تو یہاں ہر آدمی کے ذہن میں سیاست ہے اور سیاست کے ساتھ پیار بھی ہے۔ مطلب یہ کہ پیار کا جواب پیار سے دیتے ہیں۔ کوئی شخص لاڑکانہ کے کسی فرد یا کسی برادری سے اچھا سلوک کرے گا تو یہ لوگ اس سے بھی بڑھ کر اچھا سلوک کریں گے لیکن اسی طرح اگر رویہ ترش یا تلخ ہوگا تو اُس کا جواب زیادہ کرخت ہوگا —"

یہ گفتگو کرتے کرتے احمد خاں کمال اور تفصیل میں چلے گئے اور اہلِ شہر کے طرزِ عمل کا تاریخی پس منظر بیان کرنے لگے — "لاڑکانہ والوں میں ایک عجیب صفت ہے۔ میں اس کے اسباب سوچتا ہوں لیکن سمجھ نہیں پاتا۔ یہاں کا مزاج یہ رہا ہے کہ جب لاڑکانہ والوں نے اپنے کسی فرد یا جماعت کو نقصان پہنچانا چاہا تو اس کے لیے باہر کے لوگ بلوائے گئے مثلاً شاہنواز بھٹو لاڑکانہ کی سرکردہ شخصیت تھے۔ سندھ اسمبلی کے رکن باقاعدگی سے منتخب ہوتے تھے۔ یہاں کے لوگوں نے شیخ عبدالمجید سندھی کو حیدرآباد سے بلوایا اور شاہنواز بھٹو کے مقابلے میں کھڑا کر کے انہیں ہروا دیا اسی طرح کھوڑو صاحب کو شکست دینے کے لیے پہلے قاضی فضل اللہ بلوائے گئے ان کے بعد ذوالفقار علی بھٹو کو جو غیر ممالک میں رہنے لگے تھے، یہاں بلوا کر کھوڑو صاحب اور قاضی صاحب، دونوں کو شکست دلائی گئی۔"

یہ دلچسپ تبصرہ تھا۔ میں نے کہا کہ اس کردار کا کوئی سبب کوئی پس منظر ضرور ہوگا۔ کہنے لگے —

"میرا خیال یہ ہے کہ یہ خاصیت سرزمین سندھ کی ہے۔ سندھ کی تاریخ کو اگر آپ دیکھیں تو پتہ چلتا ہے کہ سندھ کے جو بھی حاکم ہوتے تھے، انہیں شکست دلانے کے لیے لوگ باہر سے بلوائے جاتے تھے۔

کلہوڑوں کو، عباسیوں کو جو نقصان پہنچایا گیا اس کے لیے باہر سے لوگ بلوائے گئے۔ ٹھٹھ کے حاکم نے تو ایک مرتبہ پرتگالیوں کو بلوالیا تھا۔ بالکل وہی تاریخ یہاں دہرائی جارہی ہے (ہنس کر) اب آگے دیکھئے کیا ہوتا ہے؟——"

اور آگے یہ ہوا کہ ہماری اس ملاقات کے کچھ عرصے بعد ایک روز احمد کمال خاں نے ایک اخباری کانفرنس میں شرکت کی جس کے بعد وہ ایک دوسرے صحافی کے ہمراہ کانفرنس کی خبر بھیجنے شہر کے تار گھر جارہے تھے کہ دن دہاڑے، سب کی نظروں کے سامنے کچھ لوگوں نے اُن پر گولیاں برسائیں۔ خون میں لت پت دونوں صحافی وہیں گرے اور مرگئے۔

مگر میں جانتا ہوں کہ لاڑکانہ والے بہت اچھے ہوتے ہیں۔ وہ احمد کمال اور ان کے ساتھی کو نہیں مار سکتے۔ یہ کام لاڑکانہ کے لوگوں کا نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے ممکن ہے باہر سے لوگ بلائے گئے ہوں۔

حمیدہ بیگم اور شہنشاہ حضور

لاڑکانہ پیچھے رہ گیا۔ دریائے سندھ قریب آنے لگا۔ سپاٹ میدانوں میں ہری فصلیں اور تناور درخت دکھائی دیئے اور ان کی آڑ میں وہ مُردوں کا ٹیلہ آن پہنچا کہ جو موئن جو دڑو ہے اور جو نشانی ہے ان لوگوں کی جنہیں ساڑھے چار ہزار سال پہلے ہمارے اس دریا نے نہ صرف زندگی بلکہ ذہانت بھی عطا کی تھی۔

صبح کی نئی نئی دھوپ ابھی نکلی تھی اور میں موئن جو دڑو کے کھنڈروں کی سڑکوں پر چل رہا تھا۔ دونوں جانب سُرخ اینٹوں کی عمارتیں میرے کان میں کہے جا رہی تھیں کہ حضرت عیسیٰ سے بھی دو ڈھائی ہزار برس پہلے یہاں تمہاری طرح بڑے بڑے صاحب ثروت چلتے تھے۔ وہ مہذب بھی تھے، وہ باشعور بھی تھے، ان کے سینے میں بھی حساس دل دھڑکا کرتے تھے۔ سندھ کا پانی ان کے گھروں کی دہلیز کو چھو کر بہتا تھا تو یہ بستی بھی سیراب ہوا کرتی تھی، یہ تالاب بھی بھرا کرتے تھے اور پنجوں کے بل سیڑھیاں اترتے اترتے عورتیں آہستہ سے پانی میں چلی جایا کرتی تھیں تو سطح آب پر ان کے چمکیلے بال پھیل جاتے تھے۔

میں موئن جو دڑو کی گلیوں میں اُتر گیا۔ کہیں آنگن دیکھے کہیں چوبارے، کہیں طاق دیکھے کہیں دریچے، شہر کی فصیلیں دیکھیں اور بیچوں بیچ پہاڑی کی طرح کھڑا ہوا گُشانوں کا استوپا دیکھا — دیواریں سرگوشیاں کرتی رہیں۔ بتاتی رہیں کہ اِن گلیوں میں بیل گاڑیاں کس طرح اناج لاتی تھیں اور ان دکانوں میں کس طرح مال بھرا رہتا تھا۔

آخر میں دیواروں سے مخاطب ہوا — میں نے پوچھا کہ پھر کیا ہوا؟ اس شہر پر کیا گزری؟ شہر والے کہاں سدھار گئے؟ یہ شہر مُردوں کا ٹیلہ کیسے بن گیا؟ میرا یہ پوچھنا تھا کہ بولتی دیواروں نے چپ سادھ لی۔ اپنا یہ راز انہوں نے اپنے سینے میں رکھا ہے۔ دنیا میں جتنی بھی مقدس چیزیں ہیں

اپنے چندایک راز اپنے سینے میں ضرور رکھا کرتی ہیں۔

موئن جو دڑو کے کھنڈروں کو خدا جانے کیوں کھنڈر کہنے کو جی نہیں چاہتا۔ کھنڈر وہاں ہوتے ہیں جہاں آبادی نہ ہو۔ یہاں تو کسی کے قدموں کی چاپ آج بھی آپ کا پیچھا کرتی ہے۔

پھر یہ چاپ بہت دور تک ساتھ ساتھ چلی اور ڈوکری کی ریلوے کراسنگ سے گزر کر جب تک ہم سیتا روڈ نہیں پہنچ گئے، موئن جودڑو کی تہہ میں سر اُبھارنے والے دریا کے پانی کی شوریدہ خوشبو نے ہمارا تعاقب ترک نہ کیا۔

سیتا روڈ میں فضا کے رنگ و بو بدل گئے۔ کچھ سج جیسے رنگ، کچھ دلہنوں جیسی خوشبو۔ مجھے پتہ نہ تھا کہ یہیں سڑک سے ذرا اُتریں تو وہ جگہ آجاتی ہے جہاں شہنشاہ ہمایوں اور حمیدہ بیگم کی شادی ہوئی تھی۔ کیسی عجیب سرزمین ہے۔ یہیں ان کا نکاح ہوا۔ بعد میں یہیں کہیں ان کا بیٹا اکبر پیدا ہوا۔ اسی راستے ہمایوں جان بچا کر بھاگا اور یہ سلسلہ دارا شکوہ تک چلا۔ یہ الگ بات ہے کہ انجام سب کے جدا جدا ہوئے۔

سیتا روڈ کے بعد ہم دادو سے گزرے۔ اس راہ میں تاریخی عمارتیں جا بجا آنے لگیں جو گواہ تھیں اس دَور کی جب یہیں ذرا دور خدایار خان کلھوڑا کا دارالسلطنت خدا آباد تھا۔ اب اُدھر دریائے سندھ پر پُل بن گیا اور ادھر کے سکون اور سکوت کو بڑی بڑی لاریوں اور ٹرکوں نے توڑ دیا ہے۔

مگر جنہیں سکون کی تلاش ہے وہ یہاں نہیں ٹھہرتے۔ وہ سیہون سے پہلے کہیں نہیں رکتے۔ وہ جب تک حضرت لعل شہباز قلندر کی دہلیز پر ماتھا نہ ٹیک دیں، پیشانی کی لکیروں سے پریشانی کی تحریریں نہیں مٹتیں۔

اگلا ہی لمحہ مجھے شہباز قلندر کی درگاہ کے کھلے دالان میں لے گیا جہاں دھمال ہو رہا تھا۔ فقیروں کا دھمال تھا۔ ان پر ایک عالم طاری تھا جس کی کیفیت کے بھید خود ان پر کھلے ہوئے تھے — دالان میں رسیاں تان دی گئی تھیں۔ ایک جانب خواتین محو رقص تھیں۔ انہوں نے اپنے بال کھول ڈالے تھے اور یوں جھوم رہی تھیں کہ نہ تن کا ہوش تھا نہ بدن کا۔

دوسرے حصے میں درویش رقصاں تھے۔ اُن کے پیروں میں پڑے ہوئے لوہے کے کڑے چھن چھن بول رہے تھے۔ ایک اندھا درویش دیوانوں کی طرح ناچ رہا تھا۔ ایک گونگا فقیر جو نکہ نعرۂ مستانہ

نہیں لگا سکتا تھا اس لیے قرنا پھونکے جا رہا تھا۔ سامنے ایک حجرے میں ایک سیاہ پوش، دراز زلف بزرگ نے اپنے سر کے بال اُلٹ کر چہرے پر ڈال لیے تھے۔ بس ان کے ہاتھوں کی تمام انگلیوں میں بھری ہوئی انگوٹھیاں نظر آ رہی تھیں۔ خود ان کی نظریں خدا جانے کہاں لگی تھیں اور کس کی زیارت کر رہی تھیں، یہ سارے راز ہم نہیں جان سکتے۔

ذرا دیر پہلے میں سیہون شریف پہنچا تھا اور فوراً ہی درگاہ میں حاضر ہوا تھا تو در کی چوکھٹ سے لگے ایک بزرگ آنکھیں موندے مناجات میں مصروف تھے:

مدد کو بلا خالق باصفا کو — تو آواز تو دے علی مرتضیٰ کو
زمانے کا ظلموں کا نقشہ دکھا کر — دُعا کر مسلماں خدا سے دُعا کر

جو ہے باغباں دو جہاں کے چمن کا — عیاں راز اس پہ ہے تیری لگن کا
تو مانگے جا صدقہ حسینؑ و حسنؑ کا — خدا کو بڑا پاس ہے پنجتن کا
نہ جا تشنہ لب بحرِ رحمت سے اگر — دُعا کر مسلماں خدا سے دُعا کر

غرور و تکبر کو دل سے مٹا کر — ادب سے عقیدت کا دامن بچھا کر
نہ ترکیب کوئی تو اس کے سوا کر — محمدؐ کو اپنا وسیلہ بنا کر
دُعا کر مسلماں خدا سے دُعا کر

مَیں بزرگ کے قریب گیا۔ ان کا نام پوچھا۔ وہ غلام عباس علوی تھے۔ انہوں نے میرا نام پوچھا اور نام سنتے ہی اٹھے اور مجھے سینے سے لگا لیا۔ غلام عباس درگاہ کے خادم ہیں۔ صبح و شام یہاں حاضری دیتے ہیں اور اس مقام کو خوب جانتے ہیں۔ کہنے لگے کہ آیئے آپ کو تبرکات کی زیارت کراؤں۔ اب جو ہم چلے اور درگاہ کے اندر زائرین کے سمندر میں لہر بن کر بہے تو فقیروں کی صدائیں طوفان بن کر اٹھیں اور ہم اُن میں ڈوب گئے۔

غلام عباس میرا ہاتھ تھامے مجھے ساتھ لیے جا رہے تھے۔ درگاہ کے ایک گوشے میں رکھے ہوئے گول سے پتھر کی طرف اشارہ کیا اور بولے —"یہ مکّھی تھی شہد کی، اور وہ مکھن۔ یہ نکلتا تھا اور لوگ کھاتے تھے۔ پھر اتنے بے ایمان لوگ پیدا ہوئے جو ان کو یہاں سے لے کر بیچ دیتے تھے تو یہ پتھر بن گیا، آج سے پچاسی سال پہلے۔ ہمارے دادا نے ان کو دیکھا تھا۔ یہ شہد کی مکھی تھی اور وہ

مکھن تھا، یہ پتھر کی صورت اختیار کر گئے ــــ"

درگاہ کی امانت میں خیانت کرنے کا یہ سلسلہ کبھی نہیں تھا۔ اس کی بات ذرا دیر بعد ہوگی۔ غلام عباس صاحب مجھے درگاہ کے پچھواڑے ایک کھلے صحن میں لے گئے جس کی چادر دیواری اور جس کا فرش نہایت عمدہ پتھروں سے بنایا گیا تھا اور بالکل نیا تھا البتہ صحن کے بیچوں بیچ ایک پرانی قبر موجود تھی اور قیمتی پتھروں سے اُسے بھی سنوار دیا گیا تھا۔ غلام عباس میرے تجسس کو جان گئے اور اس قبر کی داستان سنانے لگے ــــ "یہاں پورا قبرستان تھا۔ جب بھٹو صاحب نے اس مقام کو ترقی دی تو پرانی قبریں ہٹادی گئیں البتہ جب یہ سامنے والی قبر کھولی گئی تو اس میں ایک عورت دفن تھی، اس کا کفن بھی مَیلا نہیں ہوا تھا۔ ہوا جب لگی تو خوشبو پھیل گئی اور میت ایسی تھی جیسے آج ہی دفن کی گئی ہو۔ چنانچہ وہ قبر جوں کی توں چھوڑ دی گئی۔ باقی جو ہڈیاں ملیں وہ نکال دی گئیں۔"

اب یہ بتانے کی ضرورت نہیں کہ راستے کی وہ ساری خوشبوئیں پیچھے رہ گئیں اور اس بستی کی خوشبو میرے ساتھ ہولی۔ ہم واپس درگاہ میں لوٹے تو حضرت کی قبر کے پاس چاندی کی جالی میں بندھا ہوا ایک سفید پتھر دیکھا جس کو صدیوں کے دوران اتنے زائرین نے احتراماً چھوا ہوگا اور اُس پر پانی ٹپکا کر بیماروں کو پلانے کے لیے وہی پانی دوبارہ جمع کیا ہوگا کہ پتھر چکنا ہوگیا تھا۔ میں نے غلام عباس سے پوچھا کہ یہ کیسا پتھر ہے؟

"ہمارے بزرگ بتاتے ہیں کہ کربلا سے جب اہل بیت کا قافلہ روانہ ہوا تو امام زین العابدین کے گلے میں یہ پتھر ڈالا گیا تھا۔ کہتے ہیں کہ یہ پتھر، وہ عمامہ اور وہ عصا، یہ تبرکات سید شیر شاہ جلال کے پاس تھے۔ جب شہباز آئے اور پنجاب کے دورے پر گئے تو اس نے کہا کہ یہ تینوں امانتیں آپ لے لیں کیونکہ میں بوڑھا ہوچکا ہوں امام موسیٰ کاظم کی سونپی ہوئی یہ امانتیں خدا جانے میری اولاد کے ہاتھوں محفوظ رہیں یا نہ رہیں، آپ یہ لے جائیے اور اپنے پاس رکھیے ــــ"

جس پتھر کے بارے میں کہتے ہیں کہ امام زین العابدین کو قیدی بنا کر ان کے گلے میں ڈالا گیا تھا، میں نے قریب جاکر اس کا جائزہ لیا تو پتہ چلا کہ پتھر چکنا چور ہوچکا ہے اور اسے دوبارہ یکجا کرکے جالی سے باندھا گیا ہے۔ میرے پوچھنے پر غلام عباس نے بتایا ــــ "اسے ایک پٹھان نے توڑ دیا تھا۔ اس نے کہا کہ لوگ پتھر کو ماننے لگے ہیں اور یہاں آتے ہیں تو پہلے اس پتھر کو ہاتھ لگاتے ہیں، اس

کے بعد شہباز کے مزار پر حاضر ہوتے ہیں تو وہ متواتر دیکھتا تھا کہ پتھر کا اس درجہ احترام ہو رہا ہے، تو ایک روز وہ ہتھوڑا لے کر آیا اور بڑی حقارت سے اس پتھر کو توڑا۔ لوگوں نے اُسے تھانے میں دیا۔ آٹھ دس روز جیل میں رہا، پھر خدا جانے سچ ہے یا نہیں، جج نے کہا کہ مجھے بشارت ہوئی ہے کہ یہ شخص دیوانہ ہے اور ہمیشہ دیوانہ رہے گا۔ اور واقعی وہ ابھی تک پاگل ہے، لہٰذا جج نے اُسے چھوڑ دیا۔ لوگوں نے ٹوٹے ہوئے پتھر کے ٹکڑے یکجا کیے اور چاندی کی جالی چڑھا کر انہیں دوبارہ جوڑ دیا، جو آپ دیکھ رہے ہیں —"

حضرت شہباز کا یہ شاندار مقبرہ خاندان ترخان کے مرزا جانی بیگ نے تعمیر کرایا تھا۔ وہ خود ٹھٹھہ کے قبرستان میں سو رہا ہے لیکن اس جگہ ایک عالم بیدار ہے۔ یہاں صبح و شام، دن اور رات کا امتیاز نہیں۔ یہ ہر ایک کی زیارت گاہ ہے اور ہر وقت کھلی رہتی ہے۔ شاید یہی سبب ہے کہ گزرے وقتوں کی باتیں یہاں آج تک سینہ بسینہ منتقل ہو رہی ہیں، یہ الگ بات ہے کہ ان باتوں پر وقت کا رنگ چڑھتا جا رہا ہے چنانچہ وہ باتیں تاریخ سے مختلف اور کتابوں سے جدا ہیں۔

غلام عباس نے ایک قدیم کتبے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا: "یہ محمد ہاشم ٹھٹھوی کی تحریر ہے۔ وہ آئے تھے دھمال بند کرانے کہ یہ شریعت کے خلاف ہے، ایک سو طالب علم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ بڑے بڑے عالم دین تھے۔ محمد ہاشم آئے تو دھمال جاری تھا۔ انہوں نے خود اپنی جوتی بغل میں دبالی اور دھمال میں کھڑے ہو گئے۔ پوری دھمال کی اور جب وہ ختم ہو گئی تو شہنشاہ کی درگاہ پر گئے، سلام کیا اور جب علم کو سلام کر کے واپس گئے تو شاگردوں نے پوچھا کہ آپ تو دھمال بند کرانے آئے تھے۔ پھر یہ کیا کیفیت ہو گئی کہ آپ خود دھمال کرنے لگے۔ استاد نے کہا کہ وہاں تو شریعت کا مالک خود کھڑا تھا، اس کی موجودگی میں میری کیا مجال کہ زبان کھولوں۔ یہ فقیروں کی دھمال ہے، اس میں ہمارا کوئی دخل نہیں۔ ہاں یوں کریں کہ فرض پڑھنے دیں اور سنّت میں یہ دھمال کریں۔ تو ادھر سنّت شروع ہوتی ہے ادھر یہ دھمال شروع ہوتی ہے۔ ابھی تک یہ سلسلہ چلا آ رہا ہے۔"

یہ تھی وہ روایت جو کتابوں میں نہیں ہے، زبانوں پر ہے، جسے نقارہ خدا سمجھنا ضروری نہیں۔ ہم جنہیں حضرت لعل شہباز قلندر کہتے ہیں، خود سیہون والے انہیں شہنشاہ حضور کے نام سے یاد

کرتے ہیں اور شہنشاہ حضور کی بات یوں کرتے ہیں جیسے ابھی صبح اُن کے نیاز حاصل ہوئے تھے اور جیسے ابھی سہ پہر ان کی زیارت ہوئی تھی اور جیسے ابھی شام ہونے سے پہلے ان کی قدم بوسی کی سعادت ملی تھی۔ شاید یہی سبب ہے کہ یہ زیارت گاہ آٹھویں پہر کھلی رہتی ہے۔ رات کو بھی یہاں دن جیسی رونق ہوتی ہے جس کا اندازہ مجھے یوں ہوا کہ درگاہ کے سامنے جو بے شمار طعام خانے ہیں وہ رات بھر کھلے رہے۔ زائرین ساری رات آتے رہے اور کھانے پینے کا سلسلہ جاری رہا۔ درگاہ کے باہر جہاں کبھی نانبائی بیٹھتے ہوں گے اب بڑے بڑے ہوٹل تھے۔ میں ایک ہوٹل کے ملازم محمد جعفر سے باتیں کرنے لگا اور اُن سے پوچھا کہ یہاں ایسے کتنے ہوٹل ہیں؟ وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولے: "ادھر کم سے کم بھی نہیں ہیں تو پندرہ سولہ سترہ ہوٹل ہوں گے۔ سب بڑے بڑے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ادھر مسافر لوگ بہت آتے ہیں، پردیسی آتے ہیں اور رات دن آتے رہتے ہیں، یہ ان کی سہولت کے لیے ہے۔ ان کو کھانے پینے کی کوئی تکلیف نہیں ہوتی ہے۔"

میں نے پوچھا کہ آپ کا ہوٹل رات کتنے بجے بند ہوتا ہے۔ انھوں نے بتایا کہ ہوٹل رات بھر کھلا رہتا ہے، اسی طرح سارا دن کھلا رہتا ہے اور کھانا ہر وقت ملتا ہے، کہنے لگے "آدمی جو بھی چیز طلب کرے مل جاتی ہے۔"

میں محمد جعفر سے باتیں کر رہا تھا کہ ایک اَور صاحب آ کر باتوں میں شامل ہو گئے۔ ان کا نام رحیم بخش تھا۔ میں نے پوچھا کہ آپ یہاں درگاہ میں کیا کرتے ہیں وہ بولے "ہم کاروبار کرتے ہیں، اندر درگاہ میں کوئی چائے وغیرہ منگائے یا کھانا بندھوا کر منگائے یعنی پارسل، تو وہ ہم پہنچاتے ہیں، ہم کو روپے پر چار آنے کمیشن ملتا ہے۔ ایک سوٹکی چلاتے ہیں تو ہمیں پچیس روپے ملتے ہیں۔

میں نے پوچھا: "یہ آپ کے لیے کافی ہے یا کم ہے؟"

وہ بولے "بس ایسا ہے کہ روز کا چالیس پینتالیس روپیہ ہو جاتا ہے، گزر اچھا ہوتا ہے ہمارا۔ پہلے ذرا مشکل ہو گیا تھا۔ اوقاف کے مینجر نے ہمیں اندر جانے اور کھانا لے جانے کی ممانعت کر دی تھی، پھر اللہ نے مہربانی کیا تو ہمیں درگاہ کے اندر روزگار ملنے لگا۔"

میں نے پوچھا کہ ممانعت کیوں کر دی تھی۔ کہنے لگے "ادھر بدمعاش وِدمعاش بہت آتے ہیں،

ہوٹلوں کے بعض ملازم بھی بدمعاش ہیں اس لیے انہوں نے منع کر دیا۔ لوگ مسافروں کو لوٹتے ہیں، شوبازی کرتے ہیں دربار میں، اس لیے پابندی لگی تھی۔ مگر اب کام ملنے لگا ہے ــــ"

ہوٹلوں کے ملازموں سے باتیں کرتے کرتے میں اہلِ شہر میں گھل مل گیا۔ سیہون شہر کی باتیں ہونے لگیں۔ یہ عجیب و غریب شہر ہے۔ یہاں کوئی صنعت نہیں، کوئی کاروبار نہیں، سرکاری دفاتر نہیں۔ یہاں کی معیشت کا دارومدار زائرین پر ہے جو خدا جانے کہاں کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہر روز دس ہزار افراد سیہون آتے ہیں۔

میری ملاقات صفدر سے ہوئی جو سیہون میں رہتے ہیں البتہ حیدر آباد کے پولی ٹیکنک میں تعلیم پاتے ہیں۔ میں نے صفدر سے پوچھا کہ اس شہر میں روزگار کی کیا حالت ہے ؟ یہاں کے نوجوان کیا کرتے ہیں ؟

"جی یہاں کوئی روزگار یا کارخانہ وغیرہ نہیں ہے جہاں یہ نوجوان مصروف رہیں۔ یہاں زیادہ تر ایسے لوگ ہیں جو پڑھے لکھے بھی نہیں ہیں کیونکہ یہ تو دیہاتی علاقہ ہے جہاں بہتوں نے اپنی زندگی برباد کر دی ہے اس کے علاوہ ہمارے شہر میں نشہ وغیرہ بہت عام ہو گیا ہے۔ بہت سے نوجوان نشے میں ٹائم پاس کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ کیرم بورڈ کا یہاں بہت رواج ہے۔ یہ شہر والے کھیل یہاں بھی آ گئے ہیں، نوجوان اپنا سارا وقت اُدھر ہی لگاتے ہیں۔"

میں نے کہا ــــ "اور پیسہ بھی لگاتے ہوں گے۔"

"جی بالکل۔ وہ اتنا کماتے نہیں جتنا خرچ کرتے ہیں، اب سوچئے یہ فالتو رقم وہ کہاں سے لاتے ہوں گے ــــ"

پھر میری ملاقات عبدالعزیز صاحب سے ہوئی۔ پہلے کبھی شہر کے پرائمری اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ اب ایک درگاہ کے گدی نشین ہیں۔ ان کا خاندان سات سو سال سے سیہون میں آباد ہے۔ میں نے عبدالعزیز صاحب سے پوچھا کہ آپ استاد رہ چکے ہیں۔ اس شہر کے اکثر نوجوان آپ کے شاگرد رہے ہوں گے۔ مجھے بتائیے وہ کس حال میں ہیں ؟

"سائیں نوجوان لوگ اکثر اوقات روزگار کے متلاشی ہیں۔ یہاں روزگار کی بہت قلت ہے۔ اگر حکومت چاہے تو کئی کارخانے بھی بن سکتے ہیں، باتیں بڑی کی ہیں۔ وعدے بھی بڑے بڑے کیے

ہیں لیکن ان پر ابھی تک کوئی عمل نہیں ہوا ہے لہٰذا یہاں بہت سے آدمی بچارے بے روزگار ہیں۔ منشیات کا کاروبار یہاں کھلے عام چل رہا ہے۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے۔ خاص کر ہیروئن کا کاروبار جس نے ملک کو تباہ کر دیا۔ اس کے علاوہ جب سے یہاں افغانی آئے ہیں، دیہات تک میں ہتھیار کھلے عام پہنچ رہے ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں ہے ——"

اس کے بعد عبدالعزیز صاحب نے ایک تازہ واقعہ سنایا اور شاید تاریخی واقعہ جو انتظامیہ کی کارکردگی کی تصویر کھینچتا ہے۔ کہنے لگے۔

"پہلی بار —— یقین کیجیے پہلی بار یہ ہوا ہے کہ لعل شہباز قلندر کی درگاہ میں کم سے کم بارہ گھنٹے پانی نہیں آیا۔ پوری زندگی میں ہم نے یہ پہلی بار دیکھا ہے کہ درگاہ شریف میں پانی نہیں تھا۔"

حضرت سخی شہباز قلندر کی یہ درگاہ اب بہت سنواری جا چکی ہے۔ اس کے اطراف جدید تعمیراتی کام ہوا ہے۔ نئے فرش نئی دیواریں بنی ہیں۔ اور سب سے بڑا دروازہ سونے کا ہے جو ایران سے بن کر آیا تھا اور اتنا خوبصورت اور قیمتی ہے کہ حفاظت کے خیال سے مستقل طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ یہ دیکھا تو سوچا کہ وہ پرانا بوسیدہ لکڑی کا دروازہ کیا بُرا تھا۔ سونے کے اس در پر لکھا ہے۔ "وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے یہ دروازہ ۴ جنوری ۱۹۷۶ء کو نصب کیا تھا ——" سارے شہر والے کہتے ہیں کہ سیہون کو بنانے اور سنوارنے میں بھٹو صاحب کا بڑا ہاتھ تھا۔ وہ بڑے عقیدت مند تھے اور بار بار حاضری کے لیے آتے تھے۔

سیہون شہر خود مجھے بہت اچھا لگا۔ ذرا بلندی سے دیکھیں تو دور دور تک اینٹوں سے بنے مکان نظر آتے ہیں، سینکڑوں گنبدیں اور مینار نظر آتے ہیں، رنگ رنگ کی جھنڈیاں لہراتی نظر آتی ہیں۔ صدیوں پرانی تنگ گلیاں نظر آتی ہیں جو اب پختہ کر دی گئی ہیں، وہی اینٹوں کے فرش ہیں۔ شہر سے باہر ذرا اونچی پہاڑی پر کسی قدیم ہندو راجا کا جو قلعہ رہا ہوگا اور جس کا اب صرف ملبہ بچا ہے، وہ بھی اینٹوں سے بنایا گیا تھا۔ شہر کی سڑکوں کی دونوں جانب اینٹوں ہی کی دیواریں تھیں جن پر سفیدی بس وہاں کی گئی تھی جہاں جہاں کسی پینٹر نے حیدر آباد کے ایک حکیم کے اشتہار لکھے تھے۔ پورے سندھ میں اس ڈاکٹر کے اشتہار اردو میں لکھے نظر آئے لیکن سیہون میں یہ اشتہار سندھی میں لکھے گئے تھے۔ مکانوں کے چھتوں پر بھی سندھ کی قوم پرست تحریکوں کے

جھنڈے لگے تھے اور پہاڑی کے اوپر سرکاری گیسٹ ہاؤس کی دیوار پر وطن کے خلاف نعرہ بھی سندھی زبان میں لکھا تھا۔ رات گزارنے کے لیے میں وہاں پہنچا تو متعلقہ افسر نہ صرف بہت اخلاق سے پیش آئے بلکہ میرے سونے کے لیے انہوں نے وہ کمرہ کھلوا دیا جس میں ملک کے وزیراعظم قیام کرتے ہیں (افسر کا نام نہیں لکھ رہا ہوں۔ ڈرتا ہوں کہ قصرِ ابوظہبی کے محافظ کی طرح انہیں بھی کھڑے کھڑے برطرف نہ کر دیا جائے)۔

یہ گیسٹ ہاؤس کافی اونچائی پر ہے جہاں سے دور دور تک پھیلا ہوا دریائے سندھ نظر آتا ہے۔ اس کے کنارے اور اس کے ٹاپوؤں پر گھنے جنگل نظر آتے ہیں۔ ایک سرکاری افسر نے مجھ سے کہا کہ آپ اطلاع کیے بغیر اس علاقے میں آ گئے، ایسا نہ کرنا چاہیے تھا چنانچہ انہیں جیسے ہی میرے آنے کی اطلاع ملی انہوں نے پولیس حکام کو مطلع کر دیا۔ حیرت ہے درگاہ کے سامنے آسمان سے باتیں کرنے والے حضرت عباسؓ کے عَلم کے زیرِ سایہ بھی ڈاکوؤں کا خوف تھا۔

جس روز میں وہاں پہنچا، دنیا میں سب سے لمبے قد والے صاحب عالم چنّا کی شادی تھی۔ اس کی بڑی دھوم تھی۔ جب عالم چنّا کا نام گنیز بُک آف ریکارڈ میں چھپا کر دنیا میں سب سے بڑا قد اُن کا ہے تو دنیا میں سب سے زیادہ شہرت بھی ہوئی۔ اسی لیے اُس روز ان کی شادی میں دنیا بھر سے مہمان آئے ہوئے تھے۔ علاقے کے ڈاکو بھی یقیناً مسرور ہوں گے۔ عالم چنّا کے گھر کے دالان میں، بڑی بڑی اونچی چارپائیاں بچھی تھیں۔ سارے مہمان ان اونچی چارپائیوں پر بیٹھے تھے۔ وہ اتنی اونچی تھیں کہ ایک عالم چنّا کے سوا سب کی ٹانگیں جھول رہی تھیں۔

وہ شادی کے انتظامات کی نگرانی بھی خود کر رہے تھے۔ جیب میں نئے نئے نوٹوں کی گڈّی رکھی تھی، جو کوئی اخراجات کے سلسلے میں رقم طلب کرتا، وہ گڈی نکالتے، ہاتھ کے انگوٹھے پر تھوک لگا کر نوٹ گنتے اور اکھاڑ کر دے دیتے، انگوٹھے پر بھی مہندی کا رنگ ہاتھ پیروں کی طرح خوب چڑھا تھا۔ سیروں مہندی کھپ گئی ہوگی اُس روز۔

میں نے اپنی پلاؤ قورمے کی پلیٹ چارپائی کی ادوانوں پر رکھی اور خود دولہا سے باتیں کرنے لگا۔ میں نے کہا کہ عالم چنّا صاحب۔ آپ قد کے حساب سے دنیا کے سب سے بڑے آدمی ہیں، آج آپ کیا محسوس کرتے ہیں، کیا یہ شادی بھی دنیا کی سب سے بڑی شادی ہے؟

"جی نہیں۔ یہ تو دنیا کی سب سے چھوٹی شادی ہے۔ یہ تو محض ایک رسم ہے، اپنے اسلام کی سنّت ہے۔"

میں نے پوچھا کہ آپ کی دُلہن کا قد کتنا بڑا ہے ـــ وہ بولے ـــ "وہ عام لڑکیوں جیسا ہے ـــ"

میں نے کہا ـــ "آپ کیا چاہیں گے، آپ کے بچّے عام لوگوں جیسے ہوں یا آپ کی طرح درازقد ہوں۔ کس کو ترجیح دیں گے آپ؟ ـــ"

"وہ تو قدرت کے ہاتھ میں ہے، کسی کو بڑا کرے، کسی کو چھوٹا کرے۔ یہ تو اللہ کی شان ہے۔ ہم تو یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے جیسے ہوں، جتنی اللہ نے ہمیں عزت دی، ہمارا نام ہوا، اس طرح ان کا نام بھی ہو، ہماری دعا ہے کہ ہمارے بچّے بھی ایسے ہوں تاکہ ہماری بنیاد رہے ـــ"

میں نے پوچھا ـــ "آپ کی بیگم گھر کے کاموں سے واقف ہیں یا آپ باورچی، خان ساماں اور ملازم رکھیں گے؟ ـــ"

"نہیں۔ وہ تو دیہات کی لڑکی ہے، وہ ہر کام سے واقف ہے۔ جس طرح ہمارے دیہات کے لوگ رہتے ہیں، اُسی حساب سے اس کو بھی رہنا ہے۔"

میں نے کہا ـــ "آج کل جو شادیاں ہوتی ہیں ان میں لوگ روپیہ پانی کی طرح بہاتے ہیں، آپ نے کچھ خیال رکھا ہے؟ ـــ"

"میں غریب خاندان کا آدمی ہوں۔ ہمارے پاس حرام کے پیسے نہیں ہیں۔ ہم تو اپنی حیثیت کے مطابق زندگی بسر کرنے والے لوگ ہیں۔ لوگوں کے پاس شاید فالتو پیسے ہوتے ہیں۔ ہمارے پاس خون پسینے کی کمائی کے پیسے ہیں، اسی میں گزارا کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا ـــ "آخر میں یہ بتایئے کہ آپ کی بیگم اس رشتے اور اس شادی سے خوش ہیں؟ ـــ"

وہ بولے ـــ "ہاں، خوش نہ ہوتیں تو شادی بھی نہ ہوتی ـــ"

خیر سے عالم چنّا کے ہاتھ پیلے ہوئے۔ ہم نے دعائے خیر کی اور رات سرکاری مہمان خانے میں گزاری۔ اگلی صبح ہمیں حیدرآباد جانا تھا۔ خیال تھا کہ دھوپ اور گرمی بڑھنے سے پہلے نکل چلیں گے لیکن اعلیٰ سرکاری افسروں کا اصرار ہوا کہ درگاہ سے قریبی تعلق رکھنے والے عزت علی شاہ صاحب

سے ضرور ملاقات کریں۔ ان کے بزرگوں کا تعلق بھی درگاہ سے تھا، ان کے بچوں کا تعلق بھی ہوگا۔ ایسی شفقت سے ملے جیسے میں بھی اُن کا بچہ ہوں۔ حضرت شہباز قلندر کو بار بار شہنشاہ حضور کہتے تھے۔ ملک میں نظم وضبط کی بگڑتی ہوئی صورت حال پر بات چل نکلی۔ کہنے لگے ——" جہاں تک کہ آج کل کے حالات کا تعلق ہے تو میرا ایمان ہے، میں نے دیکھا ہے اور میں اپنے خدا کو حاضر وناظر جان کر بتانا چاہتا ہوں کہ جب بھی ایسے حالات ہوتے ہیں تو شہنشاہ حضور کو بڑا اضطراب ہوتا ہے اور اللہ کے حضور میں وہ دست بدعا ہوتے ہیں کہ مسلمانوں کا کشت وخون بند ہوجائے ——"

میں نے ان کا جملہ دہرایا ——" آپ نے فرمایا کہ جب فسادات ہوتے ہیں اور کشت وخون ہوتا ہے تو شہنشاہ حضور کو اضطراب ہوتا ہے، یہ آپ کیسے محسوس کرتے ہیں؟ ——"

جواب ملا ——" یہ، دل کا معاملہ ہے، دل ہی دل کو سمجھ سکتا ہے۔ ظاہری آنکھیں ان چیزوں کو نہیں دیکھ سکتیں۔"

میں بہت کچھ جاننے کا مشتاق تھا۔ میں نے عزت علی شاہ صاحب سے کہا کہ سنا ہے شہنشاہ حضور کے اب تک ۰۳۷ عرس ہو چکے ہیں۔ پرانے زمانوں میں عرس کا کیا عالم ہوتا تھا۔ اُس میں شرکت کے لیے کہاں کہاں سے کیسے کیسے لوگ آتے تھے۔ انہوں نے بہت دلچسپ باتیں بتائیں۔

" ہمارے آباؤ اجداد اور بزرگ بتاتے تھے کہ لوگ ایران سے، افغانستان سے، پشاور سے قندھار سے، یہاں تک کہ مسقط اور عمان سے آیا کرتے تھے، اونٹنیوں پر، گھوڑوں پر قافلے لے کر آتے تھے —— وہ وہاں سے ایک خاص موسم میں نکلتے تھے، اونٹنیوں اور گھوڑیوں کو وہاں سے زملا کر چلتے تھے، وہ یہاں آکر بچے دیتی تھیں، یعنی پورے بارہ مہینے سفر کیا کرتے تھے۔ یہ تھا اُن دنوں میں عالم سفر کرنے کا۔ بارہ مہینے کے سفر میں وہ چھ آٹھ مہینے یہیں سکونت کرتے تھے۔ یہ تھا ان کی عقیدت کا حال۔"

شہر بھر کے لوگ مجھ سے شکایت کر رہے تھے کہ محکمہ اوقاف والے درگاہ کی دیکھ بھال نہیں کرتے اور شہر کے حکام شہر کی حالت درست نہیں کرتے۔ میں نے عزت علی شاہ صاحب سے اس شکایت کی تصدیق چاہی اور پوچھا کہ درگاہ کے انتظام کا کیا حال ہے؟

" اوقاف کی طرف سے درگاہ کی کوئی خاص دیکھ بھال نہیں ہورہی ہے۔ یہی حال شہر کا ہے۔ بات

یہ ہے کہ یہاں باہر کے لوگ بہت زیادہ آتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ روزانہ آٹھ دس ہزار لوگ آتے ہیں۔ دس ہزار آدمیوں کا بندوبست کرنا، علاقے کی صفائی کرنا اور خیال رکھنا لوکل کونسل یا اوقاف کے بس کی بات نہیں ـــــ"

میں نے کہا ـــــ" آخر میں اپنے دل کی آنکھوں سے دیکھ کر فرمایئے کہ اس حالت زار کے بارے میں شہنشاہ حضور کیا محسوس کرتے ہیں؟ ـــــ"

کہنے لگے ـــــ" جہاں تک یہاں کے لوگوں سے شہنشاہ حضور کا پیار ہے، کئی لوگوں کو دیکھتا ہوں جو زیارت تک نہیں جاتے ـــ مجھے ایک بزرگ کا قصّہ یاد آیا، یہ کوئی آٹھ دس برس کی بات ہے، وہ بزرگ دربار میں گئے زیارت کے لیے۔ جس وقت مراقبے میں جاکر بیٹھے تو حکم ہوا کہ تم میرے شہر کے ایک غریب تانگے والے کو ناراض کر کے میرے پاس آئے ہو مجھ سے فیض لینے۔ جاؤ پہلے اس کو مناؤ۔ وہ بزرگ صاحب گھبرائے ہوئے باہر نکلے، سخت پریشان، اور پوچھ رہے تھے کہ فلاں کالے گھوڑے والا تانگہ کدھر ملے گا۔ وہ دبلا پتلا تانگے والا کدھر ہے جس کی چھوٹی سی ڈاڑھی ہے، وہ کہاں ہوگا۔ آخر انہوں نے تانگے والے کو ڈھونڈ لیا اور بولے کہ بابا، میں نے صبح تم کو تین روپے کی بجائے دو روپے دیئے تھے۔ تم ایک روپے کی وجہ سے مجھ پر ناراض ہوئے تھے۔ یہ لو پانچ روپے لو، تم اپنی ناراضگی ختم کر دو ـــــ تو یہ ہے ایک غریب تانگے والے کے لیے شہنشاہ حضور کی محبّت، اپنے شہر اور شہریوں کے لیے ان کی محبّت ـــــ"

شہنشاہ حضور کی محبت کی باتیں ہو رہی تھیں۔ عزّت علی شاہ صاحب بتا رہے تھے کہ سیہون آنے والا ہر شخص شہنشاہ حضور کی مرضی سے یہاں آتا ہے اور جب ان کی مرضی ہوتی ہے تب جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد شاہ صاحب نے مجھ سے پوچھا" اب دوبارہ کب آیئے گا؟ ـــــ"

میں نے کہا" میں کیا جانوں۔ آپ شہنشاہ حضور سے پوچھ کر مجھے بتایئے"! ہم لوگ دیر تک ایسی ہی باتوں سے محظوظ ہوتے رہے۔ اُٹھتے اُٹھتے دوپہر ہوگئی۔ شاہ صاحب نے اور حکام نے مجھے بہت پیار سے رخصت کیا مگر میں پریشان تھا کہ حیدرآباد پہنچتے پہنچتے بہت دیر ہو جائے گی۔

میری کار حیدر آباد کی سمت لوٹ رہی تھی کہ ایک جگہ ویرانے میں لوگوں کو سراسیمہ کھڑے دیکھا۔ پولیس والے اور وردی پوش رینجرز جنگلوں سے نکل کر باہر آ رہے تھے۔ لوگوں نے بتایا کہ یہ ڈاکوؤں کا پیچھا کرتے ہوئے گئے تھے۔ ڈاکو صبح کے وقت یہیں سڑک پر کھڑے آتی جاتی گاڑیوں کے مسافروں کو لوٹ رہے تھے۔

کسی نے کہا — "آپ تاخیر سے آئے، بچ گئے —"

میں نے کہا — "میں بچا نہیں۔ مجھے بچایا گیا ہے —"

آخری پناہ گاہ

"حیدرآباد اب بہت بدل گیا ہے۔ کچھ اس طرح بھی بدلا ہے کہ ہم نے بچپن میں جو حیدر آباد دیکھا تھا اس کے راستوں پر درخت ہوا کرتے تھے، فٹ پاتھ ہوا کرتے تھے۔ سکون ہوا کرتا تھا۔ وہ آج ختم ہوگیا ہے۔ ایک عجیب معاشی بدحالی میں یہ شہر گھر گیا ہے اور سب سے بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ یہ شہر جس کو میاں غلام شاہ کلہوڑو نے امن کا شہر قرار دیتے ہوئے جب قلعے پر تختی نصب کرائی تھی تو اس پر ایک فارسی شعر لکھوایا تھا جس کا مطلب یہ تھا کہ یا خدا یہ شہر امن کا شہر بنے۔ آج یہ شہر امن کا شہر نہیں ہے اور یہاں بھائی بھائی کا دشمن ہے۔"

یہ بات اس روز مجھ سے حیدر آباد کے سرکردہ صحافی مدد علی سندھی نے کہی — مَیں جس صبح حیدر آباد پہنچا شہر میں سراسیمگی تھی۔ لوگ سرگوشیاں کر رہے تھے۔ کہتے تھے کہ ریشم گلی کے آگے کہیں گولی چلی ہے، دو بچے مر گئے ہیں۔ ایک تو یہ گلی ریشم کے نام پر۔ اس میں گولیوں کا داغا جانا اور بچوں کا مارا جانا، یوں لگا کہ حیدر آباد کی زندگی سے لطافت بھی نکل گئی تھی اور ذہانت بھی۔ جن سڑکوں پر مجمع کی وجہ سے پیدل چلنا دوبھر تھا۔ اب ان پر ہُو کا عالم تھا۔ لوگ دہشت زدہ پرندوں کی طرح پر سیٹ کر کہیں گھونسلوں میں دبک گئے تھے، اور وہ بھی خاردار گھونسلوں میں۔

حیدر آباد کی کہانی دلچسپ ہے۔ بہت کم لوگ جانتے ہیں کہ اس شہر نے اپنی زندگی کی صرف دو صدیاں دیکھی ہیں۔ اس شہر کے قدیم باشندے مراد علی مرزا بتا رہے تھے —— "حیدر آباد شہر ویسے تو اتنا قدیم نہیں ہے۔ دو سو سوا دو سو برس پہلے ۱۷۶۸ء میں اس کا سنگ بنیاد رکھا گیا تھا۔"

سندھ پر حکمرانی کرنے والے کلہوڑو خاندان نے اپنا پایہ تخت یہاں سے دور دادو میں بسایا تھا مگر دریا

کی بپھری ہوئی موجوں نے انہیں وہاں چین سے نہ رہنے دیا۔ اسی طرح ڈھائی ہزار سال پہلے موئن جودڑو اجڑا تھا۔ اسی طرح ان کا شہر بھی دریا کے ڈوبتے کناروں کے ساتھ ساتھ پانی میں ڈھلک گیا تو انہیں نئی بستی کے لیے نئے ٹھکانے کی تلاش ہوئی۔

سندھ کے سرکردہ تاریخ داں ڈاکٹر مبارک علی نے باقی داستان سنائی "کلہوڑوں کا دارالخلافہ خدا آباد تھا، وہاں کوئی ۱۷۵۸ء میں بڑا زبردست سیلاب آیا، ان کا دارالخلافہ ڈوب گیا تو انہوں نے اس بات کی ضرورت محسوس کی کہ کوئی نیا دارالخلافہ بنایا جائے چنانچہ انہوں نے یہ جگہ منتخب کی جہاں اب حیدرآباد ہے۔"

کلہوڑوں نے سب سے پہلے قلعہ بنایا اور اس کے اندر رہنے لگے۔ تھوڑے ہی عرصے بعد تالپور خاندان کی حکمرانی ہوئی۔ وہ بھی اسی قلعے کے اندر رہ پڑے۔ قلعے میں بس کچھ عمارتیں تھیں، سادہ اور معمولی۔ جہاں اب پھلیلی کا علاقہ اور مرزاؤں کا محلّہ ہے یہاں پرانا شہر آباد ہوا۔ اور جہاں حاکموں کا قلعہ ہو جس کے صدر دروازے سے رات دن سواریاں آیا اور جایا کرتی ہوں وہاں رونق کے کچھ اور اسباب پیدا ہو جاتے ہیں چنانچہ قلعے کے سامنے ہی بازار بن گیا جو آج تک شاہی بازار کہلاتا ہے۔ بقول ڈاکٹر مبارک علی، یہ بھی ایک پرانی اسلامی روایت تھی کہ مسلم شہروں کے اندر چھتے دار بازار ہوا کرتے تھے تاکہ گرمی اور بارش میں بچت ہو سکے۔ چنانچہ سندھ کے کئی شہروں میں شاہی بازار موجود ہیں۔

۱۸۴۳ء تک کلہوڑے بھی گئے، تالپور بھی رخصت ہوئے اور اس درویش کی پشین گوئی سچ نکلی جس نے دریائے سندھ میں سفید فام انگریزوں کی کشتیوں کے پہلے بیڑے کو گزرتے دیکھا تو کہا کہ فرنگیوں نے دریا کا راستہ دیکھ لیا ہے، اب سندھ کی خیر نہیں۔ اس سرزمین پر انگریزوں کا قبضہ ہوا۔ حیدرآباد شہر کی شکل و صورت بدلنے لگی۔

ڈاکٹر مبارک علی بتا رہے تھے "۱۸۵۰ء میں انگریزوں نے قلعے کے جنوب کی جانب اپنی چھاؤنی بنائی، یہیں اپنے مشن اسکول بنائے، اسپتال بنائے اور اپنی دوسری عمارتیں بنائیں جو آج بھی صدر کا علاقہ یا چھاؤنی کا علاقہ کہلاتا ہے۔"

مگر انگریز کی نگاہ کراچی کی بندرگاہ پر تھی۔ یہ نہایت عمدہ اور محفوظ بندرگاہ برصغیر کے اس پورے

علاقے کا دروازہ بن سکتی تھی۔ یہ خوبیاں دیکھتے ہی انگریز نے سندھ کا صدر مقام حیدر آباد سے اٹھایا اور کراچی پہنچا دیا۔ لیکن اُس وقت تک حیدر آباد کے نصیب بیدار ہو چکے تھے۔ سدھرنا اور سنورنا اس کے مقدر میں لکھا جا چکا تھا اور اس مرتبہ یہ کام ایک دوسری قوم نے سنبھالا ـــ ڈاکٹر مبارک علی نے بتایا: "جب یہاں پر ہندو تاجر طبقہ خوش حال ہوا اور انہوں نے غیر ملکوں میں جب اپنی تجارت قائم کی تو وہاں سے ان کے پاس پیسہ بھی آیا۔ انہوں نے حیدر آباد میں نئے علاقے بسائے۔ ان کا آباد کیا ہوا سب سے مشہور علاقہ ہیر آباد ہے۔ یہاں پر ہندوؤں کی دو برادریاں تھیں ایک بھائی بند کہلاتی تھی اور دوسری عامل کہلاتی تھی۔ عاملوں نے یہاں اپنی عامل کالونی بنائی جو حیدر آباد کا بہت ہی خوبصورت علاقہ ہوا کرتا تھا۔ اس میں بہت سے مکانات ایسے ہیں جہاں پائیں باغ بھی ہیں۔ مکانوں کی تعمیر میں انہوں نے غیر ملکوں سے لایا ہوا سامان لگایا۔ ہندو تاجروں کی ایک روایت یہ بھی تھی کہ وہ زندگی بھر سمندر پار ملکوں میں تجارت کیا کرتے تھے لیکن مرنے کے لیے وہ یہیں اپنے شہر میں آیا کرتے تھے۔ تو اس لحاظ سے انہوں نے اس شہر کو بہت خوبصورت بنایا۔ گاڑی کھاتے کے علاقے میں ان کی خوبصورت تعمیرات آج بھی دیکھی جا سکتی ہیں۔ چھتوں پر بہت خوبصورت کام ہوا ہے، دروازوں پر بھی منقش کام ہے۔ دیواروں اور فرش پر ٹائل بہترین لگائے گئے ہیں کچھ مکان اب بھی اُسی حالت میں باقی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب اس روز مجھے بتا رہے تھے کہ خوش حال ہندوؤں نے شہر حیدر آباد کا کردار بدل ڈالا اور اس کو نہ صرف زندہ، جیتا جاگتا شہر بنا دیا بلکہ اس کی زندگی میں بیک وقت دلکشی اور دانشوری کے رنگ گھول دیئے۔

"ہندو مڈل کلاس جو تعلیم یافتہ تھی، اس نے خاص طور پر حیدر آباد کو خوبصورت بنایا۔ انہوں نے باغات بہت قائم کیے۔ جگہ جگہ باغات کے علاوہ انہوں نے کتب خانے بہت کھولے۔ ایک زمانے میں حیدر شہر باغات کا شہر کہلاتا تھا۔ شہر کے اندر بھی اور ارد گرد بھی بہت باغات تھے۔ پھر انہوں نے علمی لیکچرز کے لیے لیکچر ہال بنوائے، مثلاً تھیوسوفیکل سوسائٹی کی طرف سے بیسنٹ ہال اب تک موجود ہے۔ یا ہوم سٹیڈ ہال تھا جس میں ہندوستان کے بڑے بڑے لوگ آیا کرتے تھے اور لیکچر دیا کرتے تھے تو اس کی وجہ سے حیدر آباد کی کلچرل لائف بہت زیادہ اچھی تھی۔ پھر یہاں

انہوں نے مختلف کلب قائم کیے۔ جیسے اس وقت کا دیال داس کلب ہے، جمخانہ ہے، وہاں ڈرامے بھی ہوا کرتے تھے اور ادبی نشستیں ہوا کرتی تھیں، ان تمام چیزوں نے حیدر آباد کو ثقافت کے اعتبار سے بہت ترقی یافتہ کر دیا تھا۔"

یہ تو تھیں ڈاکٹر مبارک علی کی باتیں۔ مراد علی مرزا صاحب نہ صرف ریڈیو پاکستان کے پرانے افسر اور شہر کے قدیم باشندے ہیں بلکہ اس سرزمین کی علمی، ادبی اور ثقافتی زندگی میں خوب رچے بسے ہیں۔ اس دن جو شہر کی بات چلی تو جلد ہی حیدر آباد کی شاموں کا ذکر چھڑ گیا۔ ساری دنیا جانتی ہے، اور نہیں جانتی تو اب جان لے کہ اس شہر میں دن بھر کتنی ہی آگ برسے، شام آتی ہے تو انسان کے تپتے ہوئے وجود پر ٹھنڈا پھایا رکھ دیتی ہے۔ میں نے مراد علی صاحب سے پوچھا کہ وہ جو اچھے دن تھے، ان دنوں کی شامیں یاد ہیں آپ کو؟ لوگ ٹہلنے نکلتے ہوں گے۔ بگھیوں میں بیٹھ کر ہَوا خوری کے لیے دریا کے کنارے جاتے ہوں گے؟

وہ بولے ——"جی ہاں میں نے خود دیکھا، میں خود بھی جایا کرتا تھا، آپ نے حیدر آباد دیکھا ہے، گرمیوں کے زمانے میں دن بھر کتنی ہی گرمی ہو، جیسے ہی سورج ڈھلا اور شام ہوئی، ہلکی ہلکی ہَوا چلنی شروع ہوتی ہے، ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا۔ حیدر آباد کی شامیں تو مشہور و معروف ہیں۔ اُس زمانے میں یہ ہوتا تھا کہ جتنے بھی شرفا اور امرا تھے، جو صاحبِ حیثیت ہوتے تھے وہ اپنی گاڑیوں میں بیٹھ کر جاتے تھے۔ دریا کے کنارے گدو بندر میں ایک پارک بنا ہوتا تھا، وہ بڑا خوبصورت تھا۔ وہاں بنچیں رکھی ہوتی تھیں جن پر لوگ بیٹھتے تھے، سامنے دریا بہہ رہا ہوتا تھا۔ اور جناب، وہ جو باغ تھا اس میں بہت زیادہ پھول لگے ہوتے تھے۔ ایک تو باغ، دوسرے دریا کا کنارہ، پھر وہ شام کی ہَوا، بہت اچھا منظر ہوتا تھا، لوگ بہت خوش ہوتے تھے۔"

پرانے وقتوں کی بات سن کر میں مچل اُٹھا۔ "اچھا بتائیے۔" میں نے بیتابی سے پوچھا —"کیسا تھا شہر اُس وقت، کیسی زندگی تھی، کیسی آبادی تھی؟—"

وہ بولے ——"تقسیم سے پہلے اس شہر کی آبادی تقریباً دو لاکھ تھی۔ بہت چھوٹا سا شہر تھا۔ یہاں اتنی گاڑیاں نہیں تھیں۔ تانگے چلتے تھے اور لوگ زیادہ تر پیدل چلتے تھے۔ بہت مالدار لوگ کبھی کبھار موٹر گاڑیوں میں نظر آتے تھے، لیکن عموماً لوگ زیادہ تر پیدل ہی چلتے تھے، اور شہر میں باغ بڑے

تھے۔ ہر کونے میں اچھا باغ تھا۔ صاف ستھرے رستے تھے اور کھلے کھلے رستے تھے۔ اِس زمانے جیسی گہما گہمی نہیں تھی، سکون تھا اور ٹریفک زیادہ نہیں تھا۔ لوگ چین سے تھے۔ کیونکہ پورے شہر میں سکون تھا۔ تو یہ صورتحال تھی۔ لیکن برصغیر کی تقسیم کے بعد آبادی بڑھنی شروع ہوئی اور ایسا صرف حیدر آباد شہر ہی میں نہیں، پوری دنیا میں ہوا۔ یہ قدرتی عمل تھا۔ بہرحال حیدر آباد میں بھی وہی حالت ہے کہ زیادہ لوگ ہیں، زیادہ ٹریفک ہے۔ وہ سکون جو تھا، وہ غائب ہے۔"

اور سکون صرف غائب ہوتا تب بھی غنیمت تھا۔ سکون چھن گیا ہے اور لُٹ گیا ہے۔ حیدرآباد اب پہلا سا حیدر آباد نہیں رہا۔ اس روز میں ریشم گلی کے ایک چھوٹے سے چوراہے میں کھڑا تھا۔ گولی جو چلی تو دکان دار جلدی جلدی دکانیں بند کرکے بھاگے اور خریدار ایسے غائب ہوئے جیسے کبھی آئے ہی نہ تھے۔ بس سامنے ہندوؤں کے زمانے کی ایک عمارت کے برآمدے میں ٹائیلوں کے فرش پر بیٹھا ہوا ایک تنہا لڑکا خود اپنے آپ سے کھیل رہا تھا۔

ابھی پچھلی ہی شام ڈاکٹر مبارک علی سے یہی باتیں ہو رہی تھیں کہ حیدر آباد کے مزاج اور کردار میں یہ انقلاب کیسے آیا۔ اس شہر میں جتنی بھی خوبیاں تھیں ایک ایک کرکے وہ ساری کیسے مٹ گئیں اور حالات اور حکام کی آنکھوں پر وہ پٹی کیسے بندھی جس نے پورے شہر کو نابینا کر دیا۔

ڈاکٹر صاحب کا جواب!

"ظاہر ہے کہ ہندوستان سے مہاجر بہت بڑی تعداد میں آئے۔ رہائش کے مسائل نے سر اُٹھایا۔ پھر آبادی بڑھنی شروع ہوئی چنانچہ اس کے بعد سے رفتہ رفتہ حیدر آباد شہر کا ڈھانچہ بدلنے لگا۔ اب مثلاً ہیرآباد اور عامر کالونی کے اندر اب یہ ہوگیا ہے کہ پرانے مکانوں کو گرا کر نیچے دکانیں اور اوپر فلیٹ بنا دیئے گئے ہیں۔ یہاں شہر میں جتنے باغات تھے ان میں سے زیادہ تر کو خود میونسپلٹی نے ختم کیا اور ختم کرکے وہاں دکانیں کھول دیں، فلیٹ بنوا دیئے۔ مثلاً یہاں سرفراز پارک ہوا کرتا تھا، وہ ختم ہوا۔ جہاں اب حیدر چوک ہے یہاں ایک پارک تھا، وہ بھی مٹ گیا۔ گول بلڈنگ جہاں ہے یہاں پارک تھا، وہ بھی رخصت ہوا ــــ اسٹیشن کے سامنے دو بڑے خوبصورت پارک ہوا کرتے تھے اور دونوں ختم ہوئے۔ پھر گورنمنٹ کالج کے برابر میں تین چار باغات ہوا کرتے تھے، وہ سارے ختم ہوئے، آخری پارک جو ختم ہوا، جس کا مجھے بے حد افسوس ہے وہ تھا پریم پارک، وہ کینٹ کے علاقے

کے اندر تھا۔ اس کو بھی ختم کیا گیا، اس کے اندر بھی فلیٹ اور مکانات بنا دیے گئے ہیں اور ان کے باہر دکانیں نکال دی گئی ہیں۔ تو اب صورتحال یہ ہے کہ حیدرآباد شہر میں کوئی بھی کھلی ہوئی جگہ باقی نہیں رہی ہے۔ کوئی پارک نہیں رہا ہے اور یہی حال یہاں کتب خانوں کا ہوا ہے کہ جتنے کتب خانے تھے ایک ایک کر کے سارے ختم ہوتے چلے گئے۔ تو اس وقت حیدرآباد کی صورت یہ ہے کہ تنگ گلیاں، تنگ سڑکیں ہیں۔ ٹریفک بہت ہو گیا ہے، بلڈنگیں بنتی چلی جا رہی ہیں بغیر سوچے سمجھے کہ ماحول پر ان کے اثرات کیا ہوں گے، لوگوں کی صحت پر ان کے کیا اثرات ہوں گے۔ یہاں پارٹیشن سے پہلے اسکولوں کی بہت عمدہ عمارتیں تھیں۔ ان اسکولوں کی عمارتوں کو بھی توڑ کر مارکیٹیں بنا دی گئی ہیں۔ مثلاً سٹی کالج کو مارکیٹ بنا دیا گیا۔ نور محمد ہائی اسکول کو مارکیٹ بنا دیا گیا۔ تو یہ تمام تعلیمی ڈھانچہ کاروباری ڈھانچے میں بدل گیا۔ اب بچّوں کو اسکولوں میں تعلیم کا ماحول نہیں ملتا۔ ان کو کھیلنے کے لیے میدان نہیں ملتے۔ تفریح کے لیے پارک ملتے ہیں نہ پڑھنے کے لیے کتب خانے ملتے ہیں۔ تو ان تمام چیزوں کا ہم کوئی نتیجہ نکالیں تو بڑی آسانی سے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس وقت حیدرآباد کے نوجوان کا ذہن جو تشدّد کی طرف جا رہا ہے اس کی وجہ سمجھ میں آتی ہے کہ ہمارا شہر اُن کو کچھ نہیں دے رہا ہے۔"

ہاں تو میں ریشم گلی کے ایک چھوٹے سے چوراہے میں کھڑا تھا، گولی چل چکی تھی، دکاندار اور خریدار غائب ہو چکے تھے اور سامنے ہندوؤں کے زمانے کی ایک عمارت کے برآمدے میں ٹائیلوں کے فرش پر بیٹھا ہوا ایک تنہا لڑکا اپنے آپ سے کھیل رہا تھا۔

مَیں نے اُس کے قریب جا کر پوچھا "کیا نام ہے تمھارا؟—"

"نانک"

"کیا کرتے ہو تم؟—"

"اسکول میں پڑھتا ہوں"

"اور کہاں رہتے ہو؟"

"لیاقت کالونی میں"

"اس وقت یہاں ریشم گلی میں کیا کر رہے ہو تم؟—"

"ابھی ہم کام کر رہے ہیں—"

"کیا کام کرتے ہو؟—"

"میری امّی غسل خانہ دھوتی ہیں، میں کچرا اُٹھاتا ہوں—"

"مگر یہاں تو گولی چل گئی، کچھ بچّے مر گئے، تمہیں ڈر نہیں لگتا؟—"

وہ کھیلتے کھیلتے رک گیا۔ اس نے میری آنکھوں میں غور سے دیکھا جیسے میرا سوال دوبارہ پڑھ رہا ہو اور پھر بولا "نہیں، میں ہر وقت اپنی امّی کے ساتھ رہتا ہوں۔"

بس۔ نئی نسل کے لیے اب یہی ایک پناہ گاہ بچی ہے۔

جینے کا آرزومند شہر

حیدر آباد سندھ کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ پاکستان بننے سے پہلے اس کی آبادی تین لاکھ تھی، اب نو لاکھ ہے۔ اُس وقت کہتے ہیں کہ اس کی نالیوں میں صندل کا پانی بہا کرتا تھا۔ اب خون بہتا ہے۔

حیدر آباد کے بارے میں سب جانتے ہیں کہ پہلے پہل یہاں کی پرانی آبادی اور نئے آباد کاریوں مل کر رہے جیسے دودھ میں گھلی ہوئی شکر۔ پھر حالات کے ڈھنگ اور سیاست کے رنگ بدلے، دودھ پھٹ گیا، شکر پھیکی پڑ گئی۔

یہ شہر اب اداس کرتا ہے، لیکن ایک بات طے ہے۔ اداس تو کرتا ہے، مایوس نہیں کرتا۔ اس شہر پر موت کے سائے کتنے ہی منڈلائیں، اس شہر میں جینے کی امنگ خوب خوب زندہ ہے۔ وقت نے ہو سکتا ہے اس کی چال بدل دی ہو لیکن اس کے اُٹھتے ہوئے قدموں کو روکا نہیں۔ حیدر آباد کے باشندے اب بھی — یا یوں کہئے کہ ابھی تک آگے کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن کب تک دیکھتے رہیں گے، اس کا علم خدا کو ہوگا اور اس کا اندازہ اہلِ سیاست کو۔

آئیے آج دیکھیں کہ وقت کے اس سرد خانے میں زندگی کی ابھی کتنی حرارت باقی ہے۔ جینے کی اُمنگ کچھ تو انسان میں ڈھونڈیں، کچھ دنیاوی مال اسباب میں کہ یہ اگرچہ باہر کی علامتیں ہیں لیکن اندر کی کہانیاں کہتی ہیں۔

میں چلا جا رہا تھا۔ فوجداری روڈ پر ایک بڑے سے احاطے میں بہت سے کاریگر بیٹھے ٹین کے ٹرنک اور پیٹیاں بنا رہے تھے۔ کھلے آنگن میں سینکڑوں پیٹیاں چُنی ہوئی تھیں، نیچے بڑی، اوپر چھوٹی۔

کارخانے کے مالک جمیل احمد صاحب کبھی دہلی سے چل کر یہاں آئے تھے۔ حیدر آباد میں انہوں

نے بہت سے دوسرے کاروبار کرنے چاہے مگر ناکام ہوئے اور بالآخر باپ دادا کا کاروبار شروع کیا اور کامیاب ہوگئے۔

میں نے جمیل احمد صاحب سے پوچھا کہ کیا آپ نے یہ باقاعدہ کارخانہ قائم کر رکھا ہے، وہ بولے ـــ ”جی ہاں۔ مگر میں اس کو کارخانہ نہیں کہوں گا۔ یہ گھریلو صنعت ہے۔ اس میں چھ سات کاریگر ہیں اور ایک دو ان کے مددگار ہیں۔ شہر میں اس طرح کے پچیس تیس کارخانے ہیں اور جن میں چھ سات کاریگر کام کرتے ہیں وہ بڑے کارخانے تصور کیے جاتے ہیں۔“

پیٹیوں کے انبار میں سب سے نیچے بہت ہی بڑے بڑے ٹرنک رکھے تھے۔ میں نے حیران ہوکر پوچھا ”یہ کس کام آتے ہوں گے؟ ـــ“

وہ بولے، ”یہ بڑی پیٹیاں ہیں۔ عموماً ان میں سردیوں یا گرمیوں کے بستر رکھے جاتے ہیں ویسے آج کل لوگ چھوٹی موٹی چیزیں ڈالتے رہتے ہیں۔ اس کے علاوہ غریب لوگ اپنی بچیوں کا جہیز ان میں جمع کرتے رہتے ہیں اور شادی کے وقت یہ ٹرنک بھی گفٹ کر دیتے ہیں۔“

میں نے پوچھا کہ آج کل کونسی پیٹیوں کی مانگ زیادہ ہے۔ ان کے چھوٹے سے جواب نے زندگی کے طورطریقوں کی پوری داستان کہہ دی۔ وہ بولے ”پہلے بڑی پیٹیوں کی مانگ کم تھی، مگر اب زندگی آگے بڑھ رہی ہے۔ اب جہیز کی ڈیمانڈ زیادہ ہے لہٰذا بڑی پیٹیوں کی زیادہ ڈیمانڈ ہے۔“

مجھے یہ فقرہ ٹریفک کے شور میں کچھ یوں سنائی دیا کہ اب بیٹیوں کی ڈیمانڈ کم اور پیٹیوں کی ڈیمانڈ زیادہ ہے۔ بہرحال زندگی کی پیش رفت اس روز پیٹیوں کے سائز سے ناپی گئی۔

اب میں اور آگے بڑھا۔ بقرعید قریب تھی اور حیدرآباد کی ریشم گلی میں خریداروں، خصوصاً خواتین کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ چمکیلے لباس کی ایک دکان کے اندر ایک اور چھوٹا سا کارخانہ نظر آیا جس میں کاریگر کپڑے پر افشاں جیسی کسی چیز سے بوٹے اور ستارے اُبھار رہے تھے۔ کارخانے کے مالک غلام حسین صاحب سے میں نے پوچھا کہ پہلے ہی یہ کپڑا اچھا بھلا شوخ تھا، اس پر اتنا چمکدار کام کون کراتا ہے؟۔ وہ کہنے لگے کہ اس کا بہت رواج ہے۔ بتانے لگے کہ پہلے نہیں تھا مگر جب سے یہ چمک دار پاؤڈر جاپان سے آنے لگا ہے، خواتین لباس پر یہ کام بہت بنواتی ہیں۔ میں

نے کہا، "کافی لاگت آتی ہو گی؟"

بولے — "جی ہاں، لیکن خواتین کے پاس اب وسائل بھی کافی ہیں۔"

میں نے کہا — "آپ تو بہت مصروف رہتے ہوں گے؟"

کہنے لگے — "جی ہاں، بہت کام ہے۔ فرصت نہیں ہے۔ پورا خاندان مصروف ہے۔"

غلام حسین صاحب کی یہ بات سن کر گماں ہوا کہ اب دکان دار کا خاندان خریدار کے خاندان سے جدا نہیں۔ یہ سوچتا ہوا میں ریشم گلی میں اور آگے بڑھا اور اب کے ایک مختلف منظر دیکھا۔ بہت سے لوگ مل کر دو نوجوانوں کو مار رہے تھے۔ جان سے نہیں، ہاتھ پاؤں سے — اور آوازیں کچھ اس قسم کی آ رہی ہیں کہ: ابے اکڑ کیوں رہا ہے۔ ادھر چل ۔ ماں ۔ بہن ۔ وغیرہ وغیرہ۔ ایک صاحب مارنے والوں میں تو نہیں البتہ مجمع میں شریک تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کیا مسئلہ ہے۔

کہنے لگے — "یہ لوگ آجاتے ہیں یہاں، خواتین کو چھیڑتے ہیں، ٹلّہ مار دیتے ہیں۔ اب ہمارے ساتھیوں نے پکڑ کر انہیں مارا ہے۔" میں نے پوچھا کہ کیا ریشم گلی میں یہ چھیڑ چھاڑ بہت ہوتی ہے؟

وہ بولے — "ریشم گلی میں ذرا زیادہ ہی ہوتی ہے۔"

"اور چوری چکاری؟"

"نہیں، وہ بالکل نہیں ہوتی —" سارا مجمع بولا

ایک آواز آئی "میں تالہ ساز ہوں۔ یہاں تالے کبھی نہیں ٹوٹتے۔"

میں نے کہا — "پھر آپ کا روزگار تو بہت ہی کم ہوگا —"

وہ بولے "بہت ہے صاحب۔ لوگ چابیاں گم کر دیتے ہیں یا گھر بھول آتے ہیں، تو میں تالا کھلائی کے بیس روپے لیتا ہوں۔"

میں نے پوچھا — "آج کل کون سے تالے زیادہ چلتے ہیں؟"

جواب ملا — "آج کل تو صاحب چینی تالوں کا زمانہ ہے۔ ہوتے بھی اچھے ہیں۔"

میں نے کہا — "پھر تو بڑی مشکل سے کھلتے ہوں گے؟"

"دوسروں کے لیے مشکل ہوں گے۔ ہم آسانی سے کھول لیتے ہیں، پچپن سال ہو گئے ہیں یہ کام کرتے کرتے۔"

"کیا آپ علی گڑھ کے ہیں؟—"

"نہیں صاحب۔ میں اجمیر کا ہوں۔ وہاں بھی یہی کام کرتا تھا۔ باپ دادا کا یہی کام تھا۔"

یہ احمد سعید خاں قفل ساز تھے اور پچپن سال کی مشقّت کے بعد نئے زمانے کا ترقّی یافتہ تالا کھول دینا ان کے بائیں ہاتھ کا کام تھا۔ سرزمین پاکستان کی، قفل ساز اجمیر کا، تالا چین کا اور زمانہ بے چینی کا۔

وہیں ریشم گلی میں میری ملاقات ایک استاد سے ہوئی جن کا نام پرویز راجپوت ہے۔ میں نے ان کی شخصیت میں زندہ رہنے اور آگے بڑھنے کی اُمنگ کو ٹٹولنا چاہا اور پوچھا کہ آپ کئی برس سے استادی کا پیشہ اختیار کیے ہوئے ہیں۔ اُس سے پہلے آپ طالب علم رہے ہوں گے۔ اب بتائیے، آج کے معاشرے میں استاد کی کیا حیثیت ہے؟

"دیکھیں، جب ہم پڑھتے تھے، اس زمانے میں اور آج کے زمانے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ اُس وقت اساتذہ اور طلبا کے درمیان باپ بیٹے کا رشتہ تھا۔ اب وہ ختم ہوگیا ہے۔ وہ احترام ختم ہوگیا ہے۔ اب تو ٹیچر خود طلبا کے ماتحت ہے، جو وہ کہتے ہیں ٹیچر کو کرنا پڑتا ہے۔"

یہ سُن کر میں نے پوچھا— "تو اب آپ کو کیا محسوس ہوتا ہے۔ استادی کا پیشہ اختیار کر کے آپ نے بُرا کیا؟"

وہ بولے— "نہیں خیر ایسی بات تو نہیں ہے، میری ہمیشہ سے خواہش تھی ٹیچر بننے کی، وہ پوری ہوگئی البتہ تعلیمی اداروں کے حالات سدھارنے کے لیے کچھ ہونا چاہیے—"

میں نے الفاظ بدل کر اپنا سوال دُہرایا— "تو کیا آپ کی ملازمت کے دوران کوئی ایسا مرحلہ آیا جب آپ نے سوچا ہو کہ یہ پیشہ ترک کر دیا جائے؟"

انھوں نے بھی الفاظ بدل کر وہی جواب دہرایا— "نہیں خیر، ایسا بھی نہیں ہے۔ مجھے تو خوب سے خوب تر کی تلاش ہے۔ میں ایم اے ہوں اور ایل ایل بی ہوں۔ میں کوشش کر رہا ہوں کہ کالج میں لیکچررشپ مل جائے یا کوئی دوسری اچھی پوسٹ مل جائے تو میں آگے جاؤں گا۔"

پرویز راجپوت سے ہونے والی یہ باتیں سُن کر ایک طالب علم میرے قریب آگیا۔ اس کا نام ندیم تھا۔ اُسے احساس ہوا کہ میں اُن لوگوں کی داستانیں ڈھونڈتا پھر رہا ہوں جنھوں نے حالات کے

آگے ہتھیار نہیں ڈالے اور وقت جن کے آگے رکاوٹ بن کر کھڑا نہیں ہوا۔

ندیم کہنے لگے —— "سر! میں ایک نوجوان کو جانتا ہوں اور میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ ایم بی بی ایس تھا لیکن رکشہ چلا رہا تھا۔ وہ کہتا تھا کہ میں عام انسان ہوں، کوئی افلاطون کا بچہ نہیں ہوں اور یہ کہ محنت میں عظمت ہے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ اگر ضرورت پڑی تو میں مزدوروں کی طرح بوجھ بھی اٹھاؤں گا۔ سر، وہ ایم بی بی ایس تھا۔ وہ چاہتا تو منسٹر کے پاس جا کر ڈاکٹری کی کوئی اچھی پوسٹ لے سکتا تھا لیکن سر اس کے پاس وسائل نہیں تھے کہ منسٹر کو منہ دے سکے کیونکہ منسٹر کو بھی منہ دینے کے لیے قائداعظم چاہیئے۔"

جو نہیں جانتے انہیں سمجھاتا چلوں کہ پاکستان میں بڑی رقم کے نوٹوں پر قائداعظم کی تصویر چھپی ہوتی ہے۔ اشارہ بانیٔ پاکستان کی طرف نہیں، رشوت کے نوٹوں کی طرف ہے۔

اب میں اور آگے چلا اور بازار کے ماحول میں کھو کر زندگی کے سراغ پانے کی کوشش کی۔ سندھ کے بازاروں میں کوئی خالص یوپی کے لب و لہجے میں صدا لگا رہا تھا —— "آنکھوں والو۔ یہ آنکھیں بڑی نعمت ہیں۔ اللہ کسی کو ان آنکھوں سے محروم نہ کرے۔" مجمع گزرتا چلا گیا، روپیہ دینا تو درکنار، کسی نے آمین تک نہ کہا البتہ ایک بڑا مجمع لگا تھا جس کے اندر سے ایک آواز مسلسل آئے چلی جا رہی تھی: روپیہ روپیہ، سب ایک روپیہ، روپیہ روپیہ، روپیہ روپیہ۔

سب پر کم، روپیہ پر زیادہ زور تھا۔

اور آگے جو آواز لگ رہی تھی اُسے سن کر کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ کل اسی جگہ گولی چلی تھی اور دو بچے مر گئے تھے۔ "شادی کی مہندی، نئی ملاقات کی مہندی، نئی محبت کی مہندی، عید کی مہندی، بقرعید کی مہندی۔ دوستو، عید کی مہندی، پہلی ملاقات کی مہندی۔"

یہ آواز سن کر جی چاہا کہ کسی روز سارے مہاجر سندھیوں کو اور تمام سندھی مہاجروں کو یہی مہندی لگائیں۔

آگے ایک اور صدا لگ رہی تھی، "چھ روپے کیلو، چھ روپے کیلو۔ ستارا بدھی والوں نے بھیجی ہے کراچی سے، چھ روپے کیلو!"

ذرا آگے پیاز والا نعرہ لگا رہا تھا: "دو روپے کیلو پیاز۔ دو روپے کیلو۔" میں سنا کرتا تھا کہ

پاکستان میں پیاز سولہ روپے کیلو ہو گئی ہے۔ میں نے پیاز والے سے کہا کہ یہ تو بہت سستی ہے۔ پہلے زمانے میں مہنگی ہوتی تھی۔ وہ بولا : اس زمانے کی بات کرو، پہلے کی بات نہ کرو۔
ہو بہو علامہ اقبال کا پیغام تھا۔ بس نثر میں تھا۔

حیدر آباد کے بازاروں سے گزر کر میں اس کارخانے میں داخل ہوا جہاں اس شہر کی ایسی صنعت قائم ہے کہ ایک دنیا اس پر رشک کرتی ہوگی۔ کانچ کی جیسی اور جتنی اچھی چوڑی حیدر آباد میں بنتی ہے کہیں نہیں بنتی۔ چوڑیوں میں ایسی نزاکت، نفاست، اعلیٰ ذوق اور عمدہ سلیقہ صرف اور صرف حیدر آباد میں ملتا ہے۔ جن چوڑیوں سے عورتیں اپنے ہاتھ بھرتی ہیں، اس روز ان چوڑیوں کے تاجر بھرے بیٹھے تھے۔ وہ حکام سے سخت نالاں تھے جو چوڑی کی صنعت کو ترقی نہیں دیتے۔ ترقی نہ دیں، کم سے کم ترقی میں مدد تو دیں۔ وہ بھی نہیں دیتے۔ چوڑی گروں اور چوڑی سازوں کی انجمن کے عہدیدار مجھے بتارہے تھے کہ کوئی اس صنعت کو قرضہ نہیں دیتا، امداد نہیں دیتا اور چوڑی کی برآمد سے کسی کو ذرا سی بھی دلچسپی نہیں۔ چوڑی کے ایک تاجر نے مجھ سے کہا کہ سیاست دان چوڑی کا نام صرف اس وقت لیتے ہیں جب آپس میں ایک دوسرے کو شرم دلانے کے لیے چوڑیاں پہننے کا مشورہ دیتے ہیں۔

میں چوڑی کے ایک کارخانے میں داخل ہوا۔ ہم لوگوں کے گھروں کے غسل خانے جیسا چھوٹا سا تنگ کمرہ تھا جس میں نہ ہوا کا گزر تھا نہ روشنی کا۔ اور ہر طرف گیس کے شعلے سانپوں جیسی آوازیں نکال رہے تھے۔ ان شعلوں کی حرارت سے چوڑیوں کے منہ جوڑے جاتے ہیں اور مزدوروں کے بچوں کے پیٹ پالے جاتے ہیں۔ باقی حالات کچھ میری اور کچھ مزدوروں کی زبانی سنیئے اور حالات کے اس سرد خانے میں زندگی کی حرارت میں بھی ڈھونڈتا ہوں، آپ بھی تلاش کیجیے۔

میں نے ایک کاریگر سے پوچھا: ”آپ لوگ روز کتنے گھنٹے کام کرتے ہیں؟“

جواب ملا — ”ہم بارہ تیرہ گھنٹے مسلسل کام کرتے ہیں۔ صبح چھ بجے بیٹھتے ہیں اور شام سات آٹھ بجے تک بیٹھے کام کرتے رہتے ہیں۔“

میں نے کہا — ”مگر یہاں تو آگ برس رہی ہے۔“

”جی ہاں۔ ہمیں بہت گرمی برداشت کرنی پڑتی ہے۔ سارے دن آگ کے سامنے بیٹھتے ہیں۔“

میں نے پوچھا ــــ "یہ جو آٹھ کاریگر سر جھکائے بیٹھے ہیں اور ایک ایک چوڑی کا منہ اتنے دھیان سے بند کر رہے ہیں انہیں ماہانہ کتنی تنخواہ ملتی ہوگی؟"

"ہر ایک کا الگ الگ حساب ہے۔ کسی کو پندرہ سو، کسی کو سولہ سو، کسی کو اٹھارہ سو، کسی کو اکیس سو۔"

میں نے پوچھا۔"آپ لوگ کتنی عمر سے یہ کام شروع کرتے ہیں؟ ــ"

"مجھے ۱۴ سال ہوگئے یہ کام کرتے ہوئے۔ آٹھ سال کی عمر سے شروع کیا تھا۔"

میں نے بلند آواز میں تمام کاریگروں سے پوچھا ــــ "آپ میں سے کسی نے تعلیم پائی ہے؟ ــ"

ایک بجھی بجھی سی آواز آئی۔"پانچ جماعت تک۔"

میں نے پوچھا ــــ "وہ تعلیم اس صنعت میں کام آتی ہے؟ ــ"

جواب میں صرف گردن ہل کر رہ گئی ــــ نفی میں۔

اب میں نے پہلے والے کاریگر سے پوچھا ــــ "آپ کو جو معاوضہ ملتا ہے وہ کافی ہے؟ ــ"

جواب ملا ــــ "بس حالات کے مطابق بہت ہے، اگرچہ پورا نہیں ہوتا لیکن شکر ہے الحمدللہ کر گھر میں بیوی بچوں، بہن بھائیوں کا گزارا ہوجاتا ہے لیکن یہ ضرور ہے کہ اس میں اضافہ ہونا چاہیے۔"

میں نے کہا ــــ "اس کے علاوہ میرا خیال ہے کہ آپ کی یہ فیکٹری ائرکنڈیشنڈ ہونا چاہیے۔"

وہ بولے ــــ "نہیں صاحب۔ سامنے گرمی ہوگی اور اوپر ٹھنڈک ہوگی تو لوگ بیمار ہوجائیں گے۔ بس یوں ہی ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ چوڑی کے منہ بند کرنا مشکل ہوجائے گا۔"

میں نے کہا ــــ "کیا مطلب؟ یعنی آپ لوگوں کو ہمیشہ اس جہنم جیسی گرمی میں کام کرنا پڑے گا؟ ــ"

"جی صاحب ــــ مجبوری ہے۔"

مجھے یقین ہے ان مزدوروں کو یہ بات کارخانے کے مالکوں نے سمجھائی ہے۔ اب یہ کوئی مطالبہ نہیں کرتے۔ کسی شعلے اور حرارت کے بغیر ہی ان کے منہ بند کر دیئے گئے ہیں۔

سندھ کا جیا پا

سجاول وہاں ہے جہاں دریائے سندھ ہتھیلی کی طرح پھیل جاتا ہے اور انگلیوں جیسی اس کی شاخیں اُسے آہستہ سے بحیرۂ عرب میں جُوا دیتی ہیں۔

میں جس روز سجاول پہنچا، ملک میں انتخابات اور جمہوریت کے قیام کو سات آٹھ مہینے گزر چکے تھے۔ بات پرانی ہو چکی تھی اور توقعات شکایات میں بدل گئی تھیں۔

اس کے علاوہ سجاول میں ایک بڑا واقعہ ہو چکا تھا۔ پولیس کی بڑی بھاری جماعت وہاں اپنی کارروائی کر چکی تھی۔ گولیاں چل چکی تھیں اور وہ شے جو ٹل نہیں سکتی، وہ اپنا کام کر کے جا چکی تھی۔

اس کا احوال ذرا دیر بعد، آیئے پہلے اُس دریا کی باتیں کریں جو بہاولپور کے قریب چھوٹے سے گاؤں ریتی کے مقام پر صوبہ سندھ میں داخل ہوتا ہے اور اس وسیع سرزمین کو سیراب کرتا ہے، شاداب کرتا ہے اور بجا طور پر اس خطۂ ارض کی شہ رگ کہلاتا ہے۔ مگر زمین کو زندگی عطا کرنے کا کام کیا تنہا دریا کرتا ہے اور کیا اس میں کسی کا زور بازو شریک نہیں؟ سندھ یونیورسٹی کے تاریخ کے استاد ڈاکٹر مبارک علی نے اُس روز بہت پتے کی بات کہی:

"جب ہم کہتے ہیں کہ دریائے سندھ کی وجہ سے سندھ کی ساری زرخیزی ہوئی تو اپنی جگہ بات تو صحیح نظر آتی ہے لیکن اس کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ اس سرزمین کو زرخیز کرنے والے وہ ہاری تھے اور وہ مزدور اور کسان تھے جنھوں نے دریا سے نہریں نکالیں، جو دریا سے پانی لائے اور جنھوں نے دریا کو اس قابل بنایا کہ جس کی وجہ سے سندھ ایک زرخیز علاقہ ثابت ہوا ــــ"

یہ تو ہوئی ایک عالم کی گفتگو۔ اب اگر کسی عام باشندے کی بات سنی جائے تو احساس ہوتا

ہے کہ دریائے سندھ پنجاب سے چل کر صوبہ سندھ میں داخل ہوتا تھا تو اپنے ساتھ پانی لایا کرتا تھا، اب شکایتیں بھی لاتا ہے۔ محرومی اور حق تلفی کی شکایتیں۔

گل حسن تہرانی آب پاشی کے پرانے افسر ہیں، اب ریٹائرمنٹ کی زندگی گزار رہے ہیں۔ اُس روز اہلِ سندھ کے جذبات کی ترجمانی کر رہے تھے۔ اسی شکوے کی بات ہو رہی تھی کہ دریا کے پانی سے سندھ کے بڑے بھائی، یعنی پنجاب والے خود جتنے بڑے ہیں اُس سے بڑا حصّہ کاٹ لیتے ہیں۔

کہنے لگے: "جو پانی اوپر تربیلہ سے ہمیں ملنا چاہیئے وہ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے بڑے بھائی ہم لوگوں کو نہیں دیتے اور اپنی آبادی کے لیے زیادہ پانی نکال لیتے ہیں چنانچہ کوٹری بیراج کو ۱۵ اپریل سے پانی ملنا چاہیے تھا، آج ۲۰ مئی ہے لیکن ہمیں پورا پانی نہیں مل رہا ہے اور اگر یہ مہینہ یوں ہی گزر گیا اور پانی نہ ملا تو دھان کی کاشت تباہ ہو جائے گی۔ گنّے کی کاشت آج جل رہی ہے اور کچّے کے علاقے میں کیلا جل رہا ہے۔"

تہرانی صاحب بڑی تفصیل سے سمجھا رہے تھے کہ دریا کا زیادہ تر پانی پنجاب میں روکا گیا تو سندھ کی زمینوں پر کیا گزرے گی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کالا باغ ڈیم بھی تعمیر ہو گیا تو سندھ پر اس کا کیا اثر پڑے گا؟

وہ بولے — "ہم یہ نہیں کہتے کہ کالا باغ ڈیم نہیں بنے لیکن کالا باغ ڈیم بنے تو وہ صرف بجلی اور توانائی کے لیے — ہمارے بڑے بھائی کی تجویز ہے کہ ہم وہاں سے چولستان کو سیراب کریں گے یا تھل کو ترقی دیں گے۔ اب سوال یہ ہے کہ اگر آب پاشی کے لیے اور زیادہ پانی نکال لیا گیا تو ہمارا کیا ہوگا۔ سندھ کو پہلے ہی پانی نہیں مل رہا ہے اوپر سے ڈیم بنا کر پانی آبپاشی کے لیے نکال لیا گیا تو وہ ناانصافی ہوگی۔"

تہرانی صاحب بتا رہے تھے کہ کوٹڑی بیراج تک دریا کا سارا پانی نچوڑ لیا جاتا ہے اور جام شورو سے نیچے اس دریا میں پانی نہیں بہتا بلکہ ریت اڑتی ہے۔ اور مچھیرے اب وہی ریت پھانک رہے ہیں۔

کہنے لگے — "جام شورو میں آج بھی آپ دیکھیں کہ وہاں سے آگے دریا میں ریت اُڑ رہی ہے چنانچہ لطیف آباد اور حیدر آباد کے ہر گھر میں صبح و شام صفائی کرتے رہتے ہیں۔ یہاں

کے مچھیروں کا گزر سمندر کی طرف سے آنے والی مچھلی پر ہے۔ اب اگر سمندر سے دریا کا رابطہ نہیں ہے تو مچھیرے بھوکے مرتے ہیں۔ آپ اگر جا کر ان کی حالت دیکھیں تو خود آپ کو ترس آئے گا۔ کیوں؟ صرف اس لیے کہ پانی نہیں ہے دریا میں۔"

میں نے پوچھا کہ بتائیے اِس کا کیا حل ہے؟ کیا ان مچھیروں کی خاطر میٹھا پانی دریا میں چھوڑ کر سمندر میں گرا دیا جائے؟

جواب ملا — "مچھیرے ہوں یا کاشتکار، ان کی حالت اُسی وقت سُدھرے گی جب انہیں پانی ضرورت کے حساب سے ملے گا۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ ہمیں اتنا پانی دو کہ ہم سمندر میں چھوڑیں لیکن جس وقت ہمیں پانی چاہیئے، اُس وقت وہ ملنا چاہیے —"

دریا کی باتیں جاری تھیں۔ نیل اور سندھ کے بارے میں بہت سنا تھا کہ یہ دریا سیلاب کے ساتھ جو مٹّی لاتے ہیں وہ تمام زمینوں کو زرخیز کر دیتی ہے۔ میں نے تہرانی صاحب سے پوچھا کہ سیلابوں سے سندھ کو فائدہ پہنچتا ہے یا نہیں — اور جواب میں مجھے وہ جملہ سننے کو ملا جو وہاں بہت اوپر لداخ کے ایک چھوٹے سے گاؤں اُپشی میں بھی سنا گیا تھا۔

وہ کہہ رہے تھے — "یہ صحیح ہے کہ دریا زرخیز مٹی بھی لاتا ہے جس میں گندم اور دوسری چیزیں بہت اچھی اُگتی ہیں لیکن یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ سیلاب اپنے ساتھ کتنی تباہی بھی لاتا ہے۔ اسی سال ہمارے ضلع میں سیلاب آنے سے جتنا فائدہ ہو سکتا تھا اُس سے کئی گُنا نقصان ہوا ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ ہر سات سے لے کر دس سال کے اندر ایک ایسا سیلاب آجاتا ہے جس میں فائدے سے زیادہ نقصان ہوتا ہے۔"

تہرانی صاحب سے بہت دلچسپ باتیں ہو رہی تھیں۔ میں اُن سے پوچھ رہا تھا کہ دریا زمینوں کے مقدر کیسے بدلتا ہے۔ یہ ڈیلٹا اگر ہتھیلی اور دریا کی شاخیں اگر اس کی لکیریں ہیں تو ان میں قسمت کا حال پہلے سے معلوم ہو سکتا ہے یا نہیں؟ جواب ملا — نہیں — ڈیلٹا کے علاقے کی بہت سی خوبیوں کا علم پہلے نہیں تھا، اب ہوا ہے۔

"کوٹڑی بیراج بننے سے پہلے یہاں زیادہ تر ایسے لوگ رہتے تھے جو آج دریا کے کنارے ہیں تو کل کسی بستی میں چلے گئے۔ کسی نے بویا۔ ملا نہیں ملا — مگر اب تو ماشاءاللہ بہت اچھی نہریں

بنی ہیں۔ لوگوں نے اپنے پڑاؤ کو مستقل بنا دیا ہے اور فصل اور موسم کے لحاظ سے کاشت کرتے ہیں۔ ہمارے ضلع ٹھٹھہ میں ماشاءاللہ ایسی کاشت ہونے لگی ہے کہ ہم لوگوں کو خود اندازہ نہیں تھا۔ یہاں گنّے، کیلے، دوسرے پھلوں اور سبزیوں کی ایسی کاشت ہونے لگی ہے جو باقی سندھ میں نہیں ہو سکتی۔ سمندر کے قریب قریب سارے علاقے میں اتنی اچھی کاشت ہوتی ہے کہ خود حیران ہیں۔"

ہم بھی حیران ہیں کہ دریا میں پانی کم ہے تو یہ حال ہے، اگر کہیں نہریں بھر بھر کر پانی لے جائیں تو یہی زمینیں سونا اُگلتیں۔

حقیقت یہ ہے کہ پانی کی تقسیم پر سندھ اور پنجاب کا یہ جھگڑا کوئی آج کی بات نہیں۔ حیدرآباد کے سرکردہ صحافی مدد علی سندھی نے بھی یہی کہا:

"جناب، سندھ کے پانی کا مسئلہ آج کا نہیں ہے۔ میں انڈیا آفس لائبریری میں کچھ تحقیق کر رہا تھا تو وہاں میں نے کاغذات میں دیکھا کہ پانی کا یہ تنازعہ بہت پرانا ہے۔ وہاں میں نے ۱۸۸۰ء کے لگ بھگ کی ایک رپورٹ پڑھی جس میں اس وقت کے بمبئی کے چیف انجینئر نے لکھا تھا کہ پنجاب سندھ کا پانی ہڑپ کر جائے گا لہٰذا سندھ کو کچھ نہ کچھ کرنا چاہیئے۔ یہی وجہ تھی کہ بمبئی حکومت نے سکھر بیراج کی بنیاد ڈالی۔ تو یہ ایک پرانا مسئلہ ہے لیکن اسے بیٹھ کر حل کیا جا سکتا ہے۔ پانی کا منصفانہ حل ہونا چاہیے۔ سندھ کا جیا پا پانی سے ہے۔ سندھو دریا صدیوں سے موجیں مارتا بہتا تھا لیکن اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ آپ نے بھی دیکھا ہو گا کہ وہاں ریت اُڑ رہی ہے ——"

یہ تھے جناب مدد علی سندھی اور یہ ہیں جناب غلام مصطفیٰ شاہ، جن کا تعلیم، تاریخ، ترقی اور تعمیر میں بڑا ہاتھ رہا ہے اور جس سجاول کے علاقے میں ہم آن پہنچے ہیں یہ یہیں کے باشندے ہیں؛ یہاں کے باشندوں کے نمائندے بھی ہیں اور اُن دنوں مرکزی وزیر بھی تھے۔ اُس روز مجھے بتا رہے تھے کہ جب دریا پر بیراج بنا دیئے گئے تو زیریں سندھ تک پہنچتے پہنچتے دریا اور اس کے دونوں کناروں کا کیا حشر ہوا ——

"بیراجوں کی وجہ سے چونکہ پانی نیچے نہیں آ رہا تھا اس لیے ہمارے درخت تباہ ہو گئے۔ سجاول سے لے کر نیچے تک جنگلات تھے اور جرمنی کے بلیک فارسٹ کی طرح کالے گھنے جنگلات تھے

لیکن پانی نہ ملنے کی وجہ سے انہیں کافی نقصان ہوا۔ پودے مرگئے، جانور مرگئے اور پرندے آنے بند ہوگئے۔ کنارے کنارے جو دریائی جھیلیں تھیں وہ اب خالی پڑی ہیں۔"

پروفیسر غلام مصطفیٰ شاہ کے شہر سجاول جس روز میں پہنچا، پولیس کارروائی کی کہانیاں بھی سنیں اور دریائے سندھ کے کنارے اس بستی میں ایک عجب منظر بھی دیکھا۔ ہر طرف نوجوان ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے تھے۔ خوش گپیوں میں مصروف تھے یا ٹولیاں بناکر گھوم رہے تھے۔ کام کے سوا وہ سب کچھ کررہے تھے۔

اس علاقے کی ایک سرکردہ شخصیت رئیس مظفر خان لغاری سے میں نے پوچھا کہ سجاول میں اتنے بہت سے نوجوان بیکار گھومتے کیوں نظر آرہے ہیں؟ — انہوں نے کہا — "سر، حقیقت یہ ہے کہ ہمارے پاس نوجوان پڑھے لکھے بھی ہیں اور ان پڑھ بھی ہیں لیکن وہ یہاں سے باہر جاکر نوکریاں کرنے کے لیے تیار نہیں۔ ہم اگر کوشش کرکے سروس دلاتے ہیں کہ بھئی آپ یہاں سے نکلیں، کراچی جائیں یا گھارو جائیں تو وہ اپنی سب ڈویژن چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اور ان کو نوکری مل جاتی ہے تو وہ دو ہفتے تو جاتے ہیں لیکن دو ہفتے بعد واپس آجاتے ہیں کہ جی ہمیں تو گھر میں نوکری چاہیے۔ ایسا لگتا ہے جیسے انہیں دلچسپی ہی نہیں کسی کام سے یا اپنے مستقبل سے۔ ان کا یہ کام ہے کہ صبح کو اُٹھتے ہیں۔ اگر گھر میں مویشی ہیں تو چار سیر دودھ لے جاتے ہیں، جتنے پیسے ملتے ہیں صبح سے دوپہر تک شہروں میں کھاپی کر واپس آجاتے ہیں۔ انہیں یہ خیال نہیں کہ ہمارے مستقبل کا معاملہ ہے، کل ہمیں ہی اس شہر اور اس ملک کو بنانا ہے لیکن یہ چیز ہمیں خود سمجھ میں نہیں آرہی ہے کہ کیوں ہمارے نوجوانوں کو اتنا شعور نہیں ہے۔"

میں نے مظفر خان لغاری صاحب سے کہا کہ ایسے حالات میں منشیات کا کاروبار خوب چلتا ہے۔ آپ کے علاقے میں اُس کا کیا حال ہے؟

کہنے لگے — "صاف صاف بتاؤں، یہ مسئلہ پہلے اتنا نہیں تھا یہاں پر لیکن جب سے حکومت کا نظام بدلا ہے ہر چیز کھلی ہوگئی ہے۔ پہلے یہ چیز چُھپی ہوئی تھی۔ کوئی کرتا تھا تو چھپ کر میں کرتا تھا لیکن اس دور میں ہر ایک نے کہہ دیا ہے کہ عوامی دور ہے۔ اب کوئی ان کو روکنے والا نہیں۔ ہر چیز کھلے عام ہورہی ہے۔ ابھی دو مہینے ہوئے کچھ کنٹرول ہوا ہے۔"

یہ تو بڑی اچھی خبر تھی۔ میں نے خوش ہو کر پوچھا کہ کس طرح کنٹرول ہوا ہے۔ اب بات اُس واقعے تک جا پہنچی جس میں چہار جانب سے پولیس اور فوج کو سجاول آگر یہاں سخت کارروائی کرنی پڑی تھی، کچھ لوگ مارے گئے تھے، بہت سے پکڑے گئے تھے۔ میں نے رئیس منظفر خان لغاری سے پوچھا کہ وہ کیا قصّہ ہے۔

وہ تفصیل سے بتانے لگے۔ یہ سارے الفاظ ان ہی کے ہیں — "آپ یقین کریں کہ شہر میں کچّی شراب کی بھٹّیاں لگی ہوئی تھیں۔ کھلے عام بنتی تھی اور فروخت ہوتی تھی۔ اندر بیٹھے ہیں، منشیات چل رہی ہے، ہیروئن چل رہی ہیں۔ کوئی پوچھنے والا نہیں — یہاں ایسی مثالیں ہوئی ہیں کہ پولیس والا گیا اور منع کیا تو اسے وہیں پکڑ کر اس کی بے عزّتی کی گئی ہے۔ ان ساری چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ایس پی کے پاس رپورٹیں گئیں۔ انہوں نے اوپر بھیج دیں کہ یہ منشیات کے تاجر اور چور ڈکیت عوام کے نمائندوں کے قریب آگئے ہیں۔ یا تو انہیں سمجھاؤ یا ہمیں اجازت دو کہ ہم قدم اٹھائیں۔ متعدد دفعہ قدم اٹھائے گئے۔ ہوتا یہ ہے کہ پکڑ کر لے جاتے ہیں مگر وہ اوپر سے آکر چھڑا کر لے جاتے ہیں۔ وہیں کی بات وہیں رہ گئی۔"

یہاں سے قصّہ آگے بڑھا۔ لغاری صاحب بتا رہے تھے: "ہمارے ہاں ایک قریشی صاحب ہیں، ان لوگوں نے ان کی زمینوں پر قبضہ کیا۔ وہ علاقے کے اہم آدمی ہیں۔ یہاں ڈپٹی کمشنر رہ چکے ہیں۔ ان لوگوں نے اُن کو تنگ کیا۔ وہ بہت با اثر ہیں۔ ان کی زمینوں پر قبضہ ہونا تھا کہ پولیس حرکت میں آگئی۔ حقیقت یہ ہے کہ منشیات سے جان چھڑانے میں سب سے بڑا کردار اسی واقعہ نے ادا کیا۔ اب پولیس ایکشن ہوا، کراچی سے پولیس آئی، ٹھٹھہ سے آئی، حیدرآباد اور دادو تک سے آئی۔ آرمی کو بلایا گیا۔ اس کے بعد یہ ایکشن ہوا۔ زبردست مقابلہ ہوا، جانی نقصان ہوا، گرفتاریاں ہوئیں۔ اب اتنا ہوا ہے کہ پہلے کی طرح جو کھلے عام دھندا تھا اُس میں دس آنے بارہ آنے کا فرق پڑ گیا ہے اور اگر حکومت نے سختی کی تو یہ بھی بند ہو سکتا ہے۔ یہ سب ہمارے ہاتھ میں ہے، ہم چاہیں تو یہ جاری رہے گا، ہم چاہیں تو یہ بند ہو جائے۔ تو سائیں یہ سب ہماری حکومت کے اختیار میں ہے۔ ہم لوگ کیا کر سکتے ہیں۔ ہم زیادہ سے زیادہ اتنا کر سکتے ہیں کہ نشاندہی کریں۔ آگے کا کام تو با اختیار لوگوں کا ہے کہ گرفتاریاں کریں یا جو کچھ بھی کریں۔ ہماری تو دعا ہے کہ یہ مسئلے جتنی جلد حل ہو سکیں، حل ہو جائیں۔"

ٹھٹھہ بہترین ہے

شہر بنتے ہیں، مٹتے ہیں۔ عروج کے آسمانوں کو چھوتے ہیں اور زوال کی پستیوں میں دھنس جاتے ہیں مگر جو سندھ کا شہر ٹھٹھہ ہے، وہ تو بڑی عبرت کی جا ہے کہ اس زمین پر جہاں مخدوم محمد ہاشم ٹھٹھوی جیسے استاد کے قدم پڑتے تھے، شاگرد وہاں ماتھے ٹیکتے تھے اور اب یوں ہے کہ جس شام میں اسی ٹھٹھہ کے ہاشم آباد میں گورنمنٹ ڈگری کالج کے پرنسپل صاحب کی قیام گاہ پر پہنچا تو خود کالج کے احاطے میں لڑکوں کا کوئی جلسہ تھا اور وہ شور تھا کہ خدا کی پناہ۔ وہ گا رہے تھے اور نعرے لگا کر آسمان سر پر اٹھا رہے تھے۔

میں نے پرنسپل صاحب سے، کہ علم کا نور جن کی پیشانی سے پھوٹا پڑتا تھا، پوچھا کہ ٹھٹھہ کے یہ نوجوان آپ کے کالج میں کیا کر رہے ہیں۔ کہنے لگے: مجھے پتہ نہیں۔ مجھے کچھ خبر نہیں۔ انہوں نے مجھ سے نہ اجازت لی نہ منظوری۔ خود ہی کالج میں جلسے اور گانے کا انتظام کیا ہے اور مجھے بس یہ دعوت نامہ بھیج دیا ہے۔

یہ کہہ کر پرنسپل صاحب نے دعوت نامے کا کارڈ میرے ہاتھ میں تھما دیا اور میں اسے غور سے دیکھنے لگا ـــــ دیکھتا رہا ـــــ دیکھتا رہا ـــــ کہ اچانک وہ کارڈ موجوں میں بدل گیا۔ اس کے حروف لہریں بن گئے۔ اس کی عبارت میں تلاطم آیا اور دعوت نامہ دریا بن کر مجھے بہا لے گیا۔ اور وہ بھی آگے کی طرف نہیں ـــــ پیچھے کی جانب!

یہی تو وہ ٹھٹھہ تھا جہاں عرب آئے، سومرا خاندان آیا، سمہ خاندان آیا اور جام نظام الدین جیسا حاکم آیا، ارغون آئے، ترخان آئے اور اسے برصغیر کی کلاہ میں ہیرے کی طرح جڑ دیا۔

وقت کے ورق ایک ایک کر کے میری آنکھوں کے سامنے پلٹنے لگے۔ تاریخ کے استاد ڈاکٹر مبارک علی ٹھٹھہ کی داستان کا ایک ایک باب دہرانے لگے:

"اس شہر کو زیادہ شہرت سمہ خاندان کے حکمران جام نظام الدین کے زمانے میں ہوئی۔ اُس کے دور میں شہر ٹھٹھہ اپنے عروج پر تھا، یہاں پر عمارتیں بھی بنیں، خود یہ شہر تجارتی مرکز بنا اور اس کی علمی حیثیت اسی زمانے میں قائم ہوئی۔ اور اس کا مشہور وزیر تھا دریا خان۔ ٹھٹھہ کے مشرق کی جانب اس کا چھوٹا سا گاؤں تھا۔ دریا خان نے اس گاؤں کو سرسبز شاداب کرنے کے لیے ایک نہر نکالی تھی جو علی جاہ نہر کہلاتی ہے۔ یہ کلری نہر بھی اسی کی نکالی ہوئی ہے۔ اس طرح کی نہریں نکالنے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ٹھٹھہ شہر کے گرد بہت سے باغات ہو گئے۔ اور سارا علاقہ سرسبز ہو گیا۔ تو ٹھٹھہ شہر کا عروج ۱۴ ویں صدی میں سمہ خاندان کے زمانے میں ہوتا ہے ــــ"

اور پھر یہ ہوا کہ ایشیا بھر کے اہل علم، اہل ہُنر کھنچے کھنچے ٹھٹھہ آ گئے۔ بحر عرب سے ملا ہوا، دریائے سندھ سے جڑا ہوا یہ شہر باکمال لوگوں کے ہاتھوں نکھرنے لگا، سنورنے لگا۔ ٹھٹھہ کے بارے میں مشہور تھا کہ دولت اس میں بھری پڑی ہے۔ اُس کی اِس دولت کی خبر ہر ایک کو تھی، کالوں کو بھی گوروں کو بھی۔

ڈاکٹر مبارک علی بتا رہے تھے: "عیسیٰ خان ترخان کے زمانے کا جو ایک اہم واقعہ ہے وہ یہ کہ ٹھٹھہ میں پہلی مرتبہ پرتگالی آئے۔ ہوا یہ کہ یہاں باہمی خانہ جنگی چل رہی تھی اور عیسیٰ خان کو مدد کی ضرورت تھی۔ اس نے گجرات میں پہلے سے موجود پرتگالیوں کو لکھا کہ ہمیں آپ کی مدد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ پرتگالی اس کی مدد کے لیے ٹھٹھہ پہنچے تو عیسیٰ خان شہر کے اندر بھی نہیں تھا، اب مسئلہ یہ تھا کہ پرتگالی یہاں تک آئے تھے اب وہ اپنا معاوضہ لینا چاہتے تھے۔ جب ان کو کوئی معاوضہ نہیں ملا تو انہوں نے ٹھٹھہ شہر کو لُوٹا اور بڑا قتل عام کیا۔ جامع مسجد کو آگ لگائی، شہر کو مسمار کیا اور لوٹا ہوا مال اپنے ساتھ لے گئے ــــ تو یہ سمجھئے کہ یورپین اقوام سے سندھ کا پہلا تعارف اس انداز میں ہوا ــــ"

یہ پہلا تعارف تھا۔ بعد والے تعارف بھی کچھ زیادہ مختلف نہیں تھے۔

ہاں تو عظیم الشان شہر ٹھٹھہ کے وہ جو اچھے دن تھے، اُن دنوں یہ کیسا شہر تھا، کیسی گلیاں تھیں،

کیسے محلے، کیسے چوک اور کیسے بازار تھے؟ ڈاکٹر مبارک علی تاریخ کے سمندر کی گہرائیوں سے یہ سارے موتی چُن لائے :

" ٹھٹھہ شہر کے اندر مختلف محلے آباد تھے، ان محلوں کے جو نام ہیں کچھ تو شخصیات کے ناموں پر ہیں کہ جنھوں نے ان محلوں کو بسایا۔ اور کچھ نام ایسے ہیں جو پیشوں کے اعتبار سے ہیں مثلاً محلہ سنگ تراشاں، یا محلۂ مسواک کشاں یا محلۂ قصّاباں، یہ تو پیشوں کے اعتبار تھے۔ کچھ محلے برادریوں کے نام پر تھے مثلاً محلہ سادات رضویہ، مغل واڑہ، جہاں غالباً مغل آ کر آباد ہوئے ہوں گے۔ یا پھر شخصیتوں کے ناموں پر ہیں مثلاً محلہ محمد علی —— یہی حال بازاروں کا ہے۔ یہ بازار بھی شخصیتوں کے ناموں پر ہیں یا کچھ خاص بازار تھے۔ مثلاً ایسے بازار جہاں جواہرات ملتے تھے۔ یا ایسا بازار جہاں کپڑا ملا کرتا تھا یا ایسا بازار جہاں صرف پھل ملا کرتے تھے۔ پھر ہمیں ٹھٹھہ میں اس زمانے کے امراء کی حویلیوں کا بھی پتہ چلتا ہے مثلاً خسرو خاں کی حویلی ہے یا کوکی کی حویلی، یا ایک حویلی کا نام کشتی حویلی ہے جو کسی وجہ سے اس نام سے مشہور ہو گئی ہو گی۔ پھر یہاں پر مختلف چوک تھے، ان کے بارے میں بھی ملتا ہے کہ بڑے بڑے میدان اور چوک تھے جہاں پر لوگ تفریح کی غرض سے آیا کرتے تھے۔ پھر دوسری چیز جو ہے وہ اُس زمانے کی مسجدیں ہیں۔ مثلاً شاہ جہاں کے زمانے کی مسجد اب تک موجود ہے۔ یہ اُس کے ایک امیر نے بنوائی تھی۔ اس کے علاوہ دوسری مساجد بھی ملتی ہیں مثلاً مسجد امیر خانی ہے، مسجد دادگیر ہے، اس قسم کی مسجدیں ہیں، مسجد رحمت خانی ہے —— ان کے کچھ آثار ابھی باقی ہیں۔"

اس کے بعد ٹھٹھہ کی تقدیر بدلی۔ سمندر دور چلا گیا۔ دریا نے ساتھ چھوڑ دیا۔ نئے حکمرانوں نے اپنے دارالخلافے بنانے کے لیے دوسرے مقامات ڈھونڈنے شروع کر دیئے اور جس ٹھٹھہ کا مقابلہ پیرس سے کیا جاتا تھا وہ وقت کے پیروں میں روندا گیا۔

ڈاکٹر مبارک علی بتا رہے تھے: " ٹھٹھہ کی اہمیت اس وجہ سے بھی گھٹنی شروع ہوئی کہ لاری بندر میں ریت بھر گئی اور یہ بندرگاہ ختم ہوئی، اس کی جگہ شاہ بندر دوسری بندرگاہ بنی۔ یہ مغلوں کے زمانے کی بات ہے، سمندر پیچھے ہٹنے لگا، بندرگاہیں بند ہونے لگیں تو علاقے کی تجارتی اہمیت ختم ہونے لگی۔ پھر کلہوڑوں اور تالپوروں نے اس کو اپنا مرکز نہیں بنایا چنانچہ اس کی سیاسی اہمیت ختم ہوئی اور اس کے بعد اس کی ثقافتی اہمیت یوں ختم ہوئی کہ جب یہ حکومت کا مرکز نہیں رہا تو ظاہر

ہے کہ پھر لوگوں کے یہاں آباد ہونے کی کوئی وجہ نہیں تھی۔ پھر یہ ہوا کہ سندھ کے موسم نے عمارتوں کو نقصان پہنچانا شروع کیا اور قدیم عمارتوں کے نام و نشان مٹنے لگے۔"

پُرانے ٹھٹھہ کی باتیں اب خواب ہوئیں اور جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی نے کہا، اس کی کچھ عمارتیں بچی ہیں۔ ان کا حال بھی اچھا نہیں۔ انہیں بچانے کے جتنے اور جیسے جتن ہونے چاہئیں، نہیں ہو رہے یہ عمارتیں اگر مٹ گئیں تو تاریخ کی سچی گواہیاں مٹ جائیں گی۔

ڈاکٹر مبارک علی نے کہا "یہ ہمارا تاریخی ورثہ ہیں۔ ایک تو ہوتی ہے تحریری تاریخ اور ایک ہوتی ہے عمارتوں کی تاریخ اور عمارتیں جو تاریخ بیان کرتی ہیں وہ بہت زیادہ موثر ہوتی ہے کیونکہ عمارتیں جھوٹ نہیں بولتیں۔"

کالج کے لڑکوں کا دعوت نامہ اب اپنے اصل حال پر لوٹ آیا۔ حرف، تحریر اور عبارت نے پھر اپنی اصل صورت اختیار کر لی اور لفظوں کے آئینے میں مجھے آج کا ٹھٹھہ نظر آنے لگا۔ آیئے اس شہر کے شہریوں سے ملیں۔ عام لوگوں سے ملیں، سڑک پر چلتے پھرتے انسانوں سے باتیں کریں۔

میں اسمبلی کے رکن اور شہریوں کے نمائندے سے ملنے گیا تھا۔ وہ خود کہیں گئے ہوئے تھے اور لوگوں کی باتوں سے پتہ چلا کہ ہر روز کی طرح وہ اس روز بھی بُری طرح مصروف تھے۔ میں ان کی انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے مجمع کے ساتھ جماہیاں لیتے لیتے تھک گیا تو پہلو میں بیٹھے ہوئے طفیل احمد عُقیلی سے باتیں کرنے لگا۔ دیکھنے میں یہ دیوانے سہی مگر پرکھنے میں بڑے فرزانے ہیں۔ وہ ٹھٹھہ کے بارے میں بتانے لگے:

"میں ٹھٹھے میں رہتا ہوں اور میں صوبائی اسمبلی کے لیے امیدوار بھی تھا، اس سے پہلے میں اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل کے عہدے کے لیے بھی امیدوار تھا، مجھے بعد میں سلامتی کونسل کے صدر نے خط بھی بھیجا جس میں انہوں نے میرا شکریہ بھی ادا کیا۔۔۔"

میں نے جھٹ پوچھا۔۔۔ "تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ آپ دنیا کے مسئلے حل کر سکتے ہیں؟"

وہ بولے۔۔۔ "ہاں میں سیاسیات میں ایم اے ہوں اور میرے پاس بین الاقوامی تعلقات کا ڈپلوما بھی ہے۔"

میں نے کہا۔۔۔ "خیر دنیا کے مسئلے تو جانے دیجئے۔ ٹھٹھہ شہر کے مسئلے کیا ہیں؟"

جواب ملا — "ٹھٹھہ کے مسئلے بہت ہی پیچیدہ ہیں اور بہت ہی پُرانے ہیں۔ یہاں سب سے بڑا مسئلہ پانی کی نکاسی کا ہے۔ ہر دوسرے تیسرے دن شہر کے اندر گندے پانی کی نالیاں ابلنے لگتی ہیں۔ دوسرا مسئلہ بے روزگاری کا ہے۔ یہاں کے نوجوان بے روزگار ہیں۔ ان کی تعداد بہت زیادہ ہے۔ ان کے والدین ان کی تعلیم پر بہت زیادہ خرچ کرتے ہیں مگر جب ان کی تعلیم مکمل ہو جاتی ہے تو ان کو نوکری نہیں ملتی ہے۔"

میں نے پوچھا — "بے روزگاری کی وجہ سے نوجوانوں میں بے راہ روی تو نہیں پھیل رہی ہے؟ —"

"یہی مسئلہ ہے۔ ایک جانب تو اُن میں بے چینی پیدا ہو گئی ہے دوسری طرف وہ وقت گزارنے کے لیے بھارتی فلمیں اور ننگی فلمیں دیکھتے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "ٹھٹھہ کے والدین نے کبھی سوچا کہ مل کر کچھ کریں اس کی روک تھام کے لیے؟"

طفیل احمد بولے — "انہوں نے تو بہت کوشش کی کہ اس سلسلے میں کچھ کریں مگر وہ خود مجبور ہیں کیونکہ ان کی اپنی مالی حالت ایسی ہے کہ وہ اپنے بچوں کے لیے کچھ نہیں کر سکتے —"

وقت کافی گزر گیا تھا اور اسمبلی کے ممبر صاحب ابھی تک نہیں لوٹے تھے — میں نے طفیل احمد سے کہا "ہم تو یہ جانتے ہیں کہ جمہوریت میں جو رکن پارلیمان ہوتا ہے، وہ ذمّہ دار ہوتا ہے۔ آپ کو پورا اختیار ہے کہ جا کر اس کا گریبان پکڑیں اور اُس سے کہیں کہ ہماری یہ مشکلات ہیں، ہم نے تمہیں چنا ہے، ووٹ دیئے ہیں۔ اس مسئلے کو حل کرو — آپ کیوں نہیں کرتے ایسا؟"

طفیل احمد نے پہلو بدلا۔ ان کے لہجے میں خفگی آئی مگر آواز اتنی ہی بلند رہی اور بولے — "اس سلسلے میں لوگ اراکینِ اسمبلی کے پاس بار بار جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے یہ مسائل ہیں، ہماری یہ بے چینیاں ہیں ہماری یہ پریشانیاں ہیں۔ لیکن یا تو وہ اراکین اسمبلی شہر سے باہر ہوتے ہیں یا پھر وہ اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ ان سے ملاقات نہیں ہوتی ہے۔ پھر ان کے اپنے مسائل بھی ہیں جن کی طرف وہ زیادہ توجہ دیتے ہیں —"

میں نے پوچھا — "مثال کے طور پر ان کے کیا مسائل ہوتے ہیں؟ —"

"ان کا مسئلہ یہ ہے کہ الیکشن پر کافی خرچہ ہوتا ہے۔ اب ان کا پہلا مسئلہ تو یہ ہوتا ہے کہ جو خرچہ

ہو گیا وہ پیسہ واپس نکلے۔"

طفیل احمد عقیلی دیر تک باتیں کرتے رہے اور رکن اسمبلی لوٹ کر نہیں آئے ۔ اب میں نے شہر کے تین باشندوں کو اکٹھا کیا۔ ایک تھے ابراہیم عباسی جو باشعور سیاسی کارکن ہیں، دوسرے تھے فاروق جو نوجوان طالب علم ہیں اور تیسرے تھے پیر محمد جو سڑک کے کنارے ٹھیلہ لگا کر دن بھر شربت فروخت کرتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ شہر ٹھٹھہ کا بڑا مسئلہ کیا ہے؟

ابراہیم عباسی بولے ۔۔۔ "ٹھٹھہ میں گندے پانی کی نکاس کا مسئلہ بہت خراب صورت اختیار کر گیا ہے۔ شروع سے لے کر آج تک، تاریخی لحاظ سے یہ شہر گنجان آباد ہے، پرانی عمارتیں ہیں جن کی بنیادیں سینکڑوں سال پہلے رکھی گئی ہوں گی۔ اب ان کی منصوبہ بندی نہیں ہو سکتی۔ اس لیے یہ تکلیف ہے ۔"

اب میں نے شربت فروش سے پوچھا "آپ تو ریڑھا لگاتے ہیں، شربت کے گلاس دھوتے ہوں گے دن بھر، کیا آپ کے شہر کی نالیاں بند پڑی رہتی ہیں؟ ۔"

وہ اپنے مخصوص انداز میں بولے ۔۔۔ "سائیں، سارے دن گٹر چلتے ہیں، سارے دن پانی بہتا ہے، اوپر سے چوریں، موچڑے، اتنا ظلم ہے کہ نہ پوچھیئے۔"

اب میں نے فاروق سے پوچھا ۔۔ "کیا یہ درست ہے کہ یہاں کا دوسرا بڑا مسئلہ نوجوانوں کی بے روزگاری کا ہے؟ ۔"

"کافی لوگ تعلیم یافتہ ہیں مگر نوکری نہیں ملتی ہے کیونکہ غریب ہیں۔"

میں نے کہا ۔۔ "مگر یہاں صنعتیں قائم ہوئی ہیں، ان سے کچھ فرق نہیں پڑا؟ ۔"

وہ بولے ۔۔۔ "مشکل یہ ہے کہ یہاں باہر کے لوگ آتے ہیں۔ ان کی حمایتیں ہوتی ہیں، سفارشیں ہوتی ہیں۔ انہیں نوکری مل جاتی ہے آرام سے ۔"

اب میں ابراہیم عباسی سے مخاطب ہوا ۔۔ "آپ سرگرم کارکن ہیں۔ آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ ۔"

"اس میں مسئلہ یہ ہے کہ آج سے گیارہ سال پہلے جو اس ملک میں حکومت تھی اس نے معاشرتی طور پر بھی اور دوسرے لحاظ سے بھی یہاں کے معاشرے کو اس طرح چلایا کہ اب

لوگ ایک دوسرے سے مطمئن نہیں ہیں۔ اس میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ ہمارے جو دوسرے صوبے ہیں ان کے لوگ یہاں آگر رہتے ہیں تو یہ بات صحیح نہیں ہے۔ دوسرے صوبے کے لوگوں کو اگر وہیں ملازمت مہیا کی جائے تو وہ یہاں نہیں آئیں گے۔ اس لیے یہاں کے لوگ، خاص طور پر ٹھٹھہ کے لوگ امن پسند اور انتہائی شریف ہیں۔ ہمارا ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ ہم اپنے ضلع سے نکلنا نہیں چاہتے۔ ہم باہر جانا پسند نہیں کرتے ـــــ"

اب میں نے پیر محمد سے پوچھا ـــــ" آپ دن بھر شربت بیچتے ہیں ہر قسم کے لوگوں سے آپ کا واسطہ رہتا ہوگا۔ کیا آپ کے خیال میں ٹھٹھہ کے لوگ شریف اور امن پسند ہیں؟ ـــــ"

ان کا جواب یوں تھا ـــــ" بالکل ـــــ بالکل شریف ہیں، پُرامن ہیں۔"

میں نے فاروق سے پوچھا ـــــ" شہر میں امن اور جرائم کی کیا حالت ہے، آپ نوجوان ہیں آپ کیا محسوس کرتے ہیں؟ ـــــ"

" اب جرائم کا رجحان بڑھ گیا ہے۔ یعنی آج کل کے بڑے لوگ مثلاً وڈیرے، جیل میں خود ڈالتے ہیں اور خود چھڑاتے ہیں۔ اس طرح جرائم کا مسئلہ بڑھ جاتا ہے۔ جو لوگ جُرم کرتے ہیں، ان کو سزا نہیں ملتی۔"

مَیں نے ابراہیم عباسی سے پوچھا ـــــ" آپ کا شہر قدیم ہے اور قدیم تر ہوتا جا رہا ہے۔ پرانی عمارتیں گر رہی ہیں۔ نئی عمارتیں نہیں بن رہی ہیں، تو کیا آپ کا شہر پسماندہ اور غریب ہوتا جا رہا ہے؟ ـــــ"

وہ بولے " یہ شہر پسماندہ ضرور ہے لیکن غریب نہیں ہے۔ اصل میں یہ جو ہماری عمارتیں وغیرہ ہیں ان کی جو بناوٹ ہے یہ تاریخی ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ یہ ہماری پہچان ہیں۔ اگر اس کو ختم کر دیا جائے گا تو میں سمجھتا ہوں کہ ہماری پہچان ہی ختم ہو جائے گی۔ تو اگر منصوبے کے تحت، پلاننگ کے تحت اس کو دوبارہ بسایا جائے، اس میں صحیح طرح سے آباد کاری ہو تو اچھا ہو کیونکہ یہاں اتنی غربت نہیں ہے اندرون سندھ کے مقابلے میں۔"

اب میں نے شربت فروش سے پوچھا ـــــ" آپ ٹھٹھہ کے کتنے پرانے باشندے ہیں؟"

" ہم تو ہیں ہی ادھر کے ـــــ"

"کیسا لگتا ہے آپ کو ٹھٹھہ؟—"

"ٹھٹھہ بہترین ہے۔ درویشوں کا شہر ہے۔ اصل شہر ہے۔ پُرانا شہر ہے۔ ہمارا خاندان ادھر ہی رہتا ہے۔ ہمارے پاس جائیداد کی سندیں ہیں۔ تو جب گورنر دہلی میں رہتا تھا، اس ٹائم کی ہیں۔ اُسی ٹائم سے اِدھر رہتے ہیں۔ مگر یہ ہے کہ چوری، ہیروئن، چرس کھلا کھلا بکتا ہے۔ بس۔ ابھی ابھی ہم بیٹھے تھے گاڑی کے اوپر۔ ایک بڑھی مائی آئی۔ بچاری بالکل غریب ہے۔ ایکسائز کے پولیس انسپکٹر کے بچے والے نے موچڑا مار کے اس کا بایاں ہاتھ توڑ دیا۔ وہ پولیس آفس میں گئی۔ انھوں نے فریاد نہیں لیا عورت کا۔ ابھی روتی ہوئی میری گاڑی پر آئی۔ میں نے ابراہیم عباسی کو بولا کر بھئی یہ کیا ظلم ہے......"

ایک محل کی کہانی

اب میں آپ کو ایک محل کی کہانی سناؤں گا۔
اس محل کے پچھواڑے ایک گاؤں ہے، آپ اس کا قصہ بھی سنیں گے۔
اس گاؤں میں ایک نوجوان رہتا ہے، میں اس کی داستان بھی کہوں گا۔
میں اُس جگہ پہنچنا چاہتا تھا جہاں دریائے سندھ بحرِ عرب میں گرتا ہے۔ ہماری جیپ ٹھٹھہ کے قریب گھارو پہنچی۔ یہاں سے سمندر کافی دور تھا مگر پانی یہاں بھی بہت نظر آیا۔ کسی نے بتایا کہ ایک زمانے میں دریائے سندھ یہیں سے بہتا تھا۔

گھارو سے ہم نے بڑی سڑک کو چھوڑا اور ایک چھوٹی سڑک پر اتر گئے۔ یہاں منظر بدل گیا۔ نہ کوئی ٹیلہ نہ پہاڑ۔ بس جہاں تک نگاہ جاتی تھی، سپاٹ میدان جاتے تھے۔ زمین اور آسمان کے بیچ کچھ حائل نہ تھا۔ اتنی سیدھی اور سپاٹ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کسی نے کہا، ان میدانوں میں دریا لوٹا کرتا تھا، بل کھایا کرتا تھا، کروٹیں بدلا کرتا تھا، اِسی باعث ٹھٹھہ کا یہ علاقہ اسکول کے بچّے کی تختی جیسا ہوگیا ہے۔

اور اب جو میں نے گردن اٹھا کر دیکھا تو اس تختی پر ملتانی مٹّی نہیں، سبزہ پوتا گیا تھا اور اس پر سیاہی سے نہیں، نہروں کے نیلے پانی سے حروف لکھے گئے تھے۔ جیپ آگے بڑھتی تو جگہ جگہ اونچے نیچے پُلوں کو پار کرتی، نہروں میں ٹھاٹھیں مارتا ہوا میٹھا پانی، اس کے دونوں کناروں پر درخت، درختوں پر پیلی روئی جیسے پھول۔ دو رویہ کچّی سڑکیں اور سڑکوں کے چوراہوں پر سندھی چائے خانے۔ کچّی دیواریں، پھونس کی چھتیں، تختوں کی میزیں اور بنچیں، آرائش کے لیے لٹکی ہوئی رنگین کپڑے کی جھالریں، چولہے پر چڑھی ہوئی المونیم کی بالکل سیاہ کیتلی، برابر میں الٹ کر رکھی

ہوئی چھوٹی چھوٹی سستی پیالیاں اور پتیلی میں بھرا ہوا دودھ جس میں بالکل ویسا ہی ذائقہ جیسی دھوئیں میں بو۔

ایسے حالات میں چائے ٹھنڈی ہونے کی شکایت کرنا فضول تھا۔

ہماری جیپ جو علاقے کے چھوٹے سے قصبے میر پور ساکرو کی طرف دوڑ رہی تھی راہ میں ایک نہر کو پار کرنے لگی کہ اچانک میری نگاہ ایک بڑے سے بورڈ پر پڑی۔ سڑک کے کنارے لگے ہوئے اس بورڈ پر بڑے بڑے حروف میں لکھا تھا: قصرِ ابوظبی۔

جیپ تیزی سے آگے نکل گئی۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہا: قصر تو محل کو کہتے ہیں وہ بولے: جی ہاں اس طرف محل ہے۔ ابوظبی کے شیخ نے یہاں اپنی شکارگاہ اور اپنا محل بنوایا ہے۔

اگلے ہی لمحے میرے اصرار پر جیپ رُکی، واپس لوٹی اور نہر کے کنارے کنارے بنی ہوئی اُس کچی سڑک پر اُتر گئی جو سڑک قصرِ ابوظبی کو جاتی ہے۔ گرد کے بادل میں وہ نہر، وہ درخت، سب نظر آنے بند ہو گئے۔ کچھ دیر بعد جیپ رکی۔ گرد کے بادل منڈلاتے منڈلاتے اچانک بیٹھ گئے۔ غبار کا چھٹنا تھا کہ سامنے کی شفاف چمکتی فضا میں دیکھا کہ انڈے جیسی ایک سفید عمارت کھڑی ہے۔ بڑی سی گنبد جیسی چھت، اونچے اونچے در اور ستون۔ بڑی بڑی کھڑکیاں۔ بڑے دروازوں تک جانے کے لیے بڑے بڑے زینے اور اطراف میں ہری گھاس کے تختے اور پھولوں کے پودے اور ہوا میں جھومتے، دھوپ میں چاندی کی طرح چمکتے ناریل کے درخت۔

ٹھٹھہ کے ضلع میں ابوظبی کا محل دیکھا تو جی نہ مانا اور میں نے آگے بڑھ کر دربان سے اپنا تعارف کرایا۔ وہ ریڈیو سنتا تھا، مجھے جانتا تھا۔ محل دیکھنے کی میری خواہش کی خبر محل کی کنیزوں کی طرح دوڑتی گئی۔ باقی عملہ بھی نکل آیا اور اگلے ہی لمحے میں اپنے نئے میزبانوں میں گھرا محل کے شاہانہ زینوں پر چڑھ رہا تھا۔

محل اُن دنوں خالی پڑا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ محل سال بھر خالی پڑا رہتا ہے۔ خود ابوظبی کے شیخ دس برس میں شاید دو مرتبہ آکر وہاں صرف ایک ایک دن رہے تھے۔ کبھی کبھار اُن کے گھر والے جاڑوں میں ایک دن کے لیے آجاتے ہیں۔

میں اندر داخل ہوا۔ بہت بڑے بڑے کمرے۔ بہت اونچی اونچی چھتیں۔ نہایت عمدہ فرش، نہایت اعلیٰ فرنیچر اور ہر چیز اتنی صاف اور ستھری کہ ابوظبی کے شیخ اچانک آجائیں تو انہیں سب کچھ تیار ملے۔

اس روز گرمی تھی۔ ریفریجریٹر سے نکال کر ہمیں ناریل کی ڈاب کا پانی پلایا گیا۔ مگر اُس سے زیادہ ٹھنڈک وہاں کے عملے کی خوش اخلاقی نے عطا کی۔

ہمارے بیٹھنے سے شیخ کا فرنیچر میلا نہ ہو جائے، اس خیال سے ہم باہر آکر محل کے زینے کے سب سے اوپر والے پائے دان پر بیٹھ گئے اور باتیں کرنے لگے۔ میرے بائیں ہاتھ پر محمد صدیق بیٹھے تھے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟

"سر میں مالی کا کام کرتا ہوں۔"

میں نے کہا — "یہ تو بڑا گرم بہت ریتلا علاقہ ہے۔ یہاں اتنی اچھی گھاس آپ نے کیسے اُگالی؟"

جواب ملا — "جناب، محنت کرتے ہیں، ان کو کھاد دیتے ہیں، پانی دیتے ہیں اور پھر ان کا نظارہ سردیوں میں زیادہ اچھا لگتا ہے۔ پھول وغیرہ سردیوں میں زیادہ لگتے ہیں، ابھی تو صرف دیکھ بھال کر رہے ہیں۔ ناریل ہیں، چیکو ہیں، ان کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "سردیوں میں کیا یہ محل آباد بھی ہوتا ہے؟"

محمد صدیق بولے — "جی ہاں، جب اس کے مالک آتے ہیں تو بہت اچھا لگتا ہے۔"

میرا اگلا سوال تھا — "یہ شیخ وغیرہ کس موسم میں زیادہ آتے ہیں۔"

انہوں نے کہا — "زیادہ تر یہ سردیوں میں آتے ہیں، دسمبر جنوری میں۔"

"یہاں کتنا وقت گزارتے ہیں —"

"ایک رات یا دو راتیں ٹھہرتے ہیں۔ ان کے بچے بھی آتے ہیں، کبھی اُن کے بھائی آتے ہیں۔"

"کیا کرتے ہیں؟ یہاں کیسے وقت گزارتے ہیں؟ —"

"شکار کھیلتے ہیں۔"

"کس چیز کا شکار کھیلتے ہیں؟"

"بطخ کا۔"

"اور یہاں کچھ تفریح وغیرہ ہوتی ہے؟۔"

"اور کچھ تفریح نہیں ہے۔ رات کو ٹھہرتے ہیں، صبح کو شکار کھیل کے چلے جاتے ہیں۔"

میں نے پوچھا۔ "یہاں قصر ابوظبی کے عملے میں کتنے آدمی کام کرتے ہیں؟"

جواب ملا۔ "پندرہ سولہ آدمی کام کرتے ہیں۔"

"ان سب کی تنخواہ ابوظبی سے آتی ہے؟"

"جی ہاں۔ وہیں سے آتی ہے۔"

"اور جب یہاں شیخ آتے ہیں تو علاقے کے دوسرے لوگوں کو بھی روزی ملتی ہے؟"

"بالکل۔ کافی ملتی ہے۔ مزدوری کرتے ہیں یہ لوگ۔"

اب میں نے پوچھا: "محمد صدیق، آپ مالی ہیں یہاں کے۔ مجھے آپ بتا سکتے ہیں کہ ہر مہینے آپ کو کتنی تنخواہ ملتی ہے؟۔"

انہوں نے بڑی سادگی سے جواب دیا۔ "مجھے بارہ سو ساٹھ روپے ملتے ہیں۔"

"اور جو یہاں دوسرا عملہ ہے، اُسے بھی تقریباً اتنی ہی تنخواہ ملتی ہوگی؟"

"ہر ایک کا اپنا اپنا گریڈ ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کو یہاں رہنے سہنے کی سہولتیں ہیں؟۔"

"جی، سہولتیں ہیں۔"

"یہاں رہ کر آپ باقی دنیا کی خبر کیسے رکھتے ہیں؟"

"ہم بی بی سی سنتے ہیں۔ بی بی سی کے سوا اور کوئی چارہ نہیں ہے۔"

میں نے سوال کیا۔ "آپ نے تعلیم پائی ہے؟"

انہوں نے جواب دیا۔ "پانچ جماعتیں۔"

"آپ کے بچے ہیں؟۔"

"جی، چار بچے ہیں۔"

"وہ کیا کرتے ہیں؟—"

"وہ گھر میں بیٹھے ہیں۔ قریب کوئی اسکول نہیں ہے۔ پڑھتے بھی نہیں ہیں۔"

وہ پانچ جماعتیں پڑھ چکے ہیں، یہ سن کر میں نے ذرا زیادہ علمی سوال پوچھا— "قریب کا یہ علاقہ کیسا ہے، آپ بتا سکتے ہیں؟"

"یہ علاقہ اچھا ہے۔ لیکن تعلیم، روڈ، یہ، وہ سہولت نہیں ہے۔ ہاسپٹل بھی بہت دُور ہے، کوئی قریب شفاخانہ نہیں ہے۔ نہ روڈ پکا ہے۔ اب اگر کوئی مجبوری ہو جائے یا ایمرجینسی ہو جائے، یہ علاقہ سانپ کا ہے۔ روزانہ کوئی نہ کوئی سانپ ہوتا ہی ہوتا ہے۔ کاٹتا ہے آدمیوں کو، تو ہاسپٹل پہنچنے میں بہت دقّت ہوتی ہے۔"

"لوگ مر جاتے ہیں کیا؟"

"مر بھی جاتے ہیں۔ کوئی کوئی ایسا سانپ ہے کہ اس کے کاٹنے سے مر بھی جاتا ہے آدمی۔"

یہ تو محمد صدیق تھے جو سب سے اوپر والے زینے پر میرے بائیں ہاتھ پر بیٹھے تھے۔ میرے سیدھے ہاتھ پر محمد شفیق تھے۔ اس محل کو اُس روز سے جانتے تھے جس دن یہ بن کر تیار ہوا تھا۔ میں نے دور دور تک پھیلی ہوئی سپاٹ زمین کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا کہ کیا یہ سارا علاقہ شیخ کا ہے؟

"جی ہاں۔ یہ شیخ کی یہاں کوئی گیارہ ایکڑ زمین ہے، جو کچھ حکومت نے تحفے میں دی ہے، کچھ انہوں نے خود لی ہے۔"

محمد شفیق زیادہ باخبر، زیادہ تجربہ کار نکلے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ اس ساری زمین کا کیا استعمال ہوتا ہے؟

"زیادہ تر تو شکار گاہ ہے۔ اس میں کاشت یا کچھ اور نہیں ہوتا، بس یہاں مرغابی کا شکار کرتے ہیں۔"

میں نے پوچھا— "شیخ جب آتے ہیں تو اس علاقے میں رونق ہوتی ہے؟"

"اللہ کے فضل و کرم سے بڑی رونق ہوتی ہے کیونکہ جب کوئی خوش نصیب آتا ہے تو علاقے کے ہر ایک آدمی کو خوشی ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جب ہمارے شیخ صاحب آتے

ہیں تو یہاں پر جتنے غریب لوگ ہیں ان کو کافی پیسہ دے کر جاتے ہیں۔ ایک دفعہ تو یہاں قریب ہی ہمارے پیلیس کے برابر میں مسجد بنانے کا حکم دیا، کوئی ۱۴-۱۵ لاکھ روپے کی لاگت سے اور اسی کے قریب، یہاں سے کوئی چھ میل کے فاصلے پر ایک میڈیکل سنٹر بنایا ہے۔ اس پر قریباً ڈیڑھ کروڑ کی لاگت آئی ہے۔ وہ بھی ہمارے غریبوں کے کہنے پر شیخ صاحب نے بنوایا ہے —"

میں نے پوچھا" تو کیا اس مسجد اور ہیلتھ سنٹر میں ہر آدمی جا سکتا ہے؟"

"جی ہاں۔ ہر ایک جا سکتا ہے۔ کسی کو منع نہیں کرتے۔ بھر خاص کر ثواب کے لیے انہوں نے یہ سب کچھ بنوایا ہے۔ اس کے علاوہ جب کبھی شیخ صاحب خود آتے ہیں تو یہاں پر جتنے بھی آدمی ہوں تو اللہ کے فضل وکرم سے ہر آدمی کو دو سو پانچ سو روپے دیتے ہیں۔ نہ جانے کتنے لاکھ روپے دے کر جاتے ہیں اور لوگوں کی دعائیں لے کر چلے جاتے ہیں —"

محمد شفیق کو اتنا باخبر پایا تو میں نے پوچھا" آپ کو معلوم ہے اس محل کی تعمیر پر کتنی لاگت آئی تھی؟"

" ہمیں تو علم نہیں، لیکن سننے میں آیا ہے کہ ایک کروڑ کے قریب آ ہی گئی ہوگی۔"

"کس سال بنی تھی یہ عمارت؟ —"

" یہ ۱۹۸۲ء میں تیار ہو گئی تھی —"

" محمد شفیق صاحب، آپ یہاں کیا کرتے ہیں؟ —"

" سکیورٹی گارڈ ہیں جناب۔"

" اور کب سے ہیں؟ —"

"جناب جب سے یہ پیلیس بنا ہے، پروردگار نے ہماری روزی یہیں پر لگائی ہے اسی دن سے ہم یہیں پر ہیں۔"

محل کی کہانی اب ختم ہونے کو ہے۔ جب یہ سارا احوال اور یہ تمام گفتگو ریڈیو پروگرام کی شکل میں نشر ہو گئی اور سننے والے شیخ کی فیاضی اور دردمندی کی داد دے چکے، محمد شفیق اور محمد صدیق کو شیخ کے کراچی کے دفتر میں طلب کیا گیا اور انہیں ملازمت

سے نکال دیا گیا۔ مالی محمد صدیق تو صبر کر کے بیٹھ رہے، سکیورٹی گارڈ محمد شفیق بھی بے روزگاری کے آگے گھٹنے ٹیک رہے تھے مگران کی بوڑھی والدہ نے اصرار کیا کہ وہ مجھے خط لکھیں اور اس کہانی کے انجام سے آگاہ کریں۔ محمد شفیق نے مجھے خط لکھا ــــ لکھا کہ ہم تو سیدھے سادے لوگ ہیں، آپ تو اعلیٰ تعلیم یافتہ اور سمجھ دار تھے، ہم نے اپنی سادگی میں گفتگو ریکارڈ کرا دی، آپ کو اپنے تجربے کی بنا پر نشر نہ کرنی چاہیے تھی۔ اب ہم اپنی سادہ لوحی کی سزا پا رہے ہیں۔ حالات دشوار ہیں اور دوسرا روزگار کسی حال نہیں مل رہا ہے۔ بوڑھی ماں پوچھتی ہے کہ اب کیا ہوگا۔ مجھ سیدھے سادے آدمی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں ہے، آپ ٹھہرے عقلمند اور سمجھ دار، آپ کے پاس ہو تو لکھ بھیجئے۔ اب ہمارے پاس تشفّی کا سامان نہیں رہا۔ شاید آپ کے جواب سے کچھ سکون آجائے۔

تو یہ تھی محل کی کہانی جس کے آخر میں یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ جیسے محمد صدیق اور محمد شفیق کے دن پھرے، خدا کسی اور کے نہ پھیرے۔

محل دیکھنے کے بعد میں وہ گاؤں دیکھنا چاہتا تھا جو محل کے پچھواڑے ہے۔ میں دیکھنا چاہتا تھا کہ جن لوگوں کی زمینیں ایک بادشاہ نے خریدی ہیں۔ جن کی محنت سے ایک محل بنا ہے، خود اُن لوگوں کی زندگی میں بھی کچھ بنا یا یہاں بھی ہر طرف ٹوٹ پھوٹ ہے۔

محل کا چکر کاٹ کر ہم گاؤں میں پہنچے۔ درختوں کے درمیان کُھلے ہوئے میدان کے بیچوں بیچ ایک شاندار مسجد نظر آئی۔ پختہ مکان نظر آئے۔ نئی عمارتیں دکھائی دیں۔ بدلتا ہوا معاشرہ دکھائی دیا۔ وہ گھر دکھائی دیئے جن کا آدھا حصہ ابھی کچّا تھا اور آدھا پکّا ہو چکا تھا۔ میں نے ایسے ہی ایک مکان کے دروازے میں گردن ڈال کر آواز دی: کوئی ہے؟

اندر سے ایک نوجوان نکل کر آیا، اس پورے علاقے کی تاریخ میں تعلیم پانے والا پہلا نوجوان! اُس نے اپنا تعارف کرایا ــــ "میرا نام رسول بخش بلوچ ہے، میں مہران یونیورسٹی انجینئرنگ کالج، نواب شاہ میں پڑھتا ہوں، الیکٹریکل ڈپارٹمنٹ میں۔ میرے اس گاؤں کا نام دلی داد ہے اور اس کی آبادی دو ہزار کے قریب ہے۔ آس پاس کے علاقے کو بھی ملا لیا جائے تو پانچ چھ ہزار ہوگی۔"

ہونہار طالب علم کی گفتگو کا انداز اچھا لگا۔ میں نے پوچھا کہ علاقے کے لوگ کیا کرتے ہیں؟

رسول بخش بولے — "لوگ یہاں کھیتی باڑی زیادہ کرتے ہیں"۔

میں نے کہا — "یہاں میں دیکھ رہا ہوں کہ نئی نئی عمارتیں بن رہی ہیں۔ تعمیرات ہو رہی ہیں۔ یہ بہت خوبصورت مسجد بنی ہے، یہ سب کیسے ہوا؟ —"

برجستہ جواب ملا "یہ سب شیخ صاحب کی مہربانی ہے، شیخ زید بن سلطان النہیان، متحدہ عرب امارات کے، انہوں نے یہاں زمینیں خریدیں، پھر یہ مسجد دی، روڈ دیا، نہیں روڈ نہیں دیا ابھی، مطلب یہ کہ انشاء اللہ وہ بھی مل جائے گا۔ اور بجلی بھی دی ہے۔ اور اسکول بھی بن رہے ہیں"۔

میں نے کہا — "اس علاقے کی کافی زمینیں شیخ صاحب نے خریدی ہیں اس سے لوگوں کو کچھ مالی فائدہ ہوا ہے؟ —"

"جی ہاں — اچھا خاصا ہوا ہے"۔

"اُس مالی فائدے سے لوگوں نے خود بھی کچھ فائدہ اٹھایا؟ — اپنی حالت بہتر بنائی؟ —"

"جی، اچھی بنائی ہے، مطلب، زمینیں خریدی ہیں، ٹریکٹر لئے ہیں اور شہروں میں کچھ کاروبار کیا ہے۔ کچھ لوگوں کے لانچ چل رہے، کچھ کے پاس ٹرک ہیں۔ اور بھی بہت کچھ فائدے ہیں —"

میں نے پوچھا — "لیکن یہاں تعلیم اور علاج معالجے کی سہولتیں ہیں؟"

وہ بولے — "نہیں۔ یہ بہت کم ہیں۔ شیخ نے ایک اسپتال بنایا تھا ادھر، چالیس بستروں کا اسپتال، لیکن وہ پتہ نہیں گورنمنٹ کا مسئلہ تھا یا کیا تھا وہ سا کرو منتقل ہو گیا اور ہمیں بس یہی بہت تکلیف ہے۔ ایک روڈ کی اور ایک دوا علاج کی —"

میں نے پوچھا — "آپ نے جس طرح نواب شاہ جا کر تعلیم پائی، یہاں کے دوسرے نوجوانوں نے بھی ویسی تعلیم پائی ہے؟

جواب ملا — "ہاں — میرا کزن ہے، وہ لیاقت میڈیکل کالج جام شورو میں پڑھتا ہے۔ میرے دو بھائی ہیں، ایک ایف اے میں پڑھ رہا ہے ایک بی اے میں ہے اور دوسرے بھی میٹرک اور انٹر میں ہیں، مطلب یہ کہ اچھا خاصا ہے"۔

میں نے پوچھا "یہ نوجوان تعلیم پا کر یہیں گاؤں میں رہتے ہیں یا روزگار کے لیے چلے جاتے ہیں"۔

رسول بخش نے کہا ــــ "نہیں ابھی تک تو ملازمت نہیں کی ہے کسی نے ؟"

میں نے پھر پوچھا ــــ "کیا یہ پہلی بار ہے کہ یہاں کے نوجوانوں نے تعلیم پائی ہے ؟"

وہ بولے ــــ "جی ہاں۔ پہلی بار ہے ــــ"

"کیا ارادہ ہے ؟ یہ نوجوان کیا کریں گے ؟ ــــ"

"بس آگے چل کر ملک کی خدمت کریں گے انشاءاللہ، بہت بڑی خدمت اور اگر موقع ملا تو انشاءاللہ دکھائیں گے۔"

آس پاس کھڑا ہوا سارا مجمع بولا ــــ انشاءاللہ !!

شوگر مِل خاموش کھڑا ہے

"اِتنی اچھی سڑک!"

میں خوشی اور حیرت سے اچھل پڑا۔ اچھلنے کی ضرورت کچھ یوں بھی پڑی کہ سڑک سیدھی سپاٹ اور عمدہ تھی اور ہماری جیپ اس پر دوڑ نہیں رہی تھی، تیر رہی تھی۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہا کہ دریائے سندھ کے قریب اِن میدانوں میں یہ تو حکومت نے بہت اچھی سڑک بنائی ہے۔ میری بات سنی تو وہ مسکرا کر چپ ہو گئے۔ میں نے دل میں کہا کہ دیکھو، حکومت کی تعریف کا موقع آیا تو کیسی چپ سادھ لی۔

ہم کیٹی بندر جانا چاہتے تھے۔ کسی زمانے میں علاقے کی اہم بندرگاہ تھی اور پُرانے وقتوں میں دریائے سندھ کی ایک شاخ وہیں سمندر میں گرتی تھی۔ کیٹی بندر میں دن کا سورج ڈوبتے دیکھیں گے۔ میں نے دل ہی دل میں خوش ہونے کا ایک اَور بہانہ ڈھونڈ لیا۔

ہم میرپور ساکرو سے گزرے۔ راہ کا بڑا آباد شہر تھا۔ اس کے بعد گھاڑو آیا۔ یہ بھی بڑا قصبہ تھا۔ میں نے اپنے میزبانوں سے کہا: دریائے سندھ کا سفر ختم ہونے والا ہے۔ اس علاقے کے کسی پرانے خاندان سے بھی ملوا دیجیے۔

یہ فرمائش شاید بالکل صحیح مقام پر کی گئی تھی۔ مجھے بتایا گیا کہ ذرا ہی آگے پیرزادانی گھرانے کے کھیت اور باغ ہیں۔ طے پایا کہ ان ہی کے مہمان خانے میں اُتریں گے۔ ان کی مسجد میں نماز پڑھی جائے گی۔ ان کے بزرگوں کی قبروں پر فاتحہ پڑھا جائے گا اور اگر ممکن ہوا تو علاقے کے کچھ گانے والے اکٹھے کیے جائیں گے۔

ذرا ہی دیر بعد پیرزادانیوں کا فارم آگیا۔ بائیں ہاتھ پر دور دور تک میدان تھے جن کے بیچ

شکر کے کارخانے کی اونچی سی عمارت کھڑی تھی اور داہنے ہاتھ پر کچھ عمارتیں تھیں۔ پھلوں کے باغ اور سبزیوں کے کھیت تھے۔ نالیوں میں تازہ پانی بہہ رہا تھا اور قریب کہیں سمندر تھا جس کی ہوا پھولوں سے لدی شاخوں کو چھوکر آئی تو نالیوں پر جھک کر مُنہ دھونے کا جیسا لطف اُس شام آیا کبھی نہ آیا تھا۔

اگلے ہی لمحے پیروزانی گھرانے سے باتیں شروع ہوگئیں۔ ان کے بزرگ نے اپنا اور اپنے خاندان کا تعارف کرایا —"میرا نام محمد یوسف ہے۔ ہم بلوچ ہیں، ہمیں فیروزانی بھی کہتے ہیں۔ اب تو بزرگوں کے زمانے سے رہائش یہیں ہے، میرے علم کے مطابق ہم لوگوں کو اس جگہ ایک صدی گزر گئی ہے۔ ان سے پہلے جو بزرگ آتے رہے ہوں گے، ان کا ہمیں علم نہیں —"

میں نے پوچھا —"محمد یوسف صاحب، آپ لوگ یہاں کیا کرتے ہیں؟ —"

"زمینداری — بس ہمارا یہی پیشہ ہے بزرگوں سے اب تک، زمینداری!"

زمینداری تو اس علاقے کے زیادہ تر باشندوں کا پیشہ ہے۔ محمد یوسف صاحب کے بعد میں خاندان کے ایک نوجوان سے مخاطب ہوا۔ ان کا نام واحد بخش تھا۔ ذہین، ہونہار اور معاملہ فہم۔ میں نے واحد بخش سے پوچھا کہ اس علاقے میں آپ کی برادری کتنی بڑی ہے؟

جواب ملا "جہاں تک ہماری پیروزانی فیملی کا تعلق ہے، وہ تو بہت چھوٹی سی ہے مگر جہاں تک کلمتی بلوچ قوم کا تعلق ہے، وہ میں سمجھتا ہوں، اس ہمارے علاقے کی آدھی آبادی اور ضلع ٹھٹھہ کی چوتھائی آبادی کلمتی بلوچ ہوگی —"

میں اس علاقے میں جتنے کسانوں اور محنت کشوں سے ملا، زیادہ تر اپنے آپ کو کلمتی بلوچ کہتے تھے۔ سب کہتے تھے کہ انہوں نے سو برس پہلے بلوچستان سے آکر یہ علاقہ آباد کیا تھا۔ میں نے نقشے پر دیکھا۔ جنوب مغربی بلوچستان میں کلمتی علاقہ نظر آیا — کیچ کا علاقہ بھی دکھائی دیا جس کا شہزادہ پنّوں یہیں، اس علاقے میں آیا تھا اور دریا میں نہیں، عشق میں غرق ہوا تھا۔

اب میں نے محمد یوسف صاحب سے پوچھا کہ یہ لوگ جو اس علاقے میں آباد ہیں، ان کا گزر بسر کن کاموں پر ہے، اپنی روزی کیسے کماتے ہیں؟

وہ بولے "سائیں ایک تو لوگ آبادکاری پر گزارا کرتے ہیں، دوسرے یہاں مچھلی پر بھی گزارا ہوتا

ہے، تیسرے یہ لوگ زمینوں پر مزدوری کرتے ہیں، یا سڑکوں کی مرمت پر یا دوسرے کاموں پر مزدوری کرتے ہیں۔ لیکن زیادہ تر لوگ کاشتکاری اور ماہی گیری کرتے ہیں، مچھیرے ہیں ——"

میں نے کہا کہ یہ دریائے سندھ کا ڈیلٹا ہے، مچھلی پکڑنے کا تو یہاں بہت بڑا کاروبار ہونا چاہیئے۔

کہنے لگے "ہاں، لیکن خدا جانے کیا ہوا کہ علاقے میں مچھلی کم ہو گئی ہے۔ پہلے یہ تھا کہ سال میں دو مہینے مچھلی پکڑنے کی ممانعت تھی تاکہ مچھلی کی نسل بڑھے۔ اب وہ دو مہینے کی پابندی بھی ختم کر دی۔ دوسری بات یہ کہ اب ہر چیز میں ترقی ہے۔ اب جال ایسے ایسے نکالے ہیں کہ وہ چھوٹی سے چھوٹی مچھلی کو بھی پکڑ لیتے ہیں۔ تو میرا خیال ہے کہ مچھلی کی نسل کم ہو رہی ہے اس لیے کاروبار میں بھی تھوڑی کمی ہو گئی ہے۔"

بحر عرب کے اس علاقے میں اتنی اچھی مچھلی اور عمدہ جھینگا ہوتا ہے کہ میں نے تو سنا ہے کہ روس اور جاپان تک سے ٹرالر یہاں آتے ہیں اور ریڈار کی مدد سے مچھلیوں کے غول ڈھونڈ کر اور جدید آلات سے انہیں ٹریک کر اپنے جہاز کے سرد خانے بھر بھر کر لے جاتے ہیں۔

دنیا نے بہت ترقی کر لی ہے۔ ٹھٹھ کے اس علاقے کی واحد ترقی مجھے اُس شوگر مل میں نظر آئی جو میدانوں کے بیچ مینار کی طرح کچھ خاموش خاموش سا کھڑا تھا۔ میں نے واحد بخش پیرزادانی سے پوچھا کہ آپ کے علاقے میں صنعتی ترقی ہوئی ہے؟

"صنعتی ترقی بس یہی ہوئی ہے کہ یہ شوگر مل تین سال پہلے یہاں لگی ہے مگر بہت کم چلتی ہے، کچھ ان کا بجلی کا مسئلہ تھا جو ابھی حل نہیں ہے۔ ابھی وہاں بجلی نہیں ہے مگر یہ گرڈ اسٹیشن اسٹارٹ ہو گیا ہے۔ اس سے کچھ اُمید ہے کہ اب یہ بھی چلے گی۔ اور دوسرے یہ کہ مل والوں کی طرف سے کاشتکاروں کو کچھ سہولتیں ملنی چاہئیں تاکہ وہ اپنے گنّے کی کاشت بڑھائیں، تو ابھی تک انہوں نے نہ تو کوئی سہولت دی ہے نہ رہنمائی کی ہے جس کی مدد سے ہم گنّا لگائیں یا اس بارے میں کچھ پوچھیں اور مل والے ہی کیا، حکومت کی طرف سے بھی کاشتکاروں کی رہنمائی نہیں ہوئی ہے کہ ہم لوگ نئی تحقیق کے مطابق بہتر فصل اگائیں، بہتر کاشت کریں۔ بس جس کو جو اپنی سمجھ کے مطابق اچھا لگتا ہے وہ اگاتا ہے۔"

اس کو کہتے ہیں افراتفری۔ اسے منصوبہ بندی کا فقدان بھی کہتے ہیں۔ سارا معاملہ غریب کسانوں

کی سوجھ بوجھ پر چھوڑ دیا جائے تو منڈی کے دلّالوں کے سوا سب کا خسارہ ہے۔

اب میں نے محمد یوسف صاحب سے پوچھا کہ آخر یہ کیسی زمینیں ہیں۔ کاشتکاروں کو فصلیں اگانے میں کتنی مدد ملتی ہے، شکر کا کارخانہ لگنے سے کوئی فرق پڑا ہے یا نہیں؟

" نہیں۔ کوئی خاص فرق نہیں پڑا ہے۔ اصل میں پہلے یہ سارا علاقہ غیر آباد تھا، یہاں سیم اور تھور بہت تھا۔ بعد میں اس کی نالیاں بنیں اور یہاں نہریں آئیں۔ اب اگرچہ سیم و تھور کی نکاسی ہو رہی ہے لیکن بہت سے لوگ ایسے ہیں جو خود اپنے وسائل سے اپنی زمینوں کو آباد نہیں کر سکتے، وہ بیچارے کیا کریں۔ اب یہ شوگر مل والے ہیں، یہ بھی تعاون صحیح نہیں کرتے۔ اس کے علاوہ آبادی بھی کم ہے، پھر پیداوار کے دام میں فرق ہے۔ پچھلے سال پیداوار کے جو دام لگے تھے اس سال اُس میں سے تھوڑا سا کاٹ دیا ہے، جبکہ چینی کے دام بڑھا دیئے ہیں۔ بیوپاریوں نے۔ زمینداروں اور آباد کاروں کو کم دام دے رہے ہیں۔ اسی لیے لوگوں کی آمدنی کم ہو گئی ہے تو وہ اب گنّے کی بجائے دوسری چیزوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔"

بیچارے کاشت کار!

مگر حکومت ان کی مدد تو کرتی ہو گی۔ انہیں مشورے، تعاون اور قرضے تو ملتے ہوں گے حکومت کی کچھ اسکیمیں بھی ہوں گی۔ آپ کیا کہتے ہیں واحد بخش صاحب؟

" اسکیمیں تو حکومت کی بہت ہیں لیکن ان اسکیموں سے مدد کے لیے جائیں تو وہاں اتنی پیچیدہ پالیسیاں ہیں کہ میں اگر ایک لاکھ روپے کا قرضہ منظور کرانے کے لیے جاتا ہوں تو مجھے اتنے چکّر کاٹنے پڑتے ہیں کہ اُس میں سے ۲۵ ہزار روپے تو میرے چکّروں ہی میں ختم ہو جاتے ہیں، تو یہ سوچتا ہوں کہ ۲۵ ہزار تو یوں ختم ہو گئے باقی ۷۵ ہزار روپے مجھے اتنے دن بعد ملتے ہیں کہ اس دوران میرا باقی رہا سہا کام اور خراب ہو جاتا ہے۔ لہٰذا پھر کوئی مجبور ہو کر ہی قرضہ لینے جاتا ہو گا یا کوئی ایسا پاورفُل ہوتا ہو گا جس کو ٹیلی فون پر قرضہ منظور ہو جاتا ہو گا، وہ لے سکتا ہے، باقی ہمارے جیسے عام آدمی کے لیے بڑی دشواری ہوتی ہے۔"

دشواری تو خیر کسانوں کا مقدّر ہے۔ واحد بخش کی باتیں سن کر حیرت نہیں ہوئی۔ دریائے سندھ کے ڈیلٹا کا یہ علاقہ کراچی جیسے عظیم شہر اور بڑی منڈی سے لگا ہوا ہے۔ اس شہر کی دولت یہاں

پہنچتی ہوگی۔ منافع کی شکل میں کاشتکاروں زمینداروں کو خوش حالی نصیب ہوتی ہوگی۔ آپ کا کیا خیال ہے محمد یوسف پیروزانی صاحب؟

"ہاں یہ آپ کا کہنا درست ہے۔ شہر میں ہماری مارکیٹ بھی اچھی ہے۔ لیکن یہاں سے جو ہمارا مال جاتا ہے وہ دو تین پارٹیوں کے ہاتھوں سے گزر کر مارکیٹ میں پہنچتا ہے۔ اب ان کا ایجنٹ کمیشن ہے، دوسرے بیوپاریوں کا منافع ہے، وہ سب ہمارے منافع میں شریک ہو کر اس کا بڑا حصّہ لے جاتے ہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم اگر اچھی فصل اگاتے ہیں، زیادہ مال اگاتے ہیں تو اُسے محفوظ رکھنے کا ویسا کوئی نظام نہیں ہے جیسا ہم سنتے ہیں لندن اور دوسرے علاقوں میں ہے. سنا ہے ان کا ریٹ مقرر ہوتا ہے، مارکیٹ میں قیمت چڑھے یا اترے، کسانوں کو مقررہ رقم ملتی ہے، ادھر سمجھو کہ ہمارا کیلا ہے، صحیح ہو گیا۔ اچھا بھی ہو گیا، مارکیٹ میں اس کا دام گر جاتا ہے۔ تو خرچہ زیادہ ہوتا ہے دام کم ملتا ہے۔ اس سے بھی ہم کو نقصان پہنچتا ہے۔ یا ٹماٹر ہے۔ زیادہ ہو جاتا ہے تو اس مانگ کم ہو جاتی ہے تو ہم اپنے جانوروں کو کھلاتے ہیں یا ویسے ہی زمین میں چھوڑ دیتے ہیں۔ خراب ہو جاتا ہے اور ہمیں نقصان ہوتا ہے۔"

محروم معاشرے میں پیداوار کے یوں ضائع ہو جانے کا تصور اُس شام بھیانک خواب جیسا لگا۔ اچھا یہ تو ہوئی زراعت کی بات۔ اب یہ بتایئے کہ اس علاقے میں تعلیم اور صحت کا کیا حال ہے، اسپتال ہیں، اسکول کیسے ہیں، محمد یوسف صاحب؟

"سائیں، جہاں تک صحت کا تعلق ہے تو حکومت نے ہم کو ہاسپٹل بنا کر دیا ہے لیکن ابھی بجلی نہ ہونے کی وجہ سے پریشانی ہے، جیسے یہاں بگان میں ہیلتھ سنٹر بنا ہوا ہے، ابھی تک اس میں بجلی نہیں آئی ہے اور وہاں ایکسرے پلانٹ اور دوسری مشینری فالتو پڑی ہے۔ اس وجہ سے لوگوں کو فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اب رہ گئی تعلیم تو آج کل ہنگامے ہو رہے ہیں اس لیے تعلیم اب پہلی جیسی نہیں رہی ہے —"

میں نے پوچھا — "آپ کے ہاں اسکول وغیرہ کافی ہیں؟ —"

"ہاں، اسکول تو قریب قریب ہر گاؤں میں ہے۔ ہمارے گاؤں میں بھی ہے لیکن اس کی عمارت اب گرنے والی ہے۔ لہٰذا اب ہم اپنے بچوں کو عمارت کے باہر بٹھاتے ہیں۔ ستر اسّی بچے پڑھتے

ہیں لیکن ان کے لیے ہم اپنی کوٹھی بنا کر اس میں انہیں پڑھاتے ہیں۔ اب ذمے دار آفیسروں کو بول تو دیا ہے کہ اسکول کی عمارت گرنے والی ہے لیکن ابھی تک انہوں نے توجہ نہیں کی ہے۔"

سارا مسئلہ توجہ کا ہے۔ وہ نہیں دی جائے گی تو احساس محرومی کی جڑیں ان زرخیز زمینوں میں اترتی جائیں گی۔

واحد بخش صاحب۔ آپ بتائیے، آپ کیا سمجھتے ہیں۔ ان زمینوں کا یہ علاقہ غریب ہے؟ مفلس ہے؟ کیا آپ اسے پسماندہ کہیں گے؟

"بلکہ بہت پسماندہ کہیں گے! ایک پسماندہ ہوتا ہے، یہ کچھ زیادہ ہی پسماندہ ہے کیونکہ کراچی جو پاکستان کا دل کہا جاتا ہے اُس سے نزدیک ترین بھی یہی ہمارا علاقہ ہے اور بہت قدیم بندر بھی ہے یہ، مگر اس علاقے کی بدقسمتی ہے کہ یہاں جو دو تین تحصیلیں ہیں، ان میں صرف یہ ایک پکی سڑک بنی ہوئی ہے جو دوبئی کے شیخ کی طرف سے عطیے کے طور پر دی گئی تھی ——"

کس کی طرف سے؟ میں چونکا۔ یہ اتنی عمدہ، سیدھی اور سپاٹ سڑک ایک غیر ملک کے حاکم کی طرف سے بنا کر دی گئی ہے؟

"جی ہاں۔ ان کو بھٹو صاحب نے یہاں زمین دی تھی۔ وہاں تک آنے جانے کے لیے اور عملے کے لیے انہوں نے سڑک بنائی اور بس یہ ایک ہی سڑک بنی ہے جو ان کے فارم پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔ اور اب تو یہ اتنی خستہ حالت میں ہے کہ اگر ذرا سی بارش ہو جائے تو اتنی تکلیف ہو جاتی ہے کہ اس پکی سڑک پر بھی آپ گاڑی میں نہیں چل سکتے۔ اور سنا یہ ہے کہ دوبئی والوں نے اب یہ سڑک حکومت کے حوالے کر دی ہے کہ اب آپ اسے سنبھالیں مگر اس کی طرف کوئی توجہ نہیں دی گئی ہے۔ سمجھیں کہ کسی نے ہمارے اوپر ترس کھا کر یہ بنوا دی اب ہمارا فرض ہے کہ اس کو درست رکھیں تاکہ کچھ عرصے یہ چلے لیکن اگر اسی حالت میں رہی تو یہ بھی ختم ہو جائے گی ——"

توجہ نہیں دی گئی، توجہ نہیں دی گئی۔ یہ جملہ بار بار سننے میں آیا۔ جس سڑک کو دیکھ کر میں خوشی سے اچھل پڑا تھا اس کے مستقبل کی طرف سے اس مایوسی کا سبب بھی وہی تھا: توجہ نہیں دی گئی۔ البتہ اس شام ایک ایسی بات، اچھی بات بھی سننے میں آئی جو خوشی کا سبب بنتی ہے۔ محمد یوسف

صاحب سے باتیں ہو رہی تھیں کہ دریائے سندھ کے اس آخری پڑاؤ پر چوری، ڈاکہ، مار پیٹ، قتل و غارت گری اور تشدد کا کیا حال ہے۔ یہ بات کرتے کرتے میں نے اپنی کرسی محمد یوسف صاحب کے اور قریب کر لی اور پوچھا کہ سندھ کے اس علاقے میں چوریاں ہوتی ہیں؟ ڈاکے پڑتے ہیں؟

اُن کا جواب یوں تھا — "ہمارے اس علاقے میں اللہ کے فضل سے ڈاکہ یا چوری یا تشدد کچھ نہیں ہے، سکون ہے۔ جو بھی لوگ ہیں سیدھے سادے ہیں۔ ان کو تو کھانے کے لیے بھی پورا نہیں پڑتا، وہ اپنی مزدوری میں مصروف ہیں۔ باقی اس علاقے میں چوری تک نہیں ہے۔ کوئی جھگڑا ہنگامہ یا سیاسی چکّر ہمارے ہاں نہیں ہے —"

میں نے پوچھا — "کیا اس کی وجہ غریبی ہے؟ —"

جواب ملا: "ہاں غریبی بھی ہے۔ اس کے علاوہ لوگ سادگی سے وقت گزارتے ہیں۔ سادگی ہے، پھر آپس کے تعلقات ہیں جیسے آپس میں رشتے داری ہوتی ہے، یہ نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم فلانا ہیں یا فلانا ہیں یا بلوچ ہیں یا سندھی ہیں۔ ہم سب مسلمان ہیں۔ بھائی ہیں۔ ہمارے ساتھ پنجابیوں کی بھی زمین ہے، مہاجروں کی بھی زمین ہے اور سندھیوں کی بھی ہیں، بلوچوں کی بھی ہیں، پٹھانوں بھی ہیں لیکن ہم اللہ کے فضل سے آپس میں بھائی بھائی ہو کر رہتے ہیں اور آپس میں شادی غمی میں بھی شریک ہوتے ہیں۔ ہمارے علاقے میں بڑا چین ہے۔"

محمد یوسف صاحب کی یہ بات سن کر میں نے کہا — "سنیے، مجھے اپنے علاقے میں ذرا سی زمین دلوا دیجیے۔ ٹھیک ہے میرے ٹماٹر سڑیں گے اور کراچی کے بیوپاری مجھے لوٹیں گے لیکن اس کے بدلے اگر باقی عمر چین سے کٹ گئی تو میں فائدے ہی میں رہوں گا۔"

میرا یہ کہنا تھا کہ محمد یوسف صاحب نے اٹھ کر مجھے سینے سے لگا لیا۔ بالکل یوں جیسے ایک بھائی دوسرے کو سینے سے لگاتا ہے۔

دریائے سندھ کے کنارے کنارے اس سفر کے آخری مرحلے میں ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ ہمیں عبدالعزیز مل گئے۔ ہوا یہ کہ ہم میرپور ساکرو میں رُکے اور وہاں کی بلدیہ کے دفتر میں گئے تاکہ علاقے کے حکّام سے کچھ مدد، کچھ مشورہ لیں۔ عبدالعزیز وہیں بیٹھے تھے۔ جواں سال، علم کے

ساتھ ساتھ فکر کے بھی مالک، علاقے کے باشندوں کے دکھ درد میں شریک اور بڑے سرگرم سوشل ورکر۔

حقیقت یہ ہے کہ نوجوان سوشل ورکر میرپور ساکرو کے علاقے میں بڑا کام کرتے رہے ہیں تاکہ ان غریب ہاریوں کی سماجی حالت بہتر بنائی جائے جو ان زمینوں کو پانی سے زیادہ اپنے پسینے سے سیراب کرتے ہیں۔

عبدالعزیز نے پیشکش کی کہ وہ ہمارے ساتھ چلیں گے اور ہماری رہنمائی کرکے کھاروچھان لے چلیں گے جہاں دریائے سندھ کی جو واحد شاخ بچی ہے وہ دریائے سندھ میں گرتی ہے۔ کہنے لگے کہ وہ ہمیں دکھائیں گے کہ میٹھے پانی کی کمزور سی دھار کڑوے سمندر کی طوفانی موجوں سے کیسے ٹکرلے رہی ہے۔

ذرا ہی دیر بعد ہماری جیپ کھاروچھان کی طرف دوڑنے لگی۔ کچھ دور پکّی سڑک ساتھ چلی، پھر کچّی سڑک آگئی۔ آخر میں وہ بھی ختم ہوئی اور موٹر گاڑیوں کے پہیوں کے نشان رہ گئے۔ ہر طرف سپاٹ میدانوں میں کیلے کے بے شمار درخت کھڑے تھے، پرائمری اسکول کے لڑکوں جتنے اونچے۔

کھاروچھان تو نہیں آیا البتہ سر پر منڈلاتے ہوئے کالے بادل آگئے، ذرا دیر پہلے سمندر سے اٹھے ہوئے اور پانی سے لدے ہوئے نئے نئے بادل اور وہ بھی اتنے نیچے کہ ہائی اسکول کے لڑکے ہاتھ اونچا کریں تو بیچ کی انگلی انہیں چھولے۔

اوپر تیزی سے اڑے چلے جانے والے بادلوں کو، اور نیچے پچھلی بارش کی کیچڑ کو دیکھ کر میں نے کہا کہ اگر یہ گھٹا برس گئی تو کیا ہوگا، جیپ کے سارے مسافر چلّائے: "خدا نہ کرے —" تب پتہ چلا کہ اگر بادل برسے تو ساری زمین گارا بن جائے گی اور پہیے اس میں دھنس جائیں گے۔ ایسی صورت میں بَیل منگوائے جاتے ہیں جو کیچڑ میں گھُر گاڑ گاڑ کر گاڑیوں کو کھینچتے ہیں، تب کہیں نجات ملتی ہے اور جدید سائنس دل ہی دل میں بَیل گاڑی کے زمانے کو دعائیں دیتی ہے۔

کھاروچھان اب زیادہ دور نہیں تھا۔ اُدھر سے مچھیروں کی پک اَپ گاڑیاں چلی آرہی تھیں۔ عین اُس وقت فیصلہ کیا گیا کہ بارش اب برسا ہی چاہتی ہے۔ خیریت اسی میں ہے کہ جدھر سے آئے ہیں اُدھر لوٹ جائیں۔

دریا کے سمندر میں گرنے کا نظارہ میری قسمت میں نہ تھا۔ گاڑی لوٹ گئی۔ جوں جوں سمندر دور ہوتا گیا بادل اُونچے ہوتے گئے یہاں تک کہ بارش کا خطرہ ٹل گیا۔ اُس وقت ہم نے دیکھا کہ چاروں طرف نئی فصلیں سینہ تانے کھڑی ہیں اور بہت سے ہاری، بہت سے کسان کمر دوہری کیے، دیر سے جھکے ان کی یوں نگہداشت کر رہے ہیں جیسے فصل نہ ہو، بچہ ہو اور ہاری نہ ہو، ماں ہو۔

ہم سب جیپ سے اُترے اور طے کیا کہ اِن کسانوں سے باتیں کی جائیں۔ اب میں عبدالعزیز سے پوچھنا چاہتا تھا کہ یہ علاقہ کیسا ہے۔ اس کے ساتھ دریا کا سلوک کیسا ہے اور اس کی موجیں غریب ہاریوں کے ساتھ کیسے پیش آتی ہیں اور ان سادہ لوح لوگوں کے ذہن اور فکر پر کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ میں نے پوچھا: عبدالعزیز صاحب، یہ کونسی جگہ ہے؟

جواب کا دفتر کھل گیا —— "ہم جہاں آگئے ہیں یہ مور چھڈائی ہے اور آٹھ مہینے پہلے اگست میں دریا کا پانی اس کو روندتا چلا گیا تھا اور یہ جو آپ کیلے، چیکو اور ناریل کی فصل دیکھ رہے ہیں، یہ جتنے گاؤں، بستیاں اور ہنستے کھلتے چہرے ہیں، رات کے اندھیرے میں جب دریا موجزن ہوا تو یہ وسیع علاقہ اور اس کے یہ لوگ پانی کی زد میں آگئے اور یہاں کچھ نہیں رہا۔ دریا کا یہ ٹکڑا، اور یہ جگہ قلندری شاہ کے نزدیک ہے اور اگرچہ انسان نے اس دریا پر قابو پا رکھا ہے لیکن یہ جب مستی میں آتا ہے تو ہر چیز کو روندتا چلا جاتا ہے، اور یہ جو روندنا ہے یہ ان لوگوں، یہاں کے باشندوں کے مزاج کا ایک حصہ بن گیا ہے۔ ان لوگوں کے مزاج میں، بات میں اور لب و لہجے میں طنز، شکایت اور تلخی آگئی ہے جو صاف محسوس ہوتی ہے، کیونکہ یہ لوگ اجڑتے رہتے ہیں اور اجڑتے رہتے ہیں۔"

اب عبدالعزیز کی یہ بات آزمانے کا وقت آ پہنچا۔ میں ایک ہاری کے پاس گیا اور اپنا تعارف کرایا۔ وہ حاجی میر خان ترگل تھے۔ دور دور تک کھڑے ہوئے کیلے کے ہزاروں چھوٹے چھوٹے درختوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے حاجی میر خان سے پوچھا کہ ان زمینوں میں کیلے کی کاشت کب سے ہو رہی ہے۔ یہ سوال پوچھتے ہوئے میں نے سوچا کہ بھلا اس میں یہ کس بات کا گلا اور کس چیز کی شکایت کریں گے —— وہ بولے:

"جب سے نہریں آئی ہیں، اس وقت سے کیلے کی کاشت ہو رہی ہے۔ یہ نہریں ۱۹۵۵ء میں

آئی تھیں۔"

میں نے پوچھا — "کیسا کیلا ہوتا ہے یہاں؟ —"

وہ بولے — "ادھر کیلے بہت اچھے ہوئے۔ کیلے اچھے دیکھ کر حکومت نے یہ زمینیں فوجیوں کو دے دیں اور ہمارے بارے میں کہا کہ ہمیں آبادی کرنے کی اجازت نہیں ہے —"

میں نے پوچھا — "اچھا تو جب آپ کی یہ زمینیں فوجیوں کو دے دی گئیں تو آپ نے کیا کیا؟"۔

وہ بولے — "ہم نے حکومت کو بہت تاریں دیں۔ وزیروں سے ملے۔ مگر انہوں نے کچھ نہیں کیا۔ آخر ہم نے ڈنڈا سنبھالا، ان کے آدمی آئے۔ ہم نے انہیں بھگا دیا۔"

میں نے پوچھا — "تو اب یہ زمینیں آپ کے پاس ہیں؟"

جواب ملا — "زمینیں تو ہمارے پاس ہیں مگر نام ان ہی کا ہے۔"

اتنے میں ایک دوسرے کسان نے آکر حاجی صاحب کے کان میں کچھ پوچھا۔ وہ اطمینان دلاتے ہوئے بولے کہ یہ بی بی سی کا نمائندہ ہے۔ میں نے پوچھا کہ کیلے کی یہ پوری فصل اتنی چھوٹی کیوں ہے؟ انہوں نے وضاحت کر دی "یہاں سیلاب آیا تھا، وہ سارے درخت بہا کر لے گیا، وہ بالکل تیار درخت تھے۔ سیلاب آیا تو یہ پورا ہزار ایکڑ علاقہ تباہ ہوگیا — اب اپنا خرچ کرکے، اپنی رقم اٹھا کر نئے پودے لگائے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "یہاں جو کیلا پیدا ہوتا ہے یہ کہاں جاتا ہے؟ —" میری توقع کے مطابق انہوں نے کراچی اور پنجاب کا نام لیا اور پھر کہا کہ یہ کیلا ایران تک جاتا ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ سے یہ کیلا پہلے دلال لیتا ہوگا۔ وہ آڑھتی کو دیتا ہوگا۔ وہ کسی اور کو دیتا ہوگا — آپ کو تو بہت کم قیمت ملتی ہوگی —"

وہ فوراً بولے۔ "ہمیں کیا ملتا ہے۔ ہم سے سو روپے من لیتے ہیں اور وہاں جاکر تین سو روپے من بیچتے ہیں۔ پھر یہ کیلا مفت نہیں اگتا۔ اسے اگانے پر خرچہ بھی بہت آتا ہے —"

اب میرے تبصرے کی ضرورت نہیں۔ ان کے لہجے میں طنز، تلخی اور شکایت آپ خود ڈھونڈیے۔

اب ایک اور ہاری حاجی علی بخش میرے قریب آگئے۔ میں نے ان سے پوچھا کہ آپ اس علاقے میں آکر کب آباد ہوئے تھے؟

"نہیں؟ ـــ میں آیا تھا سنہ میں ـــ"

"اُس وقت یہاں کیا حال تھا؟ ـــ"

"یہ بر تھا، میدان تھا، بیابان تھا، کچھ نہیں تھا اِدھر ـــ"

"اچھا ـــ پھر آپ نے کاشتکاری شروع کی؟ ـــ"

"ہاں۔ یہ ساری ہماری آبادی تھی، جو کچھ بھی کاشتکاری تھی ہم کرتے تھے، حکومت نے وہ سب فوجیوں کو دے دی، گورنر جائیداد خان نے سب کچھ دے دیا۔ ہم نے کہا کہ زمین لوکل ہاری کو ملنی چاہیے۔ جو پہلے سے یہاں بیٹھا ہے، اُسے ملنی چاہیے۔ ہمارے گاؤں ہیں، ہمارے یہ قصبے ہیں۔ زمین بھی ہمیں دو۔ مگر وہ نہیں مانے ـــ"

سینکڑوں میل دور بیٹھے ہوئے جن غیر حاضر مالکوں کے نام یہ زمینیں لکھ دی گئی ہیں ان کے وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ ان زمینوں سے صرف دولت ہی نہیں، مصیبت بھی اُگتی ہے۔ یہ بھی وہی ولادت ہے جس کے دکھ صرف ماں جانتی ہے۔ میں نے حاجی علی بخش سے کہا کہ اب آپ مطالبہ کرکے یہاں سڑکیں بنوائیے۔ وہ بولے ـــ "ہماری یہی مصیبت ہے کہ ادھر روڈ نہیں ہے۔ ہماری فصل منڈی تک نہیں پہنچ سکتی۔ سائیں ہماری یہی خواہش ہے کہ یہ روڈ پکّا ہو جائے۔ سائیں مال جانے لگے تو اچھا ہو ورنہ سیلاب آیا تو سارے آدمیوں کا ایک کروڑ کا نقصان ہوا۔ اب یہ نئی فصل ہے۔ ادھر تو بہت بڑے درخت تھے مگر یہاں چپے چپے پر پانی آیا اور گورنمنٹ نے ہماری کوئی مدد نہیں کی۔ ہم نے کہا کہ کچّا بند بنا دو۔ کچھ پانی رکے گا اس لیے کچّا بند بنا دو۔ مگر نہیں بنایا۔"

میں سوچنے لگا کہ یہ لوگ جو شہروں میں آباد کروڑوں لوگوں کے پیٹ بھر رہے ہیں ان غریب کسانوں کی زمینیں زندگی کی زیادہ تر سہولتوں سے خالی ہیں۔ میں نے حاجی علی بخش سے پوچھا کہ اس علاقے میں کیا کیا بننا چاہیئے۔

"یہاں بند بنے، یہاں روڈ بنے، اسکول بنے، شفاخانہ ہے مگر اس میں کوئی ڈاکٹر بھی ہو۔ اب حال یہ ہے کہ ایمرجینسی ہو جائے تو مریض کو کراچی لے جانا پڑتا ہے، وہ بھی جو ساہوکار ہوگا، پیسے والا ہوگا، وہی اپنے مریض کو کراچی لے جائے گا۔ اور جو غریب ہوگا اس کا مریض تو ادھر ہی مریگا۔"

علی بخش سے یہ باتیں ہو رہی تھیں کہ میر خان نے بڑھ کر لقمہ دیا — " ابھی ادھر ایک واقعہ ہوا ہے، ایک آدمی کی بیوی تھی، اس کی حالت خراب ہوئی۔ اُسے لے کر بگان کے شفا خانے گئے۔ انہوں نے کہا کہ ہمارے پاس تو کچھ بھی نہیں ہے۔ ایمرجینسی کیس تھا لہٰذا اسے لے کر کراچی دوڑے اور جناح اسپتال کے گیٹ تک پہنچے تھے کہ عورت نے دم توڑ دیا۔ اُلٹے پاؤں آگئے اس کی لاش لے کر۔ یہ ہمارے علاقے کا حشر ہے۔"

اور انہوں نے لفظ حشر یوں ادا کیا کہ حشر کی آوازیں کانوں میں اور منظر نگاہوں میں گھومنے لگے۔ تو یہ ہے سندھ کے غریب ہاری کا انداز فکر۔ اس کے اس علاقے میں پہلے ہر سمت دریا بہتا تھا۔ اب مقابلے پر کوئی نہ رہا تو سمندر چڑھا چلا آتا ہے۔ میں نے عبدالعزیز سے پوچھا کہ دریا پر ڈیم اور بیراج بن گئے ہیں۔ نیچے آتے آتے سندھ سوکھنے لگتا ہے۔ اس سے اس علاقے میں فرق آیا ہے؟ —

وہ بولے — " جی ہاں۔ بہت بڑا فرق آیا ہے۔ یہ دریا جب اپنے قدرتی انداز میں بہتا تھا تو یہ وسیع علاقہ جو گھارو سے لے کر کیٹی بندر یا کھارو چھان تک ہے، اس علاقے میں دریا کی ۱۴ شاخیں تھیں مثلاً بگاڑ، چیچاڑو، ٹھٹھو، قلندری، اوتو، اور گھارو۔ وہاں جو گھارو کریک ہے یہ بھی دریا تھا۔ یہ اسّی کیلومیٹر کا علاقہ دریا ہی دریا تھا۔ یہاں سکندر اعظم آیا اور اس نے جب پانی کو بھرا ہوا دیکھا تو وہ سمجھا کہ یہ بحرِ عرب ہے لیکن یہ بحرِ عرب نہیں تھا، یہ انڈس تھا —"

میں نے کہا — " اچھا عبدالعزیز صاحب۔ ہم کھارو چھان نہ جا سکے اور انڈس اور بحرِ عرب کا ملاپ نہ دیکھ سکے۔ آپ نے تو دیکھا ہوگا۔ وہ علاقہ کیسا ہے۔ وہاں کے لوگ کیسے ہیں؟"

کہنے لگے — " کھارو چھان ایک علاقہ ہے جس کو آپ نہیں کہہ سکتے کہ وہ دریا کی دائیں جانب ہے یا بائیں جانب ہے۔ وہ زمین کا ایسا ٹکڑا ہے کہ آپ دیکھیں گے کہ دریا اِدھر اُدھر ہوتا رہتا ہے مگر وہ اپنی جگہ رہتا ہے۔ وہاں کے بارے میں روایت ہے کہ جب دریا پر انسان کا بس نہیں چلتا تھا اور بیراج نہیں بنے تھے تو اُس وقت وہ علاقہ اتنا خوش حال تھا کہ لوگ کہتے تھے کہ وہاں دودھ کی نہریں بہتی ہیں بلکہ شہد کی نہریں بھی بہتی تھیں۔ کہتے ہیں کہ جو مہمان وہاں آتا تھا اس کی تواضع دودھ اور شہد سے کیا کرتے تھے۔ آج اس جگہ ہمارا جانا ہوتا ہے تو کبھی کبھی

یہ بھی ہوتا ہے کہ میٹھے پانی کا گلاس بھی نہیں ملتا ۔۔۔"

عبدالعزیز کی باتوں میں سنجیدگی آگئی۔ وہ سوشل ورکر ہیں۔ ان کسانوں کے درمیان رہ کر زندگی گزارتے ہیں۔ اِس زمین پر ان کے ہر قدم کے ساتھ اڑنے والی گرد ان کے وجود میں سما کر ان کی فکر کی عمارت بناتی ہے۔ اُس شام ان کی باتیں اِسی زمین کی باتوں پر ختم ہوئیں۔

" یہ زمین چونکہ سمندر کے قریب ہے اس لیے سمندر کا پانی اس کے اوپر چڑھ آیا ہے اور نیچے پانی کڑوا ہو گیا ہے۔ پینے کا پانی کڑوا ہے اور اس کی زمین آپ کو کالی نظر آتی ہوگی اور بڑے بڑے نمک کے دھبے نظر آتے ہوں گے۔ ماضی میں یہ چیز نہیں تھی۔ اس علاقے کی سماجی اور اقتصادی حالت میں تیزی سے تبدیلی آرہی ہے۔ مویشی ختم ہو گئے ہیں، جو جانور یہاں آج ہیں وہ بیمار ہیں۔ ان کے جگر محفوظ نہیں۔ یہاں بڑے صحت مند جانور ہوتے تھے، اب وہ مریض ہیں۔ یہی حال انسان کا، دریا کے چلے جانے کا اس پر بھی اثر پڑا ہے، جو آدمی کبھی ڈاکٹر کے پاس نہیں جاتا تھا، جس نے کبھی ڈاکٹر کا نام بھی نہیں سنا تھا وہ آج ڈاکٹر کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ لوگوں کی لمبی عمر گھٹ گئی ہے۔ آپ جہاں بھی گئے ہوں گے، لوگ چلاّئے ہوں گے کہ ڈاکٹر چاہیے ڈاکٹر چاہیے۔ لوگ بیمار ہوتے ہیں، کوئی علاج نہیں ہے، کوئی دوا نہیں ہے۔ میں یہ کہوں گا دریا بند ہو جانے کا اس علاقے پر شدید اثر پڑا ہے اور یہ علاقہ جو پہلے شکارگاہ تھا، یا آبادی کے لیے موزوں تھا، آج اس کا یہ حال ہے کہ شہر کراچی بپھرے ہوئے ہاتھی کی طرح پھیلتا چلا آرہا ہے اور یہ علاقہ اس کی لپیٹ میں ہے۔ دریا اس علاقے کو چھوڑ گیا ہے، کراچی اس کو نگل رہا ہے۔ یہ اس علاقے کا المیہ ہے ۔۔۔"

چائے، تعلیم اور ہرن

ایک روز یہ ہوا کہ ہم سندھ کے ایک غیر آباد علاقے میں چلے جا رہے تھے اور راستہ بھٹک گئے تھے۔ تلاش میں تھے کہ کوئی گاؤں ملے تو گاؤں والوں سے راستہ پوچھیں۔ آخر گاؤں ملا مگر اُس سے بھی پہلے گاؤں کا مہمان خانہ ملا۔ سندھ والے بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں، گاؤں بعد میں، پہلے گاؤں کا مہمان خانہ بناتے ہیں۔ دوسرے مکان چاہے کچے، خستہ یا ادھورے ہوں مگر یہ اوطاق سب سے اچھا ہوتا ہے۔ اندر ایک بڑا یا دو تین چھوٹے کمرے۔ اس کے آگے برآمدہ اور سامنے دالان جس کے بیچوں بیچ سائے کی خاطر لگا ہوا بڑا سا پُرانا درخت۔ لکڑی کے دروازے۔ کھڑکیوں میں لوہے کی سلاخیں۔ قریب رکھے ہوئے پانی کے گھڑے۔ برآمدے میں پڑی ہوئی چارپائیاں اور اُن پر لپٹے ہوئے بستر۔ اِدھر مہمان آیا، اُدھر بستر کھول دیئے گئے اور گیس کے ہنڈے میں ہوا بھری جانے لگی۔ تھوڑی ہی دیر بعد رئیس کے مکان سے پراٹھوں اور مچھلی اور مُرغ کے سالن اور بریانی کی خوشبو آنے لگی۔ آس پاس کے لوگ جمع ہو گئے اور اس کے بعد جو انجمن آراستہ ہوتی ہے وہ کچہری کہلاتی ہے۔

اُس روز دریائے سندھ کے دہانے کے قریب زمینداروں اور کاشتکاروں سے ملاقاتوں کے بعد جی چاہا کہ اب کسی رئیس یا وڈیرے سے ملیں، اس کی باتیں سنیں اور دیکھیں کے ہاری اور وڈیرے کے سوچنے کے انداز میں کتنا فرق ہوتا ہے۔

رات ہو گئی تھی اور گاڑھو کے پیرو زانی گھرانے والے اصرار کر رہے تھے کہ یہیں اوطاق میں سو رہیئے، صبح تڑکے چلے جایئے گا لیکن میرے ساتھی مُصر تھے کہ ابھی لاڈیوں چلتے ہیں۔ سویرے وہیں سے شاہ بندر چلے جائیں گے۔ بڑی

مشکل سے رخصت ملی مگر اس ہدایت کے ساتھ کہ رات ہوتے ہی سمندر کی نمی زمین پر اُتر آتی ہے اور سڑکوں پر موٹر گاڑیاں بُری طرح پھسل جاتی ہیں اس لیے گاڑی بے حد احتیاط سے چلائیں۔

بالکل اندھیری رات تھی البتہ دور افق پر ٹھٹھہ شوگر مل کی روشنیاں بھی تھیں۔ غضب کا سناٹا تھا مگر دھان کے کھیتوں میں لاکھوں مینڈک مل کر شور بھی مچا رہے تھے۔ جیپ راستے کے کسی قصبے سے گزرتی تو چائے خانے کھلے ملتے اور دوسری عالمی جنگ کی بندوقیں کندھوں پر لٹکائے آدھے سوئے آدھے جاگے پولیس کانسٹیبل نظر آتے ـــــ

آدھی رات گزر گئی اور ہمارا سفر جاری رہا۔ ٹھٹھہ، چوہڑ جمالی اور لاڈیوں بھی پیچھے رہ گئے۔ تب خدا خدا کر کے وہ گاؤں آیا جو ہماری منزل تھا۔ میں حیران تھا کہ رات کے ڈھائی بجے کس کے دروازے پر دستک دیں گے، کسے جگائیں گے، کون ہمارے ٹھہرنے اور سونے کا انتظام کرے گا۔ آخر جیپ ایک عمارت کے آگے رُکی۔ اندھیرے میں وہ عمارت ریلوے اسٹیشن کے درجہ اوّل کے مسافر خانے جیسی نظر آئی۔

وہی اِس گاؤں کا اوطاق تھا۔ اس کے دروازے کھلے تھے۔ اندر بتّیاں روشن تھیں اور چارپائیاں آراستہ تھیں حالانکہ اہلِ خانہ کو ہمارے آنے کی اطلاع نہ تھی۔ ہم نے چارپائیاں باہر کھینچیں اور صحن کے بیچ کھڑے ہوئے بڑے سے درخت کے نیچے بستر بچھا کر لیٹ گئے۔ چوروں اور ڈاکوؤں کے خوف سے اپنے بٹوے، کیمرے اور ٹیپ ریکارڈر وغیرہ جیپ کے اندر رکھ کر تالے لگا دیئے۔ اب یقین تھا کہ اطمینان سے سوئیں گے، اتنے میں صبح ہو گئی اور صبح بھی ایسی کہ سورج کی پہلی کرن سے بھی پہلے ہمارے اوپر چھائے ہوئے درخت پر بسیرا کرنے والے بھانت بھانت کے پرندے پھڑا پھڑا کر جاگے اور اب جو انہوں نے اونچی لَے میں گانا شروع کیا تو صبح کی خُنک فضا میں موسیقی بھر گئی۔ بیک وقت اتنی بہت سی، اتنی سُریلی تانیں تو اکثر لوگوں نے سنی ہوں گی لیکن اتنے قریب سے نہیں کہ جب یہ پرند اپنے پَر

پھڑپھڑاتے تھے تو رُخ پر ہوا لگتی تھی۔
اچانک مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ چڑیوں کا یہ گانا ریکارڈ کرلوں، ایسے میٹھے سُر محفوظ ہوجائیں گے تو واپس جا کر احباب کے سامنے لمبی تقریروں کی بجائے یہ ریکارڈنگ چلادیا کروں گا۔ مگر پھر یاد آیا کہ میرا ٹیپ ریکارڈر جیپ کے اندر بند ہے اور جیپ کی چابی جن صاحب کی جیب میں ہے وہ اِس بُری طرح سو رہے ہیں کہ ان کے خرّاٹوں سے سہم کر کتنی ہی چڑیوں نے گانا موقوف کر دیا ہوگا۔
روشنی ہونے سے پہلے پہلے سارے پنچھی اڑ گئے۔ کچھ دیر بعد گاؤں کے مکانوں کے خطوط واضح ہونے لگے۔ سامنے بہت اونچی اونچی دیواروں کے پیچھے اُن سے بھی اونچی عمارت تھی جس کی کھڑکیاں بھینچ کر بند کی گئی تھیں اور شاید برسوں سے نہیں کھلی تھیں۔
اوطاق کی عمارت کی پیشانی پر سفید پتھر کا کتبہ لگا تھا جس پر لکھا تھا کہ یہ مہمان خانہ رئیس خان بہادر خیر محمد خان چانڈیو نے تعمیر کرایا تھا۔ یہ گاؤں اُن کے بزرگ محمد یوسف چانڈیو کے نام پر تھا اور اب اس حویلی میں رئیس خان محمد چانڈیو آباد تھے۔ میں اُٹھ کر مہمان خانے کا جائزہ لینے لگا۔ کبھی شاندار اور آرام دہ عمارت رہی ہو گی۔ اب اس کی حالت بگڑ چلی تھی لیکن بگڑے رئیسوں جیسی اب بھی نہ تھی۔ رئیس خان محمد چانڈیو کو ہمارے آنے کی پہلے سے خبر ہوتی تو وہ اسے ضرور آراستہ کرا لیتے۔
پہلے ان کے ملازموں نے دیکھا کہ اوطاق میں مہمان اترے ہوئے ہیں۔ انہوں نے رئیس کو ہمارے آنے کی اطلاع کی اور پھر آکر ہمیں بتایا کہ وڈیرہ رات ہی کو واپس آیا ہے اور گھر میں پالنے کے لیے دو ہرن لایا ہے۔
کچھ دیر بعد خان محمد صاحب باہر آئے۔ میرے ساتھی اُن کے پرانے دوست تھے۔ خوب گلے ملے گئے۔ چائے آئی۔ انڈے پراٹھے آئے۔ شاہ بندر جانے کے منصوبوں پر تبادلۂ خیال ہوا۔ میرے ٹیپ ریکارڈر کی پھرکیوں میں حرکت ہوئی اور

ہماری گفتگو محفوظ ہونے لگی۔ اب کے گفتگو زمیندار یا کاشتکار سے نہیں تھی اس لیے بات کا انداز جدا تھا۔ میں نے مہمان خانے کے کتبے پر لکھا ہوا نام پڑھا: رئیس خان بہادر خیر محمد چانڈیو ــــ اور رئیس خان محمد چانڈیو سے پوچھا۔ "یہ کون تھے؟"

"یہ ہمارے دادا تھے ــــ"

"خان بہادر سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انگریزوں نے انہیں یہ خطاب دیا تھا؟"

"جی۔ انگریزوں نے خطاب دیا تھا۔"

"انگریزوں سے آپ کے بزرگوں کے کیسے تعلقات تھے؟"

"بڑے اچھے تعلقات تھے۔ انگریز ہمارے ہاں آتے رہتے تھے۔ بڑے اچھے تھے۔ گورنر کے بھی تعلقات تھے، لارڈوں کے تعلقات تھے۔"

"یہ لوگ آکر اسی اوطاق میں رہا کرتے ہوں گے؟ ــــ"

"جی۔ سب یہیں رہا کرتے تھے۔"

"کیسے کیسے لوگ اس جگہ آکر رہ چکے ہیں؟ ــــ"

"یہاں بہت سے لوگ آئے ہیں۔ پاکستان کے تقریباً سارے پریذیڈنٹ یہاں ہمارے مہمان رہ چکے ہیں۔ صدر ایوب یہاں آتے تھے۔ یحییٰ خان آیا کرتے تھے۔ شہنشاہ ایران بھی آئے تھے ــــ"

"یہ لوگ کیوں آتے تھے؟ ــــ"

"زیادہ تر شکار کے لیے آیا کرتے تھے، شوٹنگ کے لیے۔"

میں نے کہا ــــ "سنا ہے کہ آپ کے اس علاقے میں سندھ کی بہترین شکار گاہیں تھیں؟ ــــ"

وہ بولے ــــ "جی ہاں۔ اب بھی ہیں۔ یہاں جھیلیں بہت ہیں اور پانی کے پرندوں کا بہترین شکار ہوتا ہے ــــ"

میں نے پوچھا ــــ "کیا آپ کی کوئی اپنی جھیل بھی ہے؟ ــــ"

جواب ملا ـــــ" جی ہاں۔ ہماری اپنی جھیل ہے؛ گھونگڑی۔ وہ پورے سندھ میں بڑی مشہور جھیل ہے ـــــ"

میرا اگلا سوال تھا " راستے میں سڑک تو بہت اچھی تھی۔ یہ ترقی کیا حال ہی میں ہوئی ہے۔ اور کیا آپ اِسے ترقی کہیں گے یا آپ کا علاقہ اب بھی پسماندہ ہے؟"

" بہت پسماندہ ہے۔ اتنی ترقی نہیں ہوئی جتنی ہونی چاہیے۔ صرف جونیجو کی حکومت میں ترقیاتی کام ہوئے ہیں۔ اسکول بنے ہیں اور تعلیم کا مسئلہ حل ہوگیا ہے لیکن دوسرے شعبوں میں بھی کچھ ہو جائے تو بہتر ہے۔ ابھی تک کچھ نہیں ہے ـــ"

میں نے پوچھا ـــ" کیا نہیں ہے۔ کس چیز کی کمی ہے اور کیا ہونا چاہیے؟"۔

خان محمد بولے " یہاں سڑکوں کی کمی ہے۔ اور جو سڑکیں ہیں ان کی حالت اچھی نہیں ہے۔ اس کے علاوہ سڑکیں شہروں تک محدود ہیں۔ اب آپ شاہ بندر جائیں گے، وہاں سڑک اچھی نہیں ہے۔ اس کی تعمیر پانچ چھ سال پہلے شروع ہوئی تھی لیکن ابھی تک پورا کام نہیں ہوا ہے"

میں نے پوچھا " اور یہ جو سجاول کا بہت اچھا پُل بن گیا ہے۔ اس کے بننے سے علاقے کی ترقی میں کوئی تیزی آئی ہے"

وہ بولے ـــ" آئی ہے۔ بالکل آئی ہے۔ بلکہ یہ جو کچھ نظر آ رہا ہے، پُل کی وجہ سے ہے۔ اب ہماری پیداوار مثلاً مرچیں اور گنّا ٹھٹھہ تک پہنچ جاتا ہے اور دودھ وغیرہ کراچی تک پہنچ جاتا ہے۔ اس وجہ سے کچھ ترقی ہوئی ہے"

میں نے کہا ـــ" شہروں میں تو ترقی اور خوش حالی نظر آنے لگی ہے۔ لوگوں کی حالت بہتر دکھائی دیتی ہے، اُس خوش حالی کا کچھ اثر آپ کے ہاں پہنچا ہے یا نہیں؟ ـــ"

خان محمد نے کہا " تھوڑے تھوڑے اثرات آ رہے ہیں لیکن زیادہ نہیں۔ شہروں میں تو بیوپار زیادہ ہوتا ہے لہٰذا وہاں لوگ خوش حال ہوتے ہیں لیکن یہاں بھی جو محنت کش طبقہ ہے وہ کماتا ہے اور کھاتا ہے ـــ"

میں نے پوچھا ـــ" آپ کا خاندان تقریباً ایک صدی سے یہاں آباد ہے۔ یہاں عام لوگوں

کی اقتصادی حالت کیسی ہے؟"

رئیس بولے "اقتصادی حالت عام لوگوں کی صحیح نہیں ہے ــــ لیبر طبقہ یہاں زیادہ ہے اور یہاں کے لوگ کمائی پر دھیان بھی کم دیتے ہیں جسے lazy کہا جاتا ہے، سُست ہیں یہ لوگ ــ"

سُستی والی بات کہتے ہوئے رئیس خان محمد ہنسنے لگے۔ میں نے کہا "یہ بہت کہا جاتا ہے کہ یہاں کے لوگ سُست بہت ہیں، بس چائے پیتے رہتے ہیں۔"

ہنس کر بولے "ہاں یہ صحیح ہے۔ چائے پیتے رہتے ہیں۔ کام پر دھیان ذرا کم دیتے ہیں۔ ایجوکیشن کم ہے۔ اس وجہ سے ــ"

رئیس خان محمد چانڈیو کی اِس بات پر مجھے میر پور ساکرو کے عبدالعزیز کی بات یاد آگئی۔ وہ ابھی کل ہی کھیتوں کے بیچ کھڑے مجھ سے کہہ رہے تھے کہ ملک غریبوں سے بھرا پڑا ہے اور ان کی حالت آج بھی اچھی نہیں۔ میں نے پوچھا کہ پھر اس کا کیا علاج ہو ــــ ایک چھوٹے سے قصبے کے اس سادہ سے باشندے نے جواب دینے میں دیر نہیں لگائی۔ میں نے کہا "عزیز صاحب۔ ان کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کی خاطر کیا کیا جائے۔

جواب ملا:

"میں کہتا ہوں کہ سب چیز بند کر دو۔ ہر چیز بند کر دو اور صرف تعلیم کھول دو۔ پورے کا پورا پلان اس طرح بناؤ کہ ہر ایک آدمی، ہر ایک شخص، ہر ایک عورت کو جدید تعلیم سے آراستہ کیا جائے۔ اس کا صرف یہی حل ہے۔ آپ سارے لوگوں کو سہارا نہیں دے سکتے۔ کوئی ایجنسی، کوئی حکومت ساری مخلوق کو سہارا دے کر نہیں چلا سکتی۔ وہ صرف اتنا کرے کہ ایک ایسی لانگ ٹرم پالیسی بنائے کہ کوئی انسان اَن پڑھ نہ رہے۔ اس کینسر کا علاج صرف تعلیم ہے۔ آپ لوگوں کو پڑھا دو، آپ کا حق کوئی نہیں چھینے گا۔ آپ کی زمینوں کو کوئی بنجر نہیں ہونے دے گا۔ آپ کے دریا کا رخ کوئی نہیں موڑے گا۔ آپ کی زمینیں کوئی فوجی نہیں لے گا۔ کوئی وڈیرا بیٹھ کر آپ کے خلاف سازش نہیں کرے گا۔ آپ لوگوں کو تعلیم دے دیں گے، آپ اس علاقے کو بچا لیں گے۔ میرے نزدیک تمام مسئلوں

کا یہی آخری حل ہے —"

یہ سوچ کر مجھے بھی اچھا لگا کہ یہ سارے ہاری، یہ تمام کاشت کار پڑھ لکھ جائیں تو اس سرزمین کا مقدر بدل جائے۔ ہزاروں لڑکے لڑکیاں کتابیں اٹھائے، کھیتوں کی پگڈنڈیوں پر چلتے ہوئے اسکول جانے لگیں تو یہاں بھی خوش نصیبی کی صبح طلوع ہو اور ہزاروں بچے تختیاں ہلاتے، بستے گھماتے گھروں کو لوٹیں تو یہاں کی شامیں بھی خوش قسمت ہو جائیں۔ لیکن یہ سوچتے ہوئے مجھے ٹھٹھہ کے چھوٹے سے گاؤں مور چھڈائی کے ایک غریب کسان کے نوعمر بیٹے کی بات یاد آگئی۔ وہ کھیتی باڑی بھی کرتا تھا اور اسکول بھی جاتا تھا۔ میں نے پوچھا:

آپ تعلیم پانے کہاں جاتے ہیں؟۔

"بگان ہائی اسکول —"

"وہ یہاں کتنی دور ہے؟"

"آٹھ میل —"

"کیسے جاتے ہیں آپ؟"

"پیدل۔"

"جانے میں کتنی دیر لگتی ہے؟"

"ایک گھنٹہ —"

"اور آنے میں؟—"

"ایک گھنٹہ۔"

"آپ کس جماعت میں پڑھ رہے ہیں۔"

"آٹھویں جماعت میں —"

"اور آپ اپنے کھیتوں میں بھی کام کرتے ہیں؟ —"

"ہاں۔"

"کھیتی باڑی کا سارا کام آتا ہے آپ کو؟—"

"ہاں۔ سب کام آتا ہے —"

"تو آپ جب تعلیم مکمل کر لیں گے تو شہر میں جا کر ملازمت ڈھونڈیں گے یا یہاں کھیتوں میں کام کریں گے؟"

"ہم شہر میں ملازمت کریں گے۔"

"پھر یہاں زمینوں پر کام نہیں کریں گے؟"

"نہیں۔ نہیں ——"

"کیوں؟"

"بس ملازمت کریں گے۔"

"تو زمینوں کو چھوڑ کر چلے جائیں گے؟"

"ہاں۔ چھوڑ کر چلے جائیں گے ——"

دریائے سندھ کے کنارے بسنے والے اس غریب لڑکے کی بات پر کسی تبصرے کی ضرورت نہیں اور رئیس خان محمد چانڈیو کی بات بھی کسی تبصرے کی محتاج نہیں جب میں نے اُن سے پوچھا کہ آپ کے بزرگ کس زمانے میں دادو سے آگر یہاں آباد ہوئے تھے؟

وہ بولے "یہ مجھے یاد نہیں۔ ایسی کوئی ہسٹری مجھے یاد نہیں لیکن میں آپ کو پڑھ کر بتاؤں گا۔"

میں نے پوچھا "اس علاقے میں کیا کشش رہی ہوگی، یہ تو آپ کو اندازہ ہوگا۔"

"یہ پُرسکون علاقہ تھا اُس زمانے میں ——"

"یہ بتایئے کہ اب باقی سندھ تو پُرسکون نہیں ہے، آپ کا علاقہ اب کیسا ہے؟"

رئیس خان محمد چانڈیو بولے ــ "ہمارا علاقہ اب بھی پُرسکون ہے۔ جیسا پہلے تھا ویسا ہی ہے کیونکہ سندھ میں آپ کو پتہ ہے، ڈاکوؤں کی وجہ سے حالات بگڑے ہوئے ہیں لیکن ہمارے علاقے میں اللہ کا شکر ہے کہ ڈاکو واکو کچھ بھی نہیں ہیں ——"

میں نے کہا "رات ہم یہاں کھلے دالانوں میں آرام سے سو گئے۔"

ہنس کر بولے "یہی تو بات ہے۔ یہاں ڈر نہیں ہے کیونکہ یہاں سمندر بیچ میں پڑتا

ہے۔ اگر ڈاکو یہاں ڈاکہ ڈال کر جائے گا تو آگے پکڑا جائے گا اور اگر پیچھے جائے گا تو سمندر میں ڈوب کر مرے گا۔ یہی بات ہے۔"

میں نے کہا: "آپ کو ماشاء اللہ ذہنی سکون ہے، خدا کرے ہمیشہ رہے۔ اس کی ایک پہچان یہ ہے کہ آپ نے اطمینان اور سکون والا ایک اور کام کیا ہے اور گھر میں پالنے کے لیے کل رات دو ہرن بھی لے آئے ہیں۔"

بہت خوش ہوئے اور قہقہہ لگا کر بولے: "ہرن تو شوق کی بات ہے۔ ہر آدمی کوئی بھی چیز پال سکتا ہے۔"

ہَوا چُپ رہے گی

وہاں اُوپر لدّاخ سے چل کر —— پندرہ سو میل کا سفر طے کر کے —— میں یہاں بحرِ عرب کے کنارے شاہ بندر آیا ہوں لیکن شاہ بندر یہاں نہیں ہے۔

یہاں تو بس سپاٹ میدان ہیں۔ چاند سمندر کو کھینچتا ہے تو پانی کا ریلا آ گرا انہیں اَور سپاٹ کر جاتا ہے۔

یہاں تو بس یہ میرے بائیں ہاتھ پر لکڑی سے کوئلہ بنانے کی چار بھٹیاں سلگ رہی ہیں جن کے قریب دو بار بردار اونٹ بیٹھے جگالی کیے جا رہے ہیں۔

انہیں تو یوں بھی بیٹھنا پڑے گا کیونکہ ان کے مالک نے ان کے مُڑے ہوئے گھٹنوں کو رسّی سے کس کر باندھ دیا ہے۔ صرف ان کی گردن آزاد ہے جس سے وہ کبھی کبھار پیٹھ پر بیٹھنے والی مکھی کو اڑاتے ہیں تو گردن میں پڑی ہوئی بڑی سی گھنٹی بج کر اِس سنّاٹے کو توڑتی ہے۔

میرے ہاتھ میں دریائے سندھ کا نقشہ ہے۔ نقشے کے مطابق اِس جگہ جہاں دریا ختم اور سمندر شروع ہو رہا ہے، شاہ بندر ہونا چاہیے تھا لیکن یہاں تو جا بجا سمندری پانی میں گلی ہوئی لال اینٹوں کے ڈھیر لگے ہیں۔ یوں لگتا ہے کہ قطاروں میں بنی ہوئی عمارتیں کھڑے قد سے گر پڑی ہیں اور ساری آبادی یا تو ان کے نیچے کچل گئی ہے یا موئن جودڑو والوں کی طرح اٹھ کر کسی طرف نکل گئی ہے۔

یہاں تو بس دو چار ذرا اونچے ٹیلوں پر کچھ قبریں باقی رہ گئی ہیں جن پر لال، نیلی، ہری، پیلی چادریں پڑی ہیں۔ تیز سمندری ہواہیں کچھ جھنڈیاں لہراتے لہراتے چیتھڑے بن گئی ہیں اور بس!

یہاں تو وہ شاہ بندر ہونا چاہیے تھا جو کسی زمانے میں عظیم شہر ٹھٹھہ کا عظیم الشان ساحلی شہر تھا، جہاں دنیا بھر کے جہاز آ کر لنگر کرتے تھے۔ یہاں تو وہ بندرگاہ ہونی چاہیے تھی جس کے متعلق کہتے ہیں کہ شہزادہ اورنگ زیب نے بسائی تھی اور اورنگ بندر کہلاتی تھی، جو پھر شاہی بندر کہلائی، اس کے بعد شاہ بندر اس کا نام ہوا اور بالآخر یہ انجام ہوا جو اس وقت میرے سامنے ہے۔

ہم لاڈیوں سے چل کر جیپ کے ذریعے یہاں آئے ہیں۔ راہ میں پہلے کسٹم کی چوکی ملی، پھر نہایت عمدہ اور کشادہ سڑک ملی جو زمین کو بلند کر کے اس کے اوپر بنائی گئی تھی۔ ایسی سُتواں سڑک تو کہیں پنجاب تک میں نہیں ملتی۔ جیپ اس پر دوڑ نہیں رہی تھی، تیر رہی تھی۔

چلتے چلتے سڑک یک لخت ختم ہو گئی۔ بالکل یوں جیسے مزدور کام کرتے کرتے اچانک بھاگ گئے ہوں۔ کسی نے بتایا کہ یہ سڑک ایک سابق وزیر اعظم کے ترقیاتی منصوبوں کے تحت بنائی جا رہی تھی۔ ایک دوپہر اُن وزیر اعظم کو نوکری سے نکال دیا گیا، شام تک سڑک کی تعمیر کا کام بند ہو گیا، اور بس، اس کے بعد خاک ہی خاک اور دھول ہی دھول ہے۔

مگر اس خاک میں بھی کچھ فائدے ہیں۔

کچی سڑک کے کنارے دیہاتیوں کا ایک قافلہ پیدل چلا جا رہا تھا۔ شاید کوئی بارات تھی، اس میں بہت سی عورتیں بھی تھیں۔ اس علاقے میں عورتیں تو عورتیں، کم سن لڑکیاں بھی نظر نہیں آتیں اور ظاہر ہے کہ گھروں میں رکھی جاتی ہیں۔ اچانک مسافروں سے بھری ہوئی ایک بس اُس قافلے کے قریب سے گزر گئی۔ بس کا گزرنا تھا کہ گرد کا ایک بادل اٹھا، بالکل ہیروشیما کے دھماکے جیسا۔ اور معزول وزیر اعظم کی ادھوری سڑک سُرمے کی طرح کوٹی گئی۔ پھر جب گرد بیٹھی تو سندھی عورتیں یوں نظر آئیں کہ ان کے تونسے ہوئے چہرے، اُبھرے ہوئے رخسار، سیاہ پلکیں، ستواں ناکیں، یہاں تک کہ ناک میں پڑی ہوئی کیلیں تک خاک میں اَٹ چکی تھیں۔

شاید سندھ کی خاک کو اپنی خواتین کی بے پردگی منظور نہ تھی۔

ہم اور آگے چلے تو شاہ بندر کی سڑک غائب ہی ہو گئی۔ یہاں زمین سمندری ریلے میں دُھل گئی تھی اور پہیوں کے نشان تک مٹ چکے تھے۔ یہاں تو کوئی پگڈنڈی تک نہ تھی، کوئی راستہ نہ تھا اور اوپر سے غضب یہ کہ کوئی راستہ بتانے والا بھی نہ تھا۔ دور دور تک کوئی آدم نہ آدم زاد جس سے شاہ بندر کا پتہ پوچھیں۔ راہ میں ایک گاؤں کا اوطاق ملا جو اگرچہ پوری طرح آراستہ تھا لیکن خالی پڑا تھا۔ سوچا کہ یہاں اوطاق ہے تو یہیں گاؤں بھی ہوگا، مگر گاؤں نہیں ملا۔ آخر طے پایا کہ جدھر سے سمندری ہوا آرہی ہے اُسی رُخ چلا جائے۔ اُسی رُخ چلتے چلتے میں یہاں شاہ بندر آگیا ہوں اور شاہ بندر یہاں نہیں ہے۔

کسی نے بتایا کہ تھوڑی دور، جھاڑیوں کی آڑ میں دو ہزار کی آبادی کا ایک گاؤں بچلو پران ہے۔ میں نے سوچا کہ گاؤں میں چلوں اور گاؤں والوں سے اپنے دریا اور اُن کے سمندر کی کہانی سنوں۔

وہ چھوٹا سا گاؤں نکلا۔ ویرانے کے بعد آبادی ملی تو کتنا اچھا لگا اور شیفتہ کا وہ شعر یاد آیا۔

گاؤں بھی ہم کو غنیمت ہے کہ آبادی تو ہے
آئے ہیں ہم ایک پُر آشوب صحرا دیکھ کر

سامنے اونچے نیچے مکان تھے۔ ایک مکان پر، غالباً وڈیرے کے مکان پر ٹیلیویژن کا ایریل بھی لگا تھا۔ ایک ٹریکٹر کھڑا تھا جس پر کسی پینٹر نے پھول بوٹے بنائے تھے اور جس نے ذرا دیر پہلے گاؤں تک آنے والا راستہ صاف کیا تھا اور ریت کو دھکیل کر منڈیریں بنائی تھیں، اس اُمید میں کہ شاید سمندر کا پانی رک جائے۔

ایک بڑے سے چھپّر کے سامنے چارپائیاں پڑی تھیں جن پر گاؤں کے مردوں کی شاید پوری آبادی بیٹھی تھی۔ بوڑھے، ادھیڑ عمر، جوان اور بچے یا تو چارپائیوں پر بیٹھے تھے یا ان کے گرد منڈلا رہے تھے۔ سب کے بدن پر لمبے لمبے کرتے تھے اور شلواریں تھیں۔ لڑکوں کے بال ماتھے کے اوپر ہوتے ہوئے آنکھوں تک آگئے تھے۔ بوڑھوں

نے اپنی ڈاڑھیاں خوب تراشی تھیں اور خواتین کا کہیں آنچل تک نظر نہیں آرہا تھا۔

اِتنے میں بچلو پران کے وڈیرے صاحب آگئے۔ صاف ستھرا لباس، جیب میں پرانی وضع کا موٹا سا زرد فاؤنٹن پین۔ سر پر آئینے کے کام والی ویسی ہی زرد ٹوپی۔ خشخشی ڈاڑھی، شہنشاہ اکبر جیسی مونچھیں اور موئن جو دڑو کے مجسموں جیسی شکل وصورت۔

باتوں کا آغاز تعارف سے ہوا: سنئیے آپ کا نام کیا ہے؟

"ہمارا نام گل محمد ہے۔"

میں نے اِدھر اُدھر کے تکلّفات میں پڑے بغیر اصل بات پوچھ لی "گل محمد صاحب یہاں جو شاہ بندر ہوا کرتا تھا وہ کہاں گیا؟"

جواب ملا "سائیں، وہ شاہ بندر جو تھا، وہ تو مجھے بھی نہیں پتہ کہاں گیا۔ وہ جو میں نے دیکھا تھا، وہ پاکستان ہندوستان بننے کے بعد ختم ہوگیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ یہاں ہندو لوگ بہت تھے، روپیہ پیسہ اُن کے پاس تھا۔ مسلمان زیادہ تر مزدور تھے یا سرکاری ملازم تھے۔ ملازم تو اِدھر اُدھر ہو گئے باقی جو مزدور تھے، جب ہندو گئے تو وہ بھی چلے گئے۔"

میں نے پوچھا "تو پاکستان بننے سے پہلے یہاں کیا تھا؟ —"

"یہاں اُس وقت کسٹم تھا۔ یہاں تھانہ تھا۔ پولیس چوکی تھی، اسکول بھی تھے۔ یہاں سب کچھ تھا۔ ٹیلی فون بھی اس ٹائم میں تھے، یہ بہت اچھی جگہ تھی۔"

میں نے دریافت کیا "سنا ہے یہاں سمندر نہیں تھا؟ —"

گل محمد بولے — "جب میں نے دیکھا اُس وقت تو تھا لیکن بڑوں کے زمانے میں سمندر یہاں سے دور تھا۔ بزرگوں سے میں نے سُنا ہے کہ اب جو شاہ بہرام کا جزیرہ ہے وہاں تک سڑک تھی۔ لوگ شاہ بہرام کے مزار تک پیدل جاتے تھے اور سواریاں بھی چلتی تھیں۔ اُس وقت راستے میں پانی وانی کچھ نہیں تھا۔"

میں نے پوچھا "حاجی بہرام کا مزار ہے تو عُرس بھی ہوتے ہوں گے۔"

"جی ہاں۔ ہر سال عرس ہوتا ہے۔ بہت لوگ جاتے ہیں۔"

"لیکن سڑک تو ہے نہیں؟—"

"اب سڑک پر نہیں جاتے۔ اب لوگ لانچ میں جا سکتے ہیں۔"

میں نے پوچھا "کیا واقعی پہلے وہاں تک سڑک تھی—"

"جی۔ سڑک بھی تھی اور آبادی بھی تھی۔ سمندر کی تہہ میں اُس کے آثار اب بھی نظر آتے ہیں۔"

میں نے گل محمد سے کہا "آپ کو پتہ ہے کہ مغلوں کے زمانے میں یہاں کوئی بندرگاہ تھی؟—"

وہ بولے "ہاں تھی۔ آج بھی ہے لیکن پہلے زمانے میں یہاں بڑی بڑی لانچیں آتی تھیں، مال آتا تھا۔ کسٹم موجود تھا جس کا ریکارڈ آج بھی لاڈیوں میں موجود ہے۔"

میں نے پوچھا "اب یہاں کون لوگ رہتے ہیں۔ سمندر کے پاس قطاروں میں جھونپڑیاں کن کی ہیں—"

جواب ملا — "وہ تو مچھیرے ہیں۔ پکی آبادی اب کوئی نہیں۔ بس یہ تین چار گاؤں ہیں۔"

میں نے پوچھا — "یہ گاؤں والے کیا کرتے ہیں۔ روزی کیسے کماتے ہیں؟"

"ہم تو زمینداری کا کام کرتے ہیں، اور ہمارا جو دوسرا بھائی ہے وہ سب سمندر میں مچھی پکڑنے کا کام کرتے ہیں۔ اُسی پہ گزارا ہوتا ہے۔"

"آپ لوگ کیا چیز اُگاتے ہیں؟"

"سائیں یہاں گندم ہوتا ہے، چاول ہوتا ہے، سب ہو سکتا ہے مگر پانی نہیں ہے، اس وجہ سے نہیں ہوتا۔"

"کاشتکاری کے لیے میٹھا پانی کہاں سے لاتے ہیں آپ؟—"

وہ بولے — "ہماری نہر ہے لیکن چار سال سے اس کی صفائی نہیں ہوئی۔ تو نہر اب بند ہو گئی ہے اور اب پانی نہیں آتا۔"

میں نے حیرت سے پوچھا — "نہر بند ہو گئی؟"

انہوں نے اطمینان سے جواب دیا — "بند ہو گئی—"

میرا اگلا سوال تھا "آپ کے بھائی مچھلی پکڑتے ہیں۔ یہاں کون کونسی مچھلی ہوتی ہے؟"۔
"یہاں ہر قسم کی مچھی ہوتی ہے۔ جھینگے ملتے ہیں، داگری ملتی ہے۔ گولی ملتی ہے۔ کھگا ملتی ہے۔ مچھی یہاں سب ملتی ہے ـــ"

جس وقت یہ باتیں ہو رہی تھیں، ایک بڑا مجمع ہمیں گھیرے کھڑا تھا جس میں نوعمر لڑکے بہت تھے۔ میں نے گل محمد سے پوچھا کہ یہ بچے کیا کرتے ہیں؟

"یہ کچھ پڑھتے ہیں۔ پرائمری اسکول ہے یہاں میرے پاس گاؤں میں۔ باقی کچھ بھینس چَراتے ہیں، دوسرا کام کرتے ہیں، بس مزدوری میں لگے پڑے ہیں سب۔"

میں نے پوچھا ـــ "دوا علاج کا یہاں کیا بندوبست ہے؟"

"یہاں ایک ڈسپنسری ہے۔"

"دوسرے شہروں کو آپ کیسے جاتے ہیں؟"

"بس چلتی ہے۔ ڈاٹسن چلتی ہے۔ سواری بہت ہے۔"

"یہاں کوئی پولیس چوکی بھی ہے؟ ـــ"

"ابھی یہاں کوئی پولیس چوکی نہیں ہے۔ جب شاہ بندر ختم ہوا، چوکی یہاں سے لے گئے۔"

"یہاں جرائم ہوتے ہیں؟"

"ادھر جرائم کوئی ایسے نہیں ہوتے۔ پہلے یہاں چوری بہت ہوتی تھی۔ ابھی چوری بند ہے۔"

اب میں نے پوچھا "آپ کے یہ مکان تو بالکل کچے اور عارضی سے ہیں۔ کیا آپ انہیں میں رہیں گے یا ان کو بہتر بنائیں گے؟"۔

وہ بولے ـــ "جب ہماری روزی بہتر ہوگی تو ہم ان کو بہتر بنائیں گے۔ ابھی اتنی روزی نہیں ہے۔"

میں نے پوچھا "یہ سامنے جھونپڑیوں میں کون لوگ رہتے ہیں۔ ان کی روزی کا ذریعہ کیا ہے؟ ـــ"

"سائیں یہ اونٹ والے ہیں۔"

"کس کام آتے ہیں اونٹ؟"

"وزن اٹھاتے ہیں یا بچے دینے کے کام آتے ہیں، اب تو کسی وجہ سے وزن اٹھانا بند ہو گیا ہے۔"

اب میں نے پوچھا "آپ باقی دنیا سے کٹے ہوئے ہیں، حالانکہ کراچی سے آپ بہت قریب ہیں پھر بھی کٹے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ آپ باہر کی دنیا کی خبر کیسے رکھتے ہیں؟"

گل محمد مسکرا کر بولے "ہم بی بی سی پر خبریں سنتے ہیں۔ پاکستان کی، انڈیا کی، جو بھی ملک ہے اس کی خبر سنتے ہیں۔ جیسے یہ چین میں ابھی ہنگامہ ہوا۔ بغداد کی خبر۔ اور جیسے رات ٹی وی میں دکھایا، کوئی حکومت ہے جس نے ہاتھی کے شکار پر پابندی لگا دی۔"

گل محمد کا یہ جواب سن کر نہ معلوم کیوں یہ سوال میری زبان پر آیا — "مگر گل محمد صاحب، میری سمجھ میں اب بھی نہیں آرہا ہے کہ دنیا شاہ بندر کو کیوں چھوڑ گئی؟"

"ایک تو یہاں سے سمندر نزدیک آرہا ہے اور سمندر آرہا ہے تو میٹھا پانی ختم ہو رہا ہے اس لیے گاؤں چھوڑ کر سبھی شہروں میں جا رہے ہیں۔ دیکھو پاکستان کے ہر شہر میں آپ کو شاہ بندر کے آدمی ملتے ہیں۔"

میں نے پوچھا — "اب جو لوگ یہاں رہ گئے ہیں وہ یہیں رہیں گے یا وہ بھی چھوڑ کر چلے جائیں گے —"

جواب بہت صاف تھا "یہاں سمندر کا پانی آرہا ہے اس لیے یہ جگہ چھوڑنی پڑے گی۔ جو ہمارے لیڈر ہیں نا، یہ دیکھتے نہیں ہیں۔ تو ہماری ساری زمین سمندر کھا گیا ہے۔ یہاں کسی نے بند باندھنے کی کوشش نہیں کی۔ اگر بند نہیں لگا تو ہمارا سارا گاؤں ختم ہو جائے گا۔ یہ ساری تحصیل ہی اس وجہ سے ختم ہو رہی ہے، تحصیل بدین کی بھی بہت ساری زمین سمندر میں غرق ہو رہی ہے۔"

میں نے پوچھا — "آپ کا کیا خیال ہے، شاہ بندر کا مستقبل کیا ہو گا؟"

"حکومت اگر نظر انداز نہیں کرے تو شاہ بندر رہے گا —"

"شکریہ۔"

وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولے: "تمہاری بڑی مہربانی یہاں آئے تکلیف اٹھا کے۔ ہم تمہارا شکرگزار ہوں۔۔۔"

ہم بھی تمہارا شکرگزار ہوں وڈیرہ گل محمد کہ تمہارے ہونے سے دریا کے اِس آخری سرے پر کوئی بات کرنے والا تو ملا۔۔۔

یہاں جہاں سندھ کا دریا اور پاکستان کی سرزمین ختم ہو جاتی ہے یہاں لوگ کیسی کٹھن زندگی گزار رہے ہیں، اس کا چشم دید گواہ میں ہوں یا یہ تیز سمندری ہَوا۔

فرق یہ ہے کہ میں اپنی بات کہوں گا۔

اور ہَوا چُپ رہے گی۔

مطبوعات ایجوکیشنل بُک ہاؤس علی گڑھ

اقبالیات

- کلیاتِ اقبال — صدی ایڈیشن — ۶۰/۰۰
- دانشورِ اقبال — آل احمد سرور — ۳۵/۰۰
- اقبال معاصرین کی نظر میں — وقار عظیم — ۵۰/۰۰
- اقبال شاعر و مفکر — پروفیسر نورالحسن نقوی — ۸۵/۰۰
- شکوہ جوابِ شکوہ مع شرح — علامہ اقبال — ۴/۰۰
- بانگِ درا (عکسی) — ” — ۳۰/۰۰
- بالِ جبریل (عکسی) — ” — ۱۵/۰۰
- ضربِ کلیم (عکسی) — ۱۵/۰۰
- ارمغانِ حجاز اُردو (عکسی) — ۶/۵۰

غالبیات

- دیوانِ غالب — مقدمہ نورالحسن نقوی — ۳۵/۰۰
- غالب شخص اور شاعر — مجنوں گورکھپوری — ۲۵/۰۰
- غالب تنقید اور اجتہاد — پروفیسر خورشید الاسلام — ۳۰/۰۰

سرسید

- سرسید احمد خاں اور انکا عہد — ثریا حسین — ۲۰۰/۰۰
- مطالعۂ سرسید احمد خاں — عبدالحق — ۳۵/۰۰
- سرسید اور ان کے نامور رفقاء — سید عبداللہ — ۳۰/۰۰
- انتخابِ مضامینِ سرسید — آل احمد سرور — ۱۲/۰۰
- سرسید ایک تعارف — پروفیسر خلیق احمد نظامی — ۴/۰۰

فیض

- کلامِ فیض (عکسی) — فیض احمد فیض — ۳۰/۰۰
- نقشِ فریادی (عکسی) — ۶/۰۰
- دستِ صبا (عکسی) — ۶/۵۰
- زنداں نامہ (عکسی) — ۶/۵۰
- دستِ تہ سنگ (عکسی) — ۹/۰۰

لسانیات

- مقدمۂ تاریخ زبانِ اُردو — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۳۰/۰۰
- اُردو زبان کی تاریخ — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۰۰/۰۰
- اُردو کی لسانی تشکیل — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۳۰/۰۰
- اُردو لسانیات — ڈاکٹر شوکت سبزواری — ۲۵/۰۰

ادب و تنقید

- متفرقاتِ مسعود — ڈاکٹر مسعود حسین خاں — ۱۰/۰۰
- فکرِ روشن — آل احمد سرور — ۱۵/۰۰
- خواب باقی ہیں — ” — ۱۵/۰۰
- کتب خانہ — رضا علی عابدی — ۱۰/۰۰
- جرنیلی سڑک — ” — ۱۰/۰۰
- شیر دریا — ” — ۱۰/۰۰
- فنِ تنقید اور تنقید نگاری — پروفیسر نورالحسن نقوی — ۳۵/۰۰
- اُردو شاعری کا تنقیدی مطالعہ — سنبل نگار — ۸۰/۰۰
- نثری داستانوں کا سفر — ڈاکٹر صغیر افراہیم — ۶۵/۰۰
- انگریزی ادب کی مختصر تاریخ — محمد یٰسین — ۶۵/۰۰
- ابوالکلام آزاد کا اسلوبِ نگارش — عبدالمغنی — ۵۰/۰۰
- جدید اُردو نظم: نظریہ و عمل — عقیل احمد صدیقی — ۹۰/۰۰
- جدید افسانہ: اُردو ہندی — طارق چھتاری — ۱۰۰/۰۰
- اُردو افسانہ: ترقی پسند تحریک سے قبل — ڈاکٹر صغیر افراہیم — ۸۰/۰۰
- کلاسیکی اُردو شاعری کی تنقید — طارق سعید — ۶۵/۰۰
- اُردو ادب کی تاریخ — عظیم الحق جنیدی — ۳۰/۰۰
- اُردو ادب میں طنز و مزاح — وزیر آغا — ۳۵/۰۰
- اُردو ناول کی تاریخ و تنقید — علی عباس حسینی — ۳۰/۰۰
- اُردو ڈراما کی تاریخ و تنقید — عشرت رحمانی — ۳۵/۰۰
- دکنی ادب کی تاریخ — محی الدین قادری زور — ۱۵/۰۰
- اُردو قصیدہ نگاری — مرتبہ ام ہانی اشرف — ۳۰/۰۰
- اُردو مرثیہ نگاری — ” — ۲۵/۰۰
- ناول کا فن — مترجم ابوالکلام قاسمی — ۲۰/۰۰
- اُردو مثنوی کا ارتقاء — عبدالقادر سروری — ۱۵/۰۰
- اُردو تنقید کا ارتقاء — عبادت بریلوی — ۳۵/۰۰
- فنِ افسانہ نگاری — وقار عظیم — ۳۵/۰۰
- نیا افسانہ — ” — ۳۵/۰۰
- داستان سے افسانے تک — ” — ۳۰/۰۰
- اُردو کی تین مثنویاں — خلیل رشید — ۳۰/۰۰
- اُردو کیسے پڑھائیں — سلیم عبداللہ — ۱۵/۰۰
- آیئے اُردو سیکھیں — ڈاکٹر مرزا خلیل احمد بیگ — ۱۰/۰۰
- موازنۂ انیس و دبیر — مقدمہ ڈاکٹر فضل امام — ۱۵/۰۰
- مقدمۂ شعر و شاعری — مقدمہ ڈاکٹر وحید قریشی — ۳۰/۰۰
- امراؤ جان ادا — مقدمہ تمکین کاظمی — ۲۵/۰۰
- مجموعۂ نظمِ حالی — مقدمہ ڈاکٹر ظہیر احمد صدیقی — [illegible]
- مثنوی گلزارِ نسیم — ” — ۱۲/۰۰
- مثنوی سحرالبیان — ” — ۱۵/۰۰
- انار کلی — مقدمہ ڈاکٹر محمد حسن — ۱۵/۰۰
- ادبی اساس تنقید — پروفیسر گوپی چند نارنگ — ۱۵/۰۰
- آج کا اُردو ادب — ابواللیث صدیقی — ۳۵/۰۰

سیاسیات و تاریخ

- دنیا کی حکومتیں (ورلڈ کانسٹی ٹیوشن) — محمد ہاشم قدوائی — ۹۰/۰۰
- تاریخ افکارِ سیاسی (ہسٹری آف پالیٹیکل تھاٹ) — ۳۵/۰۰
- اصول سیاست (پرنسپل آف پالیٹکس) — ” — ۹۰/۰۰
- جمہوریۂ ہند کا کانسٹی ٹیوشن (کانسٹی ٹیوشن آف انڈیا) — ۳۵/۰۰
- مبادی سیاسیات (ایلیمنٹس آف پالیٹکس) — ۳۵/۰۰
- اسلامی تاریخ — اے۔ اے۔ ہاشمی — ۱۰/۰۰

متفرق

- انسائیکلو پیڈیا آف کاؤنٹس — ڈاکٹر محمد نعمت خاں — ۶۵/۰۰
- جدید تعلیمی مسائل — ڈاکٹر ضیاء الدین علوی — ۳۵/۰۰
- اصولِ تعلیم — ” — ۳۰/۰۰
- علم معاشیات تصورات و نظریات — ” — ۱۲/۰۰
- جدید علم سائنس — ودیانت فہیمی — ۲۵/۰۰
- رہبرِ صحت — عشرت زمانی — ۲۰/۰۰
- رہبرِ تندرستی — ” — ۲۵/۰۰
- تعلیمی نفسیات کے نئے زاویئے — ” — ۳۵/۰۰
- علمِ خانہ داری — ” — ۳۰/۰۰
- گلدستۂ مضامین و انشاء پردازی — ڈاکٹر محمد نعمت خاں — ۲۲/۰۰
- تفہیم البلاغت — وہاب اشرفی — ۱۵/۰۰
- اُردو صرف — ڈاکٹر انصار اللہ — ۱۲/۰۰
- اُردو نحو — ” — ۸/۰۰
- اُردو ٹیچنگ (ہندی کے ذریعہ اردو سیکھئے) — ۶/۵۰
- انگلش ٹرانسلیشن کمپوزیشن اینڈ گرامر — ایم۔ اے۔ شجیع — ۲۰/۰۰

ناول اور افسانے

- حضرت جان (ناول) — قاضی عبدالستار — ۹۰/۰۰
- صلاح الدین ایوبی (ناول) — ” — ۳۰/۰۰
- شب گزیدہ (ناول) — ” — ۳۰/۰۰
- چار ناولٹ (ناولٹ) — قرۃ العین حیدر — ۵۰/۰۰
- روشنی کی رفتار (افسانے) — ” — ۳۰/۰۰
- ضدی (ناولٹ) — عصمت چغتائی — ۱۵/۰۰
- راجندر سنگھ بیدی اور ان کے افسانے — مرتبہ ڈاکٹر اطہر پرویز — ۲۵/۰۰
- ہمارے پسندیدہ افسانے — ” — ۳۰/۰۰
- چیخوف کے نمائندہ افسانے — ” — ۲۵/۰۰
- منٹو کے نمائندہ افسانے — ” — ۳۵/۰۰
- پریم چند کے نمائندہ افسانے — مرتبہ ڈاکٹر قمر رئیس — ۲۵/۰۰
- نمائندہ مختصر افسانے — مرتبہ محمد طاہر فاروقی — ۲۲/۰۰

ایجوکیشنل بُک ہاؤس مسلم یونیورسٹی مارکیٹ، علی گڑھ ۲۰۲۰۰۲ فون نمبر ۲۰۰۰۶۸